

## زکوٰۃ کے نئے مسائل

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پانچویں سیمینار مورخہ ۳۰ اکتوبر  
تا ۲ نومبر ۱۹۹۲ء منعقدہ ”جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ“ میں  
پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ]

ترتیب

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

**اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)**

جملہ حقوق بحق (سلامت فنڈ انڈسٹری) (ڈیڑنا) محفوظ

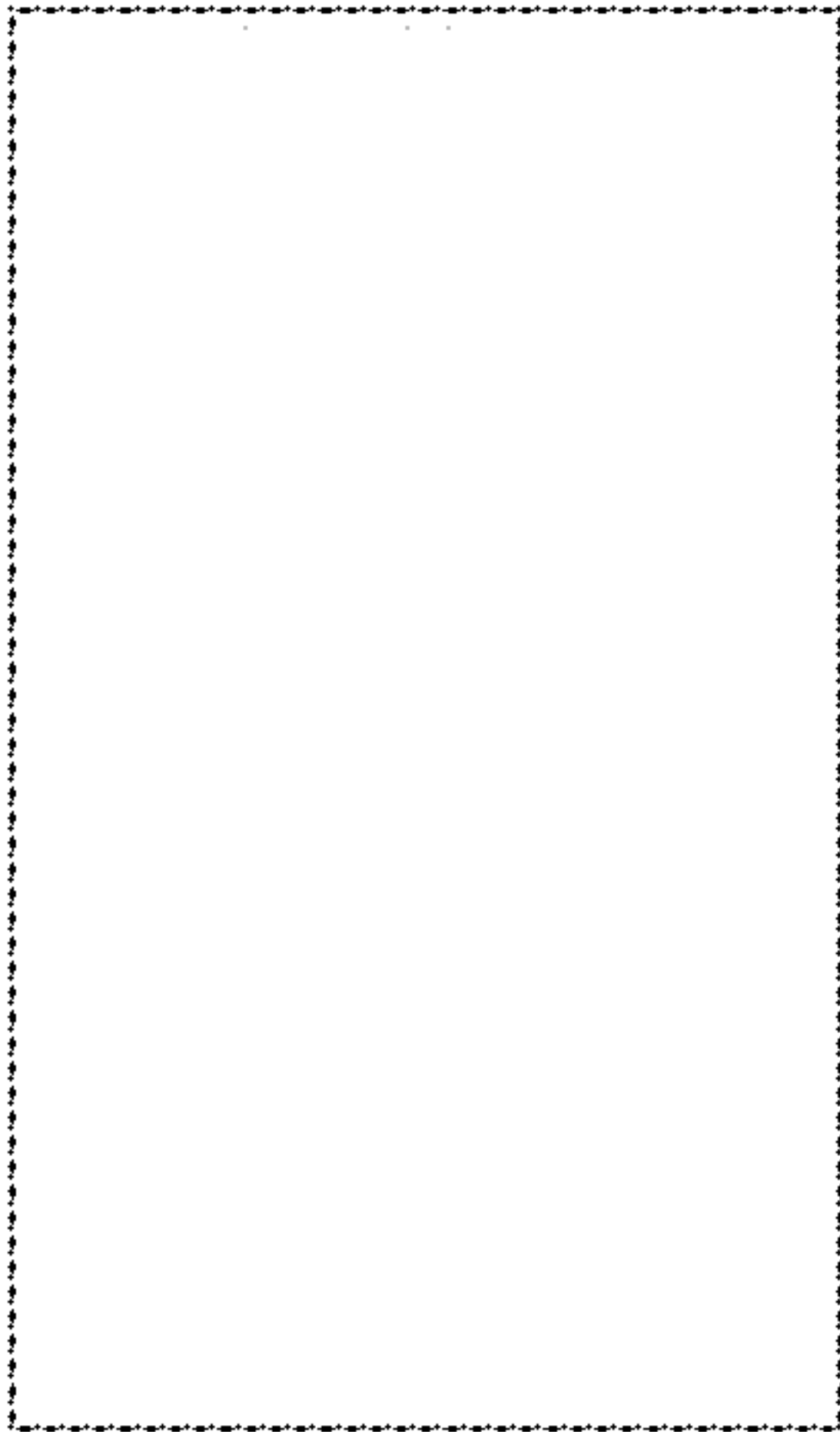
نام کتاب	:	زکوٰۃ کے نئے مسائل
ترتیب	:	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
صفحات	:	۵۷۱
قیمت	:	
سن طباعت	:	جنوری ۲۰۰۸ء

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ  
دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

## مجلس اولیٰ

- ۱- مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا عتیق احمد بستوی
- ۶- مولانا عبید اللہ اسعدی





## فہرست مضامین

۹	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	ابتدائیہ
<b>پہلا باب :</b> تمغہ حبیبی امور		
۱۵		سوال نامہ
۲۶		تجاویز
<b>دوسرا باب :</b> تفصیلی مقالات		
۳۷	حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی	سوال نامہ کا جواب
۴۷	مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی	اسلام کا نظام معیشت
۷۳	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	اموال زکوٰۃ سے متعلق مسائل
۹۶	مولانا محمد عبید اللہ سعیدی	جواب سوال نامہ بابت زکوٰۃ
۱۱۳	مولانا زبیر احمد قاسمی	زکوٰۃ کے مسائل
۱۲۶	مولانا انیس الرحمن قاسمی	زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی وصولی کا طریقہ
۱۳۶	مولانا احمد یلوی	اوائیگی زکوٰۃ کے شرائط و ارکان
۱۴۸	مولانا نعمت اللہ قاسمی	جدید مسائل زکوٰۃ سے متعلق سوالات کے جوابات
۱۵۸	مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی	زکوٰۃ کے شرعی احکام

۱۶۶	مولانا عبدالجلیل قاسمی	دیون کی زکوٰۃ کی تفصیل اور ان کے احکام
۱۷۵	مفتی حبیب اللہ قاسمی	مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر
۱۹۰	مولانا محمد طیب الرحمن	زکوٰۃ کے چند اہم مسائل
۲۰۲	مولانا محی الدین بزدوی	زکوٰۃ کے چند مسائل اور ان کا شرعی حل
۲۱۹	مفتی نسیم احمد قاسمی	اسلام کا نظام زکاۃ اور موجود معاشی مسائل کا حل
۲۷۱	مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی	حلال و حرام مخلوط مال میں زکوٰۃ کے احکام
۳۰۷	مولانا اعجاز احمد اعظمی	مشترک سرمایہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی نوعیت
۳۲۸	مفتی شبیر احمد قاسمی	اسلام میں زکاۃ کا مصرف
۳۵۲	مفتی انور علی اعظمی	بیع قبل القبض کی زکاۃ
۳۵۹	مولانا محمد صدر الحسن ندوی	زکاۃ سے متعلق بحث و تحقیق
۳۷۰	مولانا عبداللہ قاسمی	زکوٰۃ سے متعلق چند مسائل کا جائزہ
۳۹۹	مولانا عبید اللہ سعیدی	کمیشن پر چندہ
۴۱۱	مولانا ثناء الہدی قاسمی	نصاب زکوٰۃ
۴۱۶	مولانا محمد شعیب مفتاحی	احکام زکوٰۃ
۴۴۳	مولانا رفیق المنان قاسمی	زکوٰۃ کے کچھ اہم مسائل

### تیسرا باب: مختصر جوابات

۴۶۵	حضرت مولانا محمد بہان الدین سنبھلی	زکوٰۃ سے متعلق سوال نامہ کا اجمالی جواب
۴۷۲	مولانا محمد رضوان قاسمی	جوابات بابت سوالات زکاۃ

۴۷۸	مولانا افضل الحق	زکاة کے متعلق سوالات کے جوابات
۴۹۰	مولانا اختر امام عادل	خلاصہ جوابات
۴۹۷	مولانا جمیل احمد ندیری	ضمیمہ سوالات کے جوابات
۵۰۰	مفتی عزیز الرحمن مدنی	اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت
۵۰۷	مفتی عبدالرحمن صاحب دہلی	زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہوتی ہے
۵۱۴	حضرت مولانا عبدالرحمن قاسمی جہاڑی	زکوٰۃ سے متعلق اہم مسائل
۵۲۲	مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی	زکوٰۃ میں ”نما“ کی حقیقت اور صورتیں
۵۳۶	مولانا عبدالقیوم	زکوٰۃ سے متعلق عصر حاضر کے مسائل
۵۴۳	مولانا جعفر علی رحمانی	زکوٰۃ
۵۵۳	مفتی عبداللہ	مسائل زکوٰۃ
۵۶۳	مولانا ابوالکلام قاسمی	موجودہ عہد میں مال کی مختلف نوعیت میں زکوٰۃ
۵۶۸	مولانا افضل حسین بستی	نصاب زکوٰۃ

## ابتدائیہ

اسلام کا تیسرا اہم رکن ”زکوٰۃ“ ہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر نماز کے ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے، اگر نماز اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس سے تعلق کا اوج کمال ہے، تو زکوٰۃ خلق اللہ کی خدمت اور اس کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کا عنوان، سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان لوگوں سے جہاں فرمایا ہے جنہوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا، یا زکوٰۃ کے اجتماعی نظام میں شامل ہونے اور بیت المال میں اپنی زکوٰۃ جمع کرنے کے روادار نہیں ہوئے قرآن و حدیث میں سووی جتنی مذمت کی گئی ہے، زکوٰۃ کی اسی قدر تبلیغ کی گئی ہے، اور اس کے اجر و ثواب کا ذکر آیا ہے، نماز کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا ثواب دس گنا ہے اور انفاق کا اجر و ثواب سات سو گنا بتایا گیا، کیونکہ نماز کے فوائد نماز پڑھنے والوں کی ذات تک محدود ہے، اور زکوٰۃ کا نفع اللہ کے دوسرے بندوں تک پہنچتا ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق احکام کا بڑا حصہ منصوص ہے، حدیث کی کتابوں میں شرائط زکوٰۃ، اموال زکوٰۃ، مقدار زکوٰۃ اور وصولی زکوٰۃ سے متعلق احکام تفصیل سے آئے ہیں، زکوٰۃ کے مصارف کا ذکر قرآن مجید میں واضح طور پر آیا ہے، اور حدیث سے اس کی اور جہتیں سامنے آتی ہیں، احکام زکوٰۃ کے سلسلہ میں وہ مکتوب نبوی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے جو ”کتاب الصدقہ“ کے نام سے کتب حدیث میں مذکور ہے، اسی لئے زکوٰۃ کے احکام میں فقہاء کے درمیان نسبتاً کم اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

کتب فقہ میں زکوٰۃ سے متعلق احکام تفصیل کے ساتھ آئے ہیں، اس لئے خاص اس

موضوع پر مستقل تصنیفات کم ملتی ہیں، لیکن موجودہ دور میں دوسرے ابواب فقہ کی طرح زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی متعدد نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، اس پس منظر میں اس موضوع پر عالم اسلام میں بھی اور ہندوستان میں بھی مستقل کتابیں تالیف کی گئی ہیں، جن میں بعض جدید مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے، مگر مسائل کی کثرت اور اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت کے پیش نظر اکیڈمی کا پانچواں فقہی سمینار خاص اسی موضوع پر ”جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ“ میں رکھا گیا، یہ سمینار ممتاز فقیہ اور مصنف حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی دعوت پر ان ہی کے قائم کئے ہوئے ادارہ میں منعقد ہوا تھا، اس سمینار میں احوال زکوٰۃ، نصاب زکوٰۃ اور مصارف زکوٰۃ سے متعلق نہایت اہم مسائل زیر بحث آئے اور بہت ہی وقیع مقالات پیش کئے گئے، یہ مجموعہ ان ہی پیش قیمت مقالات پر مشتمل ہے۔

اس مجموعہ میں تین ابواب ہیں: پہلا باب تمہیدی اور یعنی سوالنامہ اور تجاویز ہیں، یہی تجاویز اصل میں سمینار کا خلاصہ ہیں، دوسرا باب موضوع سے متعلق تفصیلی مقالات پر مشتمل ہے، تیسرے باب میں سوالات پر دیئے جانے والے مختصر جوابات ہیں، یہ مجموعہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے، مجلس ادارت کے زیر نگرانی نئی ترتیب کے ساتھ اب دوسرا ایڈیشن پریس میں جا رہا ہے، اس کی پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کا کام مولانا محمد سراج الدین قاسمی رفیق شعبہ علمی نے انجام دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے، اس موقع سے حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحبؒ کی یاد آتی ہے، جو ابتداء سے اس کارواں کے رہنماؤں میں تھے، وہ پہلے فقہی سمینار میں بھی شریک ہوئے اور جب تک سفر کے لائق رہے سمیناروں میں شرکت فرماتے رہے اور یہ پانچواں سمینار تو خود ان ہی کی دعوت پر منعقد ہوا، وہ اکیڈمی کی تجاویز بھی اپنے ماہنامہ ”الرشاد“ میں اہتمام سے شائع کرتے تھے، ہمیشہ ان کی محبتیں، مفید مشورے اور نیک تمنائیں اکیڈمی کے شریک حال رہتی تھیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات کو بلند

---

فرمائے، یہ مجموعہ جہاں بانی اکیڈمی حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے لئے صدقہ جاریہ ہے، وہیں مولانا ندویؒ کے لئے بھی — انشاء اللہ — ذخیرہ اجر ہے، کہ وہی فکر و نظر کی اس بزم کو آراستہ کرنے کے محرک بنے اور سمینار کی میزبانی قبول کر کے اس فکری سرمایہ کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے، فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

خالد سیف اللہ رحمانی  
جنرل سکرٹری  
(اسلامک فنڈ اکیڈمی انڈیا)

۲۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء

جدید فتنہ تحقیقات

۶

پہلا باب

تمہیدی امور

## سوالنامہ زکوٰۃ

## ۱- محور اول

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟  
وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محل زکوٰۃ، یعنی اموال سے ہے:

## پہلی شرط۔ ملک تام

ملک تام سے کیا مراد ہے؟ اس ذیل میں چند سوالات ہیں:

- سوال (۱) مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے، وہ قیمت جو ادا کی جا چکی اور وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا، لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟۔
- سوال (۲) کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم، یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے، یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے، اس نقد کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، کرایہ دار پر، یا مالک مکان پر؟۔
- سوال (۳) جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟۔
- سوال (۴) وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟



اگر یہ اموال حرام، حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے ہوں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو، تو اس صورت میں ان مخلوط اموال میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟۔

سوال (۵) دین کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ دائن پر جس کی ملک ہے، لیکن قبضہ نہیں، یا مدیون پر جس کے قبضہ و تصرف میں ہے، لیکن اس کے ملک میں نہیں، یا دین کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی، کیا اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں نال منول کر رہا ہو اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو، ایسی صورت میں اس مدیون پر زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے؟

وصولیابی کی امید، یا ناامیدی کے اعتبار سے دین کی قسمیں اور وجوب زکوٰۃ کا حکم، اور اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو کب اور وصولیابی کے بعد سابق کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی یا وصول ہونے کے بعد مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔

سوال (۶) سرکاری محکموں اور مختلف پرائیویٹ کمپنیز میں جو لوگ ملازم ہیں ان کی ماہانہ یا فٹ میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار، یا کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے، بعض اوقات ہر دو قسم کی مذکورہ رقم پر سرکار، یا کمپنی انٹرسٹ کے نام سے بھی کچھ اضافہ جوڑ کر آخر میں وہ مجموعی رقم ملازمین کو ادا کرتی ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پرائیویٹ فنڈ کہلاتی ہے۔

پرائیویٹ فنڈ کی مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟ اگر ہوگی تو

کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے وقت واجب ہوگی تو سابق کی بھی واجب ہوگی، یا آئندہ سال گزرنے پر؟۔

دوسری شرط نما: نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں۔

تیسری شرط: حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا۔

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

۱- کیا حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا؟

چوتھی شرط: دین سے محفوظ ہونا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

۱- دین طویل الاجل، آج کے دور میں زراعتی قرض Agricultural loan تعمیر مکان

کے لئے قرض Building Construction Loan اور اس طرح کے مختلف قرض

سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کیلئے ۵ سال سے لے کر ۳۰، ۴۰ سال کی طویل

مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسط وار قرض کی ادائیگی واجب ہوتی

ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے، مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی

کاروبار کے لئے پانچ کڑور روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے، یعنی

سالانہ دس لاکھ روپے ادا کرنا ہے، یا کسی شخص نے ٹریڈنگ کی خریداری کے لئے ایک

لاکھ روپے قرض لیا جسے دس سال میں دس دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے، ان

صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا، یا

سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟۔

اسلام میں کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے، چند اور سوالات:

## کمپنیز پر زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں، بعض ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں جس میں کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت کروڑوں روپے کو پہنچتا ہو جس میں نصاب و وجوب زکوٰۃ موجود ہے، لیکن اس کے شرکاء اور حصہ داروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت کی تقسیم حصہ داروں پر کی جائے تو ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب نہیں ہوتا، یا کچھ صاحب نصاب نہیں ہوتے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار ہوگا، یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا؟۔

## ہیرے اور جواہرات

۱- ہیرے اور جواہرات کی تجارت کی جاتی ہے، جو لوگ ہیرے اور جواہرات کی تجارت کرتے ہیں یہ ظاہر مال تجارت ہونے کی وجہ سے ان پر تو زکوٰۃ واجب ہوگی ہی، لیکن دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہیرے جواہرات حوائج اصلیہ میں نہیں ہیں اور بڑی مالیت رکھتے ہیں، شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟۔

بعض اوقات خواتین محض تزئین و آرائش کے لئے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا ہے، وجوب زکوٰۃ کے بارے میں ان کا کیا حکم ہوگا؟۔

## اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین کس

نرخ سے کیا جائے، اپنی لاگت کے حساب سے کریں، یا اس دن کی قوت خرید کا اعتبار کیا جائے، پھر یہ کہ تھوک کے بھار کا اعتبار ہوگا، یا پھٹکر فرسنگلی کا اعتبار ہوگا؟۔

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی؟ اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب قوت خرید کے اعتبار سے ہوگا، یا متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا؟۔

### شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

مختلف تجارتی کمپنیاں اپنے شیئرز فروخت کرتی ہیں یہ شرکت کی ایک صورت ہے، کمپنی قائم کرتے وقت کچھ اکائیاں طے کر لی جاتی ہیں، ہر یونٹ (اکائی) ایک شیئر ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے، کمپنی جو کچھ منافع کمائیگی شیئرز ہولڈرس اس میں اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، شیئرز دراصل کسی تجارتی کمپنی کے ایک خاص حصہ کی ملکیت ہے، واضح رہے کہ بعد کو ان شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور کمپنی کے نفع و نقصان اور اس کے سناکھ کے پیش نظر ان شیئرز کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ان شیئرز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان شیئرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا، یا بہ وقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا؟۔

بونڈس سے مراد یہ ہے کہ اکثر حکومتیں، یا مختلف کمپنیز لوگوں سے قرضے مانگتی ہیں اور ان قرضوں کی واپسی کے لئے کچھ مدت (۵ سال، دس سال وغیرہ) مقرر کرتی ہیں اور کچھ شرح فیصد

سود کا بھی اعلان کرتی ہیں اور بہ طور ثبوت قرض دہندہ کو سرٹیفکیٹ ایشو کرتی ہیں وہی بونڈ ہے، سوال یہاں پر صرف اتنا ہے کہ جو کچھ سود کے نام پر دیا جاتا ہے اس کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں؟ قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، یا نہیں؟ اور اگر ادا کرنی ہوگی تو سال بہ سال، یا بونڈ کے کیش کرانے کے وقت، سبھی گزرے ہوئے برسوں کی، یا صرف آئندہ کی؟۔

### محور ثانی - نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کون سا نصاب اصل تسلیم کیا جائے؟ آج کے دور میں جب کہ سونے اور چاندی کے نرخ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لئے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) اور اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی، یا سونے کے نصاب سے؟۔

### محور ثالث - مصارف زکوٰۃ

۱- کیا یہ صورت درست ہوگی کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ ہے، ادارہ اس کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرتا ہے، اس کے طعام پر ماہانہ خرچ سو روپے آتا ہے، اس کی رہائش کے لئے جو مکان فراہم کیا گیا ہے (مکان کی تعمیر عام چندے سے کی گئی ہے) بازاری نرخ کے حساب سے اس کا کرایہ ۲۵ روپے ماہانہ ہے، اساتذہ کے شہریہ (ماہانہ تنخواہ) وغیرہ پر جو خرچ آتا ہے اس کو اگر طلبہ کی خدمت، یا متعلق انتظامی امور پر مامور ہے ان کا مجموعی شہریہ تقسیم کئے جانے پر فی طالب علم ۵۲ روپے ماہوار پڑتا ہے، اس طرح ایک طالب علم پر کل اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی

سو (۲۵۰) روپے آتے ہیں، مدرسہ یہ نظام بنانا ہے کہ ہر طالب علم سے ڈھائی سو روپے ماہانہ لئے جائیں، مستطیع طلبہ اپنے پاس سے یہ اخراجات ادا کریں اور غیر مستطیع طلبہ کی طرف سے یہ مقررہ فیس مدرسہ مذکوٰۃ سے ادا کرے، یا مدرسہ اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دیدے اور وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کر دے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

ذیل میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے، یا مستحقین زکوٰۃ کا؟۔

۲- سوال یہ ہے کہ مدارس کے لئے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر کئے جاتے ہیں وہ ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ عملہ جو حساب کتاب کے لئے مقرر ہوتا ہے اسے بھی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے، یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ماہانہ تنخواہ پر مقرر کئے ہوئے سفراء و مصلیوں کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی ہے اور ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے، آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زیادہ آتا ہے، بعض مدارس میں متعین شرح فی صد کمیشن دیا جاتا ہے، اس صورت میں خرچ کے تناسب کے مقابلہ میں آمد کا تناسب بہتر رہتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہوگا اور اسے ”العاملین علیہا“ کے تحت داخل مانا جائے گا؟ اگر کمیشن کی صورت کو جائز مقرر کر دیا جائے تو کیا شرح فی صد کے تعین کی کوئی خاص حد شرعی ضروری ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے، کیا اس کی ماہانہ تنخواہ مذکوٰۃ سے ادا کی جاسکتی ہے، جبکہ وہ لوگ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں؟۔

## ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

سوال (۱) کیا زکوٰۃ شیئرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت پر ادا کی جائے، یا اس سے ہوئی آمدنی پر؟۔ اگر زکوٰۃ آمدنی پر واجب الاداء ہے تو یہ غیر صافی آمدنی پر واجب الاداء ہے، یا صافی آمدنی پر، یعنی وہ خالص آمدنی جس میں سے اخراجات منہا کر دئے جائیں؟ (میں نے یہ پڑھا ہے کہ اگر شیئرز کو جنس تجارت (خرید و فروخت اور اس کی تجارت) کی طرح استعمال کیا جائے تو زکوٰۃ ان شیئرز کی بازاری قیمت اور ان کی آمدنی پر واجب الاداء ہوتی ہے، میں اس نکتہ کی وضاحت چاہتا ہوں، مزید یہ کہ ایسی صورت میں کہ شیئرز کو مسلسل خرید اور بیچا جاتا رہے، نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی، اس لئے زکوٰۃ کس اساس پر ادا کی جائے؟)

شیئرز کو اگر زیادہ مدت تک پاس رکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ صرف آمدنی پر واجب الاداء ہے، اگر کسی وجہ سے مالک ان شیئرز کو بیچنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ کیا اس کو ان کی بازاری قیمت پر ادا کرنا ہوگا، یا ان کے نفع پر، یا ان سے حاصل ہوئی آمدنی پر؟۔

سوال (۲) ایک کاروباری ادارہ میں کیا زکوٰۃ کاروبار سے ہوئے نفع پر واجب الاداء ہے یا کسی مقررہ خاص طور پر موجودہ اسٹاک پر؟۔

میں نے انزائش جانوروں کے کیس میں پڑھا ہے کہ اگر جانور کی خرید و فروخت ہوتی ہو تو زکوٰۃ مقررہ خاص تاریخ پر فارم میں موجود جانوروں کی بازاری قیمت (Market rate) پر واجب الاداء ہوگی، البتہ ایسی صورت میں کہ یہ جانوروں (واشیاء) کے فروخت کا ذریعہ ہوں، جیسے دودھ، انڈا، تہ زکوٰۃ دودھ/انڈوں پر عائد ہوگی اور جانوروں پر نہیں۔

سوال (۳) سرمایہ اندوزی، تمسکات کی صورت میں زکوٰۃ خالص یا صافی آمدنی، یعنی اخراجات کے بعد بچنے والی آمدنی پر واجب الاداء ہے، چونکہ شخصی اخراجات، ہر فرد کے جدا اور ہر سماجی طبقہ کے الگ ہوتے ہیں، اس لئے شخصی اخراجات کی تحدید کے لئے کیا کوئی معیار مقرر کیا جاسکتا ہے۔

انٹرسٹ اور یوزری اکثر ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

رٹم ہاؤس ڈکشنری میں انٹرسٹ کی تعریف یہ کی گئی ہے: ”کسی جائیداد کی ملکیت، یا تجارت، یا کاروبار کی ملکیت میں قانونی حصہ، حق یا سند ملکیت، رقم جو ادا کی جائے، یا عائد کی جائے، پیسے کے استعمال پر، یا کسی پراجیکٹ، یا کاروبار شروع کرنے، یا جاری رکھنے کے لئے لئے گئے قرض پر“۔

”یوزری“ کی ڈکشنری میں اس طرح تعریف کی گئی ہے: ”ایک حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شرح انٹرسٹ پر پیسے قرض دینا، یا قرض دینے کی عادت“۔

اسلام یوزری پر پابندی لگاتا ہے، کیونکہ مجبور افراد کے استحصال کا کھلا ہوا عمل ہے، آج کے معاشی نظام ”انٹرسٹ“ تمام کاروباری دین کے اندر موجود ہے، ایک شخص صرف اپنی بقاء کی ضرورت کے لئے قرض نہیں لیتا، بلکہ اس رقم کو بڑھانے کے لئے، دولت پیدا کرنے کے لئے اور قرض دار کے لئے اور معاشرے کے لئے عام طور پر مواقع پیدا کرنے کے لئے قرض لیتا ہے، قرض دار قرض دینے والے فرد، یا ادارے کو ایک مقررہ منافع کی طمانیت دیتا ہے، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جہاں ہم لوگ زربسر کرنا ہے ایک شخص مقررہ شرح انٹرسٹ سے کچھ لئے یادئے بغیر رہ سکتا ہے۔

ہندوستان اسلامی ریاست نہیں ہے، ہر موڑ پر انٹرسٹ دینا پڑتا ہے، یا لینا پڑتا ہے،



چند مثالیں درج ہیں:

- ۱- زمینداری کے خاتمہ کے بعد، ان املاک کے مالکوں کو معاوضہ دو فیصد انٹرسٹ کے زمینداری بانڈز دئے گئے۔
  - ۲- اگر کوئی شخص اپنے اثاثہ کو فروخت کرتا ہے تو اس کو کچل دینے والا کیپٹل کینس Capitally to pay ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، اس ٹیکس سے بچنے کیلئے وہ شخص مجبور ہے کہ اس رقم کو بعض مقررہ سیکورٹیز، تمسکات میں جیسے کیپٹل کینس یونٹ میں لگائے جن پر کم شرح سے، مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ دیا جاتا ہے۔
  - ۳- شخصی آمدنی پر ٹیکس کی شرح ساری دنیا کے مقابلہ میں ہندوستان میں سب سے زیادہ اونچی ہے، کئی صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی پچاس فی صد سے زیادہ آمدنی ٹیکس والوں نے ہضم کر لی، اس ظالمانہ محصول کی زد سے بچنے کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے بعض اسٹاکس، یا بانڈز میں رقم لگائی جائے جن پر کم، مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ملتا ہے۔
  - ۴- پراویڈنٹ فنڈ ہماری آمدنی سے کی جانے والی لازمی منہائیوں پر مشتمل ہوتا ہے جس پر کمپنی کم، مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ادا کرتی ہے، تنخواہ یا ب لوگوں کے لئے پراویڈنٹ فنڈ ہی بڑھاپے میں بچت کا واحد راستہ ہوتا ہے۔
- اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو اس کے تغیر پذیر آمدنی پیدا کرنے والے سرمایہ کاری کے مواقع ہیں، جائیداد، یا شیئرز میں رقم لگانا سرمایہ کاری کے دو اہم ذرائع ہیں جن میں تغیر پذیر نفع حاصل ہوتا ہے۔
- مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج شیئرز مارکیٹ جوئے کا اڈا بن گئی ہے جہاں مارکیٹ پر کنٹرول کرنے والوں کی من مانی سے، یا سیاسی تبدیلیوں سے

انواہوں سے قسمیں بنتی اور بگڑتی ہیں، شیئرز کی قیمتوں کا کوئی تعلق متعلقہ کمپنی کی مالی حالت سے نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک شخص جائیداد خریدنے میں ایک مقررہ حد سے زیادہ کی جائیداد نہیں لے سکتا، ورنہ اس حد سے زیادہ کی جائیداد سیلنگ (Ceiling) کے تحت حکومت لے لیتی ہے، ان حالات میں کیا حکومت کی سیکورٹیز، یا بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسڈ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار دی جاسکتی ہے؟۔

## تجاویز

”مجمع الفقہ الاسلامی اہند“ کے پانچویں سمینار منعقدہ ۳۰/۳۱ اکتوبر، ۲۰۱۱ء کو بمقام ”جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ“ میں زکوٰۃ سے متعلق چند اہم مسائل پر غور کیا گیا اور فیصلے کئے گئے جو ذیل میں درج ہیں:

### تجاویز بابت حاجت اصلیہ

وجوب زکوٰۃ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس جو مال ہے وہ اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو، حوائج اصلیہ میں جو امور قابل اعتبار ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- اپنے اور اپنے اہل و عیال، نیز زیر کفالت رشتہ داروں سے متعلق روزمرہ کے اخراجات۔

۲- رہائشی مکان، کپڑے، سواری، صنعتی آلات، مشینیں اور دیگر وسائل رزق جن کے ذریعہ کوئی شخص اپنی روزی کماتا ہے۔

۳- حوائج اصلیہ کا تعین ہر زمانہ، علاقہ اور افراد کے حالات اور ان کے معیار زندگی کی روشنی میں ہوگا۔

۴- حوائج اصلیہ کی مد میں ضروریات زندگی اور روزمرہ کے پیش آنے والے اخراجات داخل ہیں اور اعتبار سال بھر کے اخراجات کا ہوگا اور آئندہ سال کی ضرورت کے لئے جو سرمایہ محفوظ رکھا جائے گا، زکوٰۃ نکالتے وقت حوائج اصلیہ میں شمار ہو کر اموال زکوٰۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

## دین کی زکوٰۃ

مقالہ نگاروں کی آراء اور مباحثوں کو سامنے رکھ کر یہ سمینار اس نتیجے پر پہنچا:

۱- دین کی دو قسمیں ہیں، وہ دین جس کے وصول ہونے کی کوئی امید نہ ہو، جیسے ڈوبی ہوئی رقم اور وہ دین جس کے وصول ہونے کی پوری امید ہو، جس دین کے وصول ہونے کی کسی وجہ سے امید ختم ہوگئی ہو، اگر وہ دین کبھی وصول ہو جائے تو وصولی کے دن سے ایک سال گزرنے کے بعد ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲- مقرض اگر قرض دہندہ کے مطالبہ و اصرار کے باوجود اس حد تک مال منول سے کام لے کہ دائن اس کی وصولیابی سے مایوس ہو جائے تو اس مال کی زکوٰۃ قرض دہندہ پر واجب نہ ہوگی، اگر ایسا قرضہ کبھی وصول ہو جائے تو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳- جس دین کا وصول ہونا متوقع ہو، اس کی تین صورتیں ہیں:

الف- وہ دین قرض کی صورت میں ہو یا سامان تجارت کی قیمت کسی کے ذمہ باقی ہو، ایسے دیون میں وصول ہونے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی۔

ب- وہ دین جو ایسے مال کے عوض ہو جو تجارت کے لئے نہیں تھا اور نہ قرض کے طور پر دیا گیا تھا جیسے مال وراثت یا مال وصیت۔

ج- ایسا دین جو کسی مال کا عوض نہ ہو، جیسے مہر، ان دونوں صورتوں میں دین وصول ہونے کے بعد سال گزر جانے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۴- سرکاری یا غیر سرکاری اداروں سے لئے جانے والے طویل المیعاد قرضوں کی صورت میں ہر سال جو قرض کی قسط ادا کرنی ہے اموال زکوٰۃ میں سے منہا کی جائے گی اور باقی اموال زکوٰۃ پر زکوٰۃ واجب ہوگی، پورا قرض منہا نہیں کیا جائے گا۔

تجارت میں پیشگی دی ہوئی قیمت اور کرایہ دکان و مکان میں ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ کا مسئلہ

۱- الف: مال تجارت جس کی مشتری نے پیشگی قیمت ادا کر دی ہے، لیکن بیع پر اس کا قبضہ نہیں ہوا ہے تو اس ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی، بلکہ بائع پر واجب ہوگی۔

ب: بیع کی زکوٰۃ بیع سلم اور بیع استصناع کی صورت میں مشتری کو بیع سونپے جانے سے قبل بائع پر واجب ہوگی اور بیع سلم اور بیع استصناع کے علاوہ بیع کی وہ شکل جس میں بیع کی تعیین ہو چکی ہے، لیکن مشتری کا اس پر قبضہ نہیں ہوا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی۔

۲- شرکاء سمینار کی عام رائے یہ ہے کہ کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان و دکان وغیرہ کو پیشگی دی گئی ضمانت کی رقم (Security Deposit) پر زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ واجب نہیں ہوگی۔ شرکاء سمینار میں سے کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی اور دوسری رائے یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ کسی پر نہیں ہوگی۔

ہیرے جوہرات اور اس کی خاص صورت میں زکوٰۃ کا مسئلہ جب ہیرے جوہرات بہ طور ذخیرہ اندوزی حاصل کئے گئے ہوں۔

الف- جو ہیرے جوہرات تجارت کی نیت سے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی۔

ب- جو ہیرے جوہرات، زیورات وغیرہ کے لئے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب نہیں ہوگی۔

ج- ایک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ لوگ بڑی بڑی رقم ہیرے جوہرات کی خرید پر صرف کر دیتے ہیں اور اپنی نقد رقم کو ہیرے جوہرات میں بدل کر مختلف مصالح کے تحت محفوظ کر لیتے ہیں۔

”مجمع الفقہ الاسلامی“ کے سمینار میں مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس صورت میں لاکھوں لاکھ کی نقد رقم ہیرے جوہرات کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہو جاتی ہے، جو کسی بھی وقت نقد کی صورت میں منتقل ہو سکتی ہے، بحث کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ اس مسئلہ میں ایک جہت تو یہ ہے کہ ہیرے جوہرات سونا چاندی نہیں ہیں جو خلقت نامی تسلیم کئے گئے ہیں اور اس شخص کا کام ہیرے جوہرات کی تجارت بھی نہیں ہے اور نہ فوری طور پر خریدتے وقت باضابطہ تجارت کی نیت کی گئی ہے تاکہ بہ سبب مال تجارت ہونے کے اسے نامی قرار دیا جائے، اس لئے اس جہت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو۔

دوسری جہت یہ ہے کہ ہیرے جوہرات ضروریات زندگی میں داخل نہیں، اور اصحاب سرمایہ اپنے خاص مصالح کے لئے اپنے روپوں کو جن کی مقدار غیر معمولی حد تک زائد ہوتی ہے، ہیروں اور جوہرات کی صورت میں محفوظ کر کے مختلف فوائد بھی حاصل کرتے ہیں اور انہیں اس طرح اس کا اطمینان بھی رہتا ہے کہ ان ہیروں اور جوہرات کی صورت میں کوئی ”زر نقد“ ہر دم ان کے پاس محفوظ ہے اور اس کے نتیجے میں فقر، اذیت، نقصان ہوتا ہے کہ نقد رقم میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو عام حالات میں ہیرے جوہرات کی صورت میں عام اصول کے پیش نظر واجب نہیں ہوتی۔

سمینار میں شریک علماء و اصحاب افتاء میں سے ایک خاصی تعداد نے پہلی جہت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس خاص صورت میں محفوظ ہیرے جوہرات کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جبکہ دوسری بڑی تعداد ان علماء و اصحاب افتاء کی تھی جنہوں نے دوسری جہت کو سامنے رکھتے ہوئے اس خاص صورت میں ذخیرہ کئے ہوئے ہیرے جوہرات کو حکماً مال تجارت تسلیم کیا اور اس پر زکوٰۃ واجب قرار دیا، ہر دو جہت کے مطابق رائے رکھنے والے ممتاز علماء کے اسماء گرامی ذیل میں علیحدہ علیحدہ درج کئے جاتے ہیں:

## وجوب زکوٰۃ کے قائلین حضرات کے اسماء گرامی

- ۱۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
- ۲۔ مولانا طیب الرحمن صاحب مہر شریعت آسام
- ۳۔ مفتی عزیز الرحمن صاحب بمبئی
- ۴۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
- ۵۔ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوئی
- ۶۔ مولانا شمس پیر زادہ صاحب بمبئی
- ۷۔ مولانا انیس الرحمن صاحب قاسمی پٹنہ
- ۸۔ مولانا عبدالرحیم صاحب بھوپال
- ۹۔ مفتی عبدالرحمن صاحب دہلی
- ۱۰۔ مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی سینٹا مرٹھی
- ۱۱۔ مولانا رفیق المنان صاحب حیاء العلوم مبارکپور
- ۱۲۔ مفتی نذیر احمد صاحب بارہ بنکی
- ۱۳۔ مولانا شعیب صاحب سرائے میر
- ۱۴۔ مولانا عتیق احمد صاحب قاسمی وغیرہم

## عدم وجوب زکوٰۃ کے قائلین کے اسماء گرامی

- ۱۔ مولانا مفتی بہان الدین سمبھلی صاحب لکھنؤ
- ۲۔ مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب دیوبند
- ۳۔ مولانا نعمت اللہ صاحب قاسمی دیوبند
- ۴۔ مولانا عبید اللہ صاحب سعدی باندہ
- ۵۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد
- ۶۔ مفتی نسیم احمد قاسمی پٹنہ
- ۷۔ مولانا صدر الحسن ندوی اورنگ آباد
- ۸۔ مولانا محی الدین صاحب کجرات وغیرہم

## تجویز متعلقہ پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ (تنخواہ سے لازمی طور پر وضع ہونے والی رقم) جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جب یہ رقم وصول ہو جائے اور بقدر نصاب ہو، اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

بعض اوقات کچھ لوگ قانون اکم ٹیکس کی زد سے بچنے یا دیگر مصالح کی خاطر اختیاری طور پر اپنی تنخواہ سے کچھ زائد رقم وضع کر کر پی ایف (P. F.) جمع کرتے ہیں یہ رقم اگر قدر نصاب کو

پہنچ جائے تو سال بہ سال زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی، اس اختیاری وضع کرائی ہوئی رقم کی حیثیت ودیعت کی ہے اور مال ودیعت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

### تجویز بابت وظیفہ طلبہ

مدرسہ میں طلبہ کے قیام و طعام اور تعلیم وغیرہ پر جو مجموعی مصارف آتے ہیں ان کا حساب لگا کر ہر طالب علم پر واجب الاداء ماہانہ اخراجات کی بقدر مد زکوٰۃ سے ادا کئے جائیں، یہ ادائیگی بہ صورت نقد یا چیک طالب علم کو دی جائے اور خود مہتمم مدرسہ بھی یہ رقم زکوٰۃ اکاؤنٹ سے نکال کر مدرسہ کے عام اکاؤنٹ میں اس کی طرف سے جمع کر سکتا ہے بشرطیکہ بہ وقت داخلہ فارم داخلہ میں طالب علم کی طرف سے اور اگر نابالغ ہو تو اس کے ولی کی طرف سے یہ تصریح کرادی جائے کہ مہتمم مدرسہ اس کی طرف سے از مد زکوٰۃ اس کے اخراجات مدرسہ کو ادا کرنے کا مجاز ہوگا۔

### مال حرام کی زکوٰۃ

۱- مال حرام کسی کی ملکیت میں آجائے اور وہ عینہ موجود ہو، نیز مال کا اصل مالک معلوم ہو تو اس شخص کو وہ پورا مال لوٹا دینا واجب ہے۔

۲- اگر مال حرام متعین طور پر معلوم نہ ہو سکے یا اس کی مقدار معلوم نہ ہو سکے تو غالب گمان کے مطابق مال حرام کی مقدار متعین کے جائے گی، اگر مالک معلوم ہو تو اتنی مقدار میں رقم اس کے مالک کو واپس کر دی جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو اسی مقدار میں بلا نیت ثواب صدقہ کر دی جائے۔

۳- اگر مال حرام کی واپسی اس پر واجب ہوئی اور اس نے واپس نہیں کیا اور مال حرام اس کے قبضہ میں باقی رہ گیا اور مال کا کوئی انسان مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، ایسی صورت میں اس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی اور زکوٰۃ ادا کرنے کے باوجود حق دار کو لوٹانے یا حق دار کے معلوم



نہ ہونے کی صورت میں بلا نیت ثواب صدقہ کرنے کا حکم باقی رہے گا۔

مال حرام میں اصل یہی ہے کہ اگر ایسے مال کا طلب کرنے والا مالک موجود ہو تو اس کو واپس کر دیا جائے ورنہ صدقہ کر دیا جائے، اور اگر حرام و حلال مال مخلوط ہو تو تخری ورجان قلب کے مطابق مال حلال کی مقدار متعین کر کے اس کی زکوٰۃ دی جائے، مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ مگر استحسان کا تقاضہ یہ ہے کہ پورے کے پورے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو یقینی اور اطمینان بخش طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرنے والا فریضہ زکوٰۃ سے بری الذمہ ہو جائے اور ظالمانہ اور حرام طریقوں سے لوگوں کے مال سے فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو، نیز ایسا نہ ہو کہ مال حرام کھانے والا دو طرفہ فائدہ اٹھائے اس طرح کہ ایک طرف مال حرام سے انتفاع کرے اور زکوٰۃ سے بھی بچ جائے۔

### تجویز بابت اموال مدرسہ وغیرہا

زکوٰۃ کی جو رقم مدارس یا بیت المال میں اکٹھا ہوتی ہیں، ان کا کوئی مالک متعین نہیں، اسی طرح جو رقم اور قسم عطایا و صدقات نافلہ اداروں کو مطلق وجوہ خیر میں صرف کرنے کے لئے یا متعین مدت پر صرف کرنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ وہ دینے والوں کی ملک سے نکل کر اللہ کی ملک میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لئے بیت المال، مدارس یا دیگر رفاهی اداروں میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

### تجویز بابت کمیشن پر زکوٰۃ

”مجمع الفقہ الاسلامی اہند“ کے پانچویں سمینار منعقدہ ”جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ“ میں کمیشن پر زکوٰۃ کی وصولی کا موضوع زیر بحث آیا۔

مقالات اور شرکاء کے مباحثات کی روشنی میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کمیشن پر زکوٰۃ کی

وصولیابی کا مروچہ طریقہ جائز نہیں ہے۔

### فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے

۱- شرکاء سمینار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت مصارف زکوٰۃ (توبہ ۶۰) نے جن آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کو محدود کر دیا ہے ان میں وہ قطعی ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا، اور آیت مصارف زکوٰۃ (سورہ توبہ ۶۰) میں مذکورہ آٹھ مصارف زکوٰۃ کا حصر حقیقی ہے اضافی نہیں ہے۔

۲- اس آیت میں مذکور ”فی سبیل اللہ“ کا مصداق عام شرکاء سمینار کے نزدیک غزوہ اور جہاد عسکری ہے۔

بعض شرکاء سمینار کا نقطہ نظر یہ ہے کہ فی سبیل اللہ میں عسکری جہاد کے ساتھ وہ تمام کوششیں شامل ہیں جو آج کے دور میں واقعہ دعوت اسلام اور اعلائے کلمتہ اللہ کے لئے کی جارہی ہوں، ان حضرات کے نام یہ ہیں:

۱- جناب شمس پیرزادہ صاحب

۲- مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب

۳- ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب

شیخ محمد محروس المدرس عراقی کی رائے یہ ہے کہ ”فی سبیل اللہ“ کے مفہوم میں عموم ہے۔

۳- عام شرکاء سمینار کا خیال یہ ہے کہ دور حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لئے

درکار سرمایہ کی فراہمی میں پیش آنے والی دشواری کے باوجود شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے مصرف ”فی سبیل اللہ“ کا دائرہ وسیع کر کے اس میں تمام دینی اور دعوتی کاموں کو شامل کر لیا جائے کیونکہ قرون اولیٰ میں اس تعمیر و توسیع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نیز ایسا کرنے سے مسلمانوں کے محتاج، نادار اور افلاس زدہ طبقہ کی مال زکوٰۃ کے ذریعہ کفالت جو زکوٰۃ کا اہم ترین

متقصد ہے فوت ہو جائے گا، اس نقطہ نظر سے ان حضرات کا اختلاف ہے جنہیں دفعہ ۲ سے اختلاف ہے۔

### تجویر متعلقہ حیثیت سفراء، مصلین و مہتمم مدرسہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل مدارس زکوٰۃ و صدقات کی جو قیاس وصول کرتے ہیں وہ فوری طور پر خرچ نہیں ہوتیں اور بسا اوقات خاصے عرصہ تک باقی رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے ادائیگی و عدم ادائیگی زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، لہذا فقہ اکیڈمی میں اس سے متعلق سوالنامہ کے جوابات کی روشنی میں ذیل کی تجویز منظور کی جاتی ہے۔

زکوٰۃ کی وصولی میں مہتمم یا اس کا نائب (سفیر و عامل) طلبہ کا وکیل ہے، مہتمم یا اس کے نائب (سفیر و عامل) کو دیدینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مہتمم مدرسہ کا فرض ہے کہ زکوٰۃ کی رقم حسب احکام شرع طلبہ پر صرف کرے۔

### تجویر بشکر یہ

الحمد للہ آج اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ پانچواں فقہی سمینار جامعۃ الرشاد کے روح پرور علمی ماحول میں اختتام پذیر ہوا، مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے جامعہ میں اس سمینار کا انعقاد کر کے جس سکون و اطمینان کے ساتھ بحث و تحقیق کا موقع فراہم کیا اور جامعہ کے اساتذہ و طلبہ ضلع ”اعظم گڑھ و منو“ کے اصحاب نے جو پذیرائی کی اور جملہ شرکاء کی جس طرح راحت رسانی اور آرام پہنچانے کی کوششیں کیں، اس کے لئے شرکاء سمینار ان سب کا تہ دل سے شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ”جامعۃ الرشاد“ کو قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

جدید فتنہ تحقیقات

۶

دوسرا باب

تفصیلی مقالات

## سوالنامہ کا جواب

حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ

زکوٰۃ مال نامی میں واجب ہوتی ہے، خواہ نامی بالذات ہو، یا نامی بالفرض، اپنے قیود و شروط سے اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم ہے۔  
 پہلی شرط مملوک بہ ملک تام ہونا ہے، اور ملک تام سے وہ ملک مراد ہے جو مملوک پر ’’یداً و رقبتاً‘‘ دونوں طرح سے حاصل ہو، اور ملک رقبتہ سے مراد خرید و فروخت کا مالک ہونا ہے اور ملک یداً سے مراد اپنے قبضہ و تصرف میں ہونا ہے۔

جواب

۱- ان مذکورہ دونوں صورتوں میں ادائیگی زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ ان صورتوں میں شیء مشترکہ پر ابھی ملک نہ تو رقبتہ حاصل ہے اور نہ یداً حاصل ہے، بہت سے بہت وعدہ تملیک ہے اور محض اس میں وجوب زکوٰۃ متحقق نہیں ہوتا۔  
 ۲- صرف کرایہ دار پر واجب ہوئی۔

۳- ان اداروں و مدارس سے مراد اگر دینی تعلیم کے ادارے و مدارس ہیں تو ان میں دینی تعلیم کے لئے آئی ہوئی رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس مسئلہ کی تفصیل و مدلل بحث ’’منتخبات

نظام الفتاویٰ“ میں بجزیر عنوان (مدارس میں آئی ہوئی رقوم کا شرعی حکم) آچکی ہے، وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

۴- جب کوئی حرام مال اپنی ملک میں آجائے تو چونکہ یہ مال مملوک بہ ملک خبیث ہوگا اس لئے اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو حسب ضابطہ شرع مالک تک پہنچادے، یعنی ردالی رب المال کر دیا جائے، جیسا کہ مذہبی کتب کی ان عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے مثلاً:

“إذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمة ووجوب رده عليه (أى

علی رب المال)“، نیز دیکھئے: (بذل المجهود ۱/ ۳، درمختار ۵/ ۱۱۶، رد المحتار کتاب الخصب ۵/ ۱۱۶)۔

پھر جو بیچ جائے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو تملیک کا دے کر جلد سے جلد اپنی ملک سے نکال دیا جائے، ہاں اس کو اگر ردالی رب المال کرنے میں کوئی شرعی، یا قانونی رکاوٹ حائل ہو، مثلاً آج کل ہندوستان کے حکومتی، یا نیشنل بینکوں سے سود میں ملنے والی رقوم کو اگر بینکوں ہی میں چھوڑ دیں تا کہ ردالی رب المال ہو جائے تو اگر اصحاب بینک اس کو اپنے دھرم کھاتے میں ڈال دیں تو وہ عموماً ایسے کاموں میں استعمال ہوں گی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے، اس لئے حکم شرعی یہ دیا جاتا ہے کہ وہاں نہ چھوڑ دے، بلکہ وہاں سے نکال کر خود کسی مناسب سبیل سے ردالی رب المال کر دے، کما اشرت الیہ بقولہ۔ یا کوئی اور واقعاتی پریشانی حائل ہو، مثلاً کوئی جانی یا مالی پریشانی یا عزت نفس کی پامالی کا قوی اندیشہ وغیرہ ہو تو اس طرح ردالی رب المال کر دے کہ مالک کو معلوم بھی نہ ہو اور وہ مال اس کی ملک میں پہنچ جائے، اس کے نظائر کتب فقہ میں بکثرت ملتے ہیں، نیز اس کی تفصیل اور اس کا حکم شرعی ہندوستان کے ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کا ردالی رب المال کے سلسلہ میں ”منتخبات نظام الفتاویٰ“ کے اندر بہ ضمن ”احکام حوادث الفتاویٰ“ ملتا ہے کہ ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینک میں نہ چھوڑ دے، بلکہ وہاں سے نکال کر خود پہلے حکومت

کے غیر شرعی مطالبات میں جو واجب الاداء ہے، دے دے، مثلاً روڈ ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، کورٹ فیس وغیرہ، پانی، یا بجلی کے مطالبہ میں نہ دے، کیونکہ وہ عقود مبادلہ کا ایک بدل ہے، جو شرعاً بھی درست ہے۔

### ایک شبہ

بعض حضرات شبہ یہ کرتے ہیں کہ بینک سے ملنے والی سودی رقوم کا مالک حکومت کب ہوتی ہے کہ اس کو روک دیا جائے، بلکہ ان رقوم کا مالک تو بینک میں رقم جمع کرنے والے ہوتے ہیں، پس اگر روکنا ہی ہے تو ان کی طرف روک دیا جائے۔

### شبہ کا ازالہ

جواب یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے وہ یا تو کسی قانونی مجبوری سے، یا محض بغرض حفاظت داخل کی جاتی ہے، کسی عوض لینے کی نیت سے جمع کرنا درست ہی نہیں ہے، اسی لئے فحس ڈپازٹ میں جمع کرنا ممنوع و ناجائز ہے۔

جو رقم محض حفاظت کے لئے جمع کی جائے گی وہ بینک میں بصیغہ امانت ہوگی اور اس پر بینک کا کوئی تصرف کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا اور جب ان داخل شدہ رقوم کو بینک خلط ملط کر دے، یا اس کو اپنے کام میں صرف کر دے تو وہ امانت شرعاً قرض بن جاتی ہے اور امانت کا معاملہ مبدل بہ معاملہ قرض ہو کر مستقرض مالک ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس پر ضمان واجب الاداء ہو جاتا ہے، پس شرعی ضابطہ کے مطابق بینک مقرض ہو کر اپنے ان تصرفات کی وجہ سے ان رقوم کا خود مالک ہو گیا اور بینک حکومتی، یا نیشنل ہونے کی وجہ سے حقیقتاً حکومت ان رقوم کی مالک ہو گئی اور یہ عملہ بینک حکومت کے محض نمائندہ اور وکیل ہوں گے، لہذا ان رقوم کا روکنا حکومت کی جانب لازم ہوگا، نہ کہ جمع کرنے والوں کی طرف، (کما لایخفی علی من له خبرۃ بالفقہ والأصول)۔

رہ گئی یہ بات کہ اگر حرام مال حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ اس میں تمیز و امتیاز مشکل و معذور ہو جائے تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟۔

اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ کاغذات و اندراجات کے حساب و کتاب کے ذریعہ، یا پھر اپنی یادداشت سے خوب غور و خوض سے جتنی مقدار حلال مال کی متعین ہو اس کی تو زکوٰۃ حسب ضابطہ شرع ادا کر دے اور اس سے زائد کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کے کل مال حرام بقسط واحد اگر قدرت میں ہو، ورنہ باقسط متعددہ حسب استطاعت جہاں تک جلد ہو سکے بطور صدقہ فقراء و مساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔

### سوال (۵) کا شرعی حکم

دین کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب ہے جس کی ملک وہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگرچہ دین کی تین قسمیں ہیں: دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف اور ہر ایک کے احکام الگ الگ ہیں، مگر تسہیلاً للعلم اور نفع للفقراء ہونے کے پیش نظر راجح قول میں جتنی مقدار جس وقت وصول ہوتی جائے اسی وقت اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا چاہئے اور اگرچہ دین قوی و غیر قوی کے اعتبار سے نفس وجوب میں کچھ تفصیل و اختلاف ہے، مگر اس طریقہ عمل سے عمل کرنے میں کسی کے نزدیک وجہ اختلاف نہ رہے گی۔

### سوال (۶) کا شرعی حکم

یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جو جز و تنخواہ ملازم کے قبضہ میں جانے سے قبل محکمہ وضع کرنا ہے اور بعد ختم ملازمت وضع کی ہوئی رقم میں اضافہ کر کے دیتا ہے، خواہ سود کے نام سے دے، مگر وہ زیادتی شرعاً سود نہیں ہوتی، خواہ دوران ملازمت میں ملازم اپنے ہی جمع کردہ روپیہ سے کچھ روپیہ لے اور محکمہ اس کو قرض کے نام سے دے اور اس پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول



کر کے اس ملازم کے فنڈ میں جمع کرے اس پر بھی شرعاً سود کی تعریف صادق نہ آنے سے سود کا حکم نہ ہوگا، بلکہ اس کو حکمہ کا انعام قرار دیا جاتا ہے، (کما حققه العلامة التہانوی فی فتاواہ)، کیونکہ اپنے مملوک مال میں جب عقد معاوضہ کا معاملہ کرے تو فضل ربوا اور سود ہوتا ہے اور یہاں جو حزن و تنخواہ کاٹی گئی ہے ابھی اس میں اجیر (ملازم) کا صرف استحقاق ملک ثابت ہوتا ہے اور استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے، تحقق ملک تو قبضہ کرنے کے بعد صادق آئے گی اور تحقق ملک سے قبل مملوک ہونا صحیح نہیں، لہذا اس تحقق ملک سے قبل جتنا بھی دیں گے وہ بجائے سود ہونے کے شرعاً صرف انعام قرار پائے گا اور ملازم کا اس پر اپنے مملوک کی طرح تصرف کرنا درست رہے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ تو اپنے مملوک مال میں واجب ہوتی ہے لہذا قبضہ میں آنے سے قبل اس صاحب فنڈ پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا وجوب بھی نہ ہوگا، کیونکہ شرعاً یہ اصول مسلم ہے کہ سبب وجوب کے تحقق سے پہلے نفس وجوب بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ زکوٰۃ کے وجوب کا سبب مقدار نصاب کا مالک ہونا ہے اور جب تک مقدار نصاب کا مالک نہیں ہوتا اس وقت تک نفس وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی نہیں ہوتا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وصول ہونے کے بعد سابق زمانہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہ ہوگی، جیسا کہ مالک نصاب ہونا جو نفس وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے، اس نفس وجوب سے قبل کوئی ادا کرے تو زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح شمار نہ ہوگی، جس طرح کسی معین وقت کی فرض نماز کے نفس وجوب کا سبب اس فرض کے وقت کا تحقق ہوتا ہے اور اس سبب (وقت نماز) کے تحقق سے قبل فرض ادا کر دے تو فرض ادا نہ ہوگا، ہاں نفس وجوب کے متحقق ہو جانے کے بعد جب بھی ادا کرے تو ادائیگی صحیح ہوگی، اسی طرح یہاں بھی ایسا ہی ہوگا کہ نفس وجوب زکوٰۃ جب تک اس رقم کے پانے والے پر، یعنی مقدار نصاب ملک ثابت ہونے پر ادائیگی زکوٰۃ بھی درست ہوگی ورنہ صحیح

نہ ہوگی، پھر نفس وجوب کے تحقق کے بعد اگر چاہے تو پیشگی ادائیگی بھی صحیح ہو سکے گی۔  
 رہ گئی یہ بات کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے شرط ہے کہ نصاب زکوٰۃ کی مقدار ایسے  
 مال نامی کا مالک ہو جو اس کی حاجت اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہو، لہذا ان تینوں (مال  
 نامی کی اور حاجت اصلیہ کی اور دین سے فارغ ہونے کی) مختصر تشریح کردی جاتی ہے۔

### مال نامی: مال نامی چند قسم پر ہوتے ہیں

الف- خلقۃ مال نامی ہونا جس کو اللہ نے پیدا ہی فرمایا نمو کے لئے، جیسے سونا چاندی  
 اور اس سے بنی ہوئی ہر وہ چیز، خواہ زیور ہو، یا اس کے علاوہ کوئی چیز ہو اور چاندی، یا سونا کا سکہ  
 جیسے دینار، درہم اشرفی، یا چاندی کا روپیہ اور اصطلاح میں اس کو سکہ نافقہ خلقیہ کہتے ہیں۔  
 ب- وہ چیزیں جن کو اللہ نے نمو کے لئے نہیں پیدا فرمایا ہے، بلکہ لوگوں نے اس کو مال  
 نامی کے قائم مقام تر اردے دیا ہے اور سونے چاندی کے علاوہ جاری سکہ تر اردے دیا ہے، جیسے  
 غیر چاندی کا پیسہ روپیہ اور کاغذی نوٹ، پونڈ، ڈالر، ریال وغیرہ اس کو اصطلاح میں سکہ نافقہ غیر  
 خلقیہ کہتے ہیں۔

ج- وہ مال جس کی تجارت کرتے ہیں۔

یہ تینوں قسمیں مال نامی کی ہیں، اول نامی خلقۃ، دوسری نامی حکماً و عرفاً، تیسری نامی  
 عملاً، جب یہ تینوں باتوں میں سے کوئی ایک نصاب کی مقدار کے برابر ملک میں آجائے اور  
 حاجت اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہو جائے تو نفس زکوٰۃ کا وجوب ہو جائے گا اور حاجت  
 اصلیہ سے وہ حاجت مراد ہیں جو اپنے ذمہ میں داخل شدہ اہل و عیال کی روزمرہ کی ضروریات  
 سے فاضل ہو کر سال بھر فاضل رہ جائیں، اسی طرح دین سے فارغ ہونے سے مراد یہ ہے کہ  
 اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے جو دین لیا جائے اس سے فارغ ہو، اتنے مال کا نفس  
 مالک ہو جانے سے زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا اور جب اتنی مقدار پورے سال بھر مذکورہ

ضروریات سے فارغ رہ جائے تو اس کے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی واجب ہو جائے گی، البتہ بے ضرورت واقعی قرض لینا ممنوع ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ ہر انسان ہر ذمہ سے بری رہے اور جب ضرورت واقعی ہو تو قرض لینا درست رہے گا، اگر غیر سودی قرض نہ ملے تو حاجت شدیدہ میں سودی قرض لینا یا سودی معاملہ کر لینا بھی جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ: ”ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (الاشباہ والنظائر) کے جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ آجائے گی ”ہذہ ما تیسر لی الآن والباقی سیاتی علی حسب الاستطاعة“۔

ہاں اس ضمن میں ایک یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ یہ صاحب خود تو مقرض یا دین میں دبا ہوا نہیں ہے، بلکہ اپنی ملکیت اور سامان تجارت کے بعد قرض و دین دوسروں کو دے دیا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ کیا ادائیگی زکوٰۃ میں یہ دینا تو حائل نہ ہوگا تو اس میں کیا تفصیل ہے؟ اس کو بقدر ضرورت ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں اور وہ عمل کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے اب اس پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔

سوالات مطبوعہ کے صفحہ دو کے پچھلے حصہ میں طویل الاجل دین کی گفتگو ہے، اس دین کا حاصل تجارتی دین ہے، اس دین کو انسان، خواہ قانونی مجبوری یا محض اپنے خالص اختیار سے کاروبار کرنے یا چلانے کے لئے حاصل کرتا ہے، حاجت اصلیہ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، ”کما مر آنفاً من تعریف الحاجة الأصلية“، لہذا یہ قرض وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہونے میں مانع نہ ہوگا بلکہ وہ حاجت اصلیہ کی شرعی سابق تعریف میں قرض کی جتنی مقدار حائل ہوگی اس کے وضع کرنے کے بعد باقی سب پر وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہوگا۔

کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ پہلے معلوم ہونی چاہئے پھر حکم شرعی لگانا چاہئے، کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ اولاً شرکت عنان کی ہوتی ہے اور شیئرز خریدنے والے سب شرکاء کمپنی اور شرعاً مالک ہوتے ہیں اور عملہ کمپنی، یعنی کمپنی میں کام کرنے والے وکیل و مسؤل ہوتے ہیں، مگر یہ لوگ

بعد وقانون وقت خود مالک بن جاتے ہیں، اور اس میں جمع شدہ حصص میں کچھ مقدار اپنا کمپنی کی بضاعت (پونجی) تراردیتے ہیں، اور کچھ کفزنچر و آلات مشین وغیرہ میں شمار کرتے ہیں اور کچھ کو کاروبار میں لگاتے ہیں، ان سب واقعاتی امور میں بھی وہ شرعاً غصب ہی شمار ہوگا اور اس پر غصب ہی کے احکام جاری ہوں گے اور یہ امر مسلم ہے کہ شئی منصوب پر جب تک منصوب بعینہ یا اس کا بدل وصول نہ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب یا رد کے احکام شرعاً درست نہیں ہوتے، اس لئے کمپنیوں کے ان حصوں کو جب تک بیچ کر نقد نہ کر لیا جائے اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم متوجہ نہ ہوگا۔

ہیرے جوہرات کی خرید و فروخت کا جب کاروبار کریں تو اموال تجارت میں ان کا شمار ہو کر سال پورا ہونے پر اس کا عام کاروبار کرنے والوں کے یہاں اس کی جو قیمت ہوگی اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ہوگا، اور اگر کاروبار نہیں کرتا ہے تو واجب نہ ہوگی، البتہ اگر زکوٰۃ سے بچنے کیلئے ایسا کرتا ہے تو سخت خطرناک جرم ہے، ممکن ہے کہ اس کے وبال میں غیر شعوری طور پر سب ہلاک ہو جائے کہ یہ عمل ایک قسم کی نافرمانی کا اور گستاخی کا درجہ ہو سکتا ہے۔

وَأَنشَارِ إِلَيْهِ قَوْلَهُ تَعَالَى: "لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ" (سورہ حجرات: ۲)۔

ہاں! اگر وجوب زکوٰۃ کو ساقط کرنے کی نیت نہ ہو، بلکہ محض تزئین و آرائش کے لئے ہو، جیسا کہ عورتیں رکھتی ہیں یا کسی حادثہ یا اچانک ضرورت پر کام آجانے کے لئے اپنے پاس رکھتے ہوں، تو اس کی گنجائش ہوگی، بالکل یہی حکم اراضی کے خرید و فروخت و کاروبار کرنے کا ہوگا۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

اس میں یہ حکم ہے کہ تھوک یا پھنکر جس طرح بچیں اس کی عام قیمت فروخت کے وقت

جو ہوگی اس کا اعتبار ہوگا، شیئرز و بونڈز کے فروخت کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس سوال کے بقیہ اجزاء کا جواب اوپر گزر چکا۔

### محور ثانی کا حکم

اگر کسی کے پاس محض سونا ہے اور مال تجارت وغیرہ کچھ نہیں تو معیار وجوب زکوٰۃ محض سونے کے نصاب کا ہوگا، اور اگر محض چاندی ہے اور کوئی مال زکوٰۃ کی قسم کا نہیں ہے تو معیار وجوب زکوٰۃ محض چاندی کے نصاب کی قیمت کا ہوگا، اور اگر سونا چاندی دونوں ہیں تو جس طرح ان میں سے کسی کے ساتھ اموال تجارت ملنے سے جس نصاب کی قیمت پہلے آ کر وجوب زکوٰۃ متوجہ ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی حکم ہے اور سونے چاندی کی قیمت میں اگر چہ زمین و آسمان کا فرق ہو جائے یہ حکم نہ بدلے گا، کیونکہ یہ حکم خالق آسمان و زمین ہی کا ہے۔

### مصارف زکوٰۃ

۱- محض مسلم غرباء و مساکین ہیں اور ان میں طالبان علوم دینیہ کو جو مصرف زکوٰۃ ہیں عموماً ترجیح و تقدیم ہوتی ہے، اس لئے کہ ان کو دینے میں دو چند ثواب ہو جاتا ہے اور مہتمم مدرسہ جس طرح زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہوتا ہے اسی طرح مستحقین زکوٰۃ کا بھی وکیل ہوتا ہے، اور مالک کسی جانب کا نہیں ہوتا، اس لئے اس کا کوئی عمل ضابطہ شرع کے خلاف درست نہیں ہوگا۔

۲- بانڈز وغیرہ کی زکوٰۃ کا حکم پہلے گزر چکا ہے، البتہ حکومتیں یا کمپنیاں جو لوگوں سے قرض لیتی ہیں اگر ان سے زبردستی لیتی ہیں تو اس کی حقیقت قرض کی نہیں ہوگی کہ اس پر ملنے والی زیادتی سود ہوگی، بلکہ زیادتی کا حکم پر اوپنٹ فنڈ کے یا انعام وغیرہ کا ہوگا، جس کا لیما اور اپنے جائز مال کی طرح خرچ کرنا جائز ہے، ہاں اگر زبردستی نہ لیں، بلکہ لوگوں کی مرضی و خوشی سے لیں تو

یہ لیما اور اس کے عوض میں زیادہ دینا سود شمار ہوگا اور اس کو ان کے وہاں چھوڑنا جائز نہ رہے گا، بلکہ ان سے لے کر غرباء و مساکین میں صدقہ کر دینا چاہئے۔

### محورثا لث

الف: یہ معاملہ شرعاً ادائیگی زکوٰۃ سے بری ہونے کے لئے کافی نہیں اور محورثا لث (۲-ب) اس کی ساری گفتگو نا تجربہ کاری اور شرعی اصول سے ناواقفیت سے ناشی ہوگی۔ اس کی جائز اور مذکورہ خطرات سے محفوظ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سفراء کو با لمتقطع تنخواہ مقرر کیا جائے، پھر ان کو جس علاقہ میں بغرض وصول چندہ بھیجا جائے اور اس علاقہ کی عام چندہ کا اندازہ کر کے اس طرح کہا جائے کہ آپ تمام وصول کردہ رقم مدرسہ کے خزانہ میں بھیجتے جائیں اور جب آپ سفر پورا کر کے واپس آئیں گے تو آپ کی تمام وصولی اس مذکورہ رقم سے جتنی زائد ہوگی اس کا اتنا فی صد آپ کو بطور انعام دیا جائے گا، اسی طرح مدرسہ کے لئے بیش از بیش رقم وصول کرنے کا شوق پیدا ہو کر خرچ کے اوسط کا زیادہ ہونا اور آمد کے کم ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا، رہ گیا دیگر ملازمین کی تنخواہ تو اولاً اس کو عطیہ کی رقم سے دیا جائے گا اور اگر کم پڑے تو تملیک مستحق کے حیلہ سے دیا جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور ملازمت ضرورت سے زائد شعبوں کی قائم نہ کیا جائے کہ بلاوجہ مدرسہ پر بار اور ان ملازمین وغیرہ کو ”عاملین علیہا“ کے تحت کرنے کی حاجت بھی نہ رہے گی۔

### زکوٰۃ فی سبیل اللہ

اس میں شک نہیں کہ جناب نے اس سلسلہ میں بے انتہا محنت فرمائی ہے کہ تقریباً ہر مکتب فکر کی رائیں مع ان کے دلائل بھی بیان فرما دیا ہے، آپ کی چھان بین ذاتی کاوش ہے۔  
فجزاکم اللہ۔

## اسلام کا نظام معیشت

مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی ☆

نمبر وار جواب سے پہلے چند باتیں جو ضروری ہیں ان کا سمجھ لینا مسائل کے حل کے لئے لازم ہے، اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر ہے ان میں سے ایک اہم رکن زکوٰۃ بھی ہے، اسلام نے زکوٰۃ کا نظام ان لوگوں کے لئے قائم کیا ہے جو اس دنیا میں کمزور، اناج، بے سہارا اور مالی وسائل سے بڑی حد تک محروم ہیں۔

### اسلام کا نظام معیشت

اسلام کا نظام معیشت جبر و استبداد اور ظلم و جور سے پاک ہے، یہ ضرور ہے کہ اسلام پہلے انسانی دلوں پر حکم الحاکمین کا دبدبہ قائم کرتا ہے اس کے احسانات یا دلاتا ہے پھر مرنے کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب کا عقیدہ ذہن نشین کراتا ہے، اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں محتاجوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں سے جو لوگ مجبور ہیں، ان کی امداد کا کتنا بڑا اجر ہے، اور اس سلسلہ میں ترغیب و تہیب کا پہلو اجاگر کرتا ہے تاکہ آدمی کچھ کرے خوش دلی سے کرے اور یہ یقین کرے کہ آخرت میں بدلہ مل کر رہے گا۔

”وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ“ (ذاریات: ۱۹)

”وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ“ (سورہ سحر: ۱۵)

### انسانی ذہن کی اصلاح

انسانی ذہنوں میں یہ بھی راسخ کرتا ہے کہ تمہارے پاس جو مال و دولت ہے وہ سب رب العالمین کا عطیہ ہے اور اس کا خصوصی فضل و کرم ہے، صرف کمانے اور عقل و محنت سے دولت ملتی تو دنیا میں کوئی صحت مند اور ذی عقل غریب نہیں رہتا۔

”وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ“ (منافقون: ۲)

پھر تم کو یہ حکم بھی نہیں دیا جا رہا ہے کہ کل مال غریبوں کی جھولی میں ڈال دو، بلکہ اپنی دولت کا وہ حصہ دو جو تمہارے خرچ سے بچ رہتا ہے اور جتنے کے دینے میں تم کو نظری طور پر جبر نہیں ہونا چاہیے۔

### افراط و تفریط سے گریز

افراط و تفریط سے یہ نظام قطعاً پاک ہے، یہاں اعتدال ہی اعتدال ہے وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ کوئی خواہ مخواہ گداگر بن جائے اور سوال کرتا پھرے اور دولت مندوں کے لئے وبال جان بن جائے۔

”يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ

وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ“ (سورہ بقرہ: ۲۱۵)

اپنے خاص لوگوں کو مقدم رکھو جیسے ماں، باپ، بیوی، بچے، قریبی رشتہ دار، پھر محتاج، مساکین و یتامی اور مسافروں اور مصیبت زدوں پر خرچ کرو۔



### زکوٰۃ کا مقصد

کچھ لوگ دنیا کی ساری ضرورتیں زکوٰۃ سے ہی پوری کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو واضح فرمادیا ہے کہ یہ رقم مال داروں سے لی جائے اور محتاجوں پر خرچ کی جائے، آپ نے حضرت معاذ کو یمن کا معلم بنا کر روانہ فرمایا تو اس وقت خصوصی ہدایات دیں، ان ہدایتوں میں یہ بھی تھا کہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یمن کے مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا:

”فَاعْلَمِهِمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةَ تَأْخُذُ مِنْ أَغْنِيَانِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَيْهِمْ فَقْرَانِهِمْ“ (مشکوٰۃ کتاب الزکاۃ)۔

پھر انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) کو فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان میں جو محتاج ہیں ان کو دیا جائے گا۔

### تملیک مستحق کی شرط

یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ زکوٰۃ کے سلسلہ میں شرط قرار دیتے ہیں کہ یہ رقم ان مستحقین کو دے کر مالک بنا دیا جائے جو محتاج ہوں، مال دار و سرمایہ دار نہ ہوں۔  
 ”ویشترط أن يكون الصرف تملیكا لا إباحة“ (درمختار)۔  
 (شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ مالک بنا کر صرف کی جائے نہ کہ اباحت کے طور پر)۔  
 صدقہ فطر میں ارشاد نبوی ہے:

”زکوٰۃ الفطر طهر الصيام من اللغو والرفث و طعمه للمساكين“  
 (مشکوٰۃ، باب صدقہ فطر)۔

(صدقہ فطر روزوں کی پاکی ہے لغو اور بیہودہ باتوں سے اور غریبوں مسکینوں کے لئے کھانے کا انتظام ہے)۔

## حضرت عمرؓ کا جذبہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”لو استقبلت من امری ما استمد بورت لأخذت فضول أموال الأغنياء  
فقسمتها على الفقراء المهاجرين“ (مکمل ۱۵۸/۶)۔

(جس چیز کا علم بعد میں ہوا اگر میں پہلے جان لیتا تو اغنیاء سے مال کا وہ حصہ لے لیتا جو  
ان کی ضرورت سے فاضل ہے اور مہاجرین محتاجوں میں تقسیم کر دیتا)۔

ان تمام آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور قول صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات  
واجبہ محتاج و نادار مسلمانوں کا حق ہے، اس رقم سے نہ راستہ بنایا جائے گا، نہ مصنفین کی کتابیں  
چھپوائی جائیں گی نہ معلمین کی تنخواہیں دی جائیں گی اور نہ مسجدیں بنائی جائیں گی اور نہ کارخانے  
قائم کئے جائیں گے اور نہ مسلمانوں کے عمومی مصالح پر یہ رقم صرف ہوگی۔

قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہے:

”وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ  
وَأَتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ“ (البقرہ: ۱۷۷)۔

## جس مال پر قبضہ نہ ہو

اس کے بعد اب نمبر وار سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

۱- جو مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، کو ملک میں آچکا ہے، اس کی زکوٰۃ حوالان  
حول کے بعد خریدار پر واجب نہیں ہے۔

اس مال میں قبضہ کرنے سے پہلے زکوٰۃ نہیں ہے جس کو بہ غرض تجارت خرید کیا ہے،

لیکن قبضہ کرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ دے گا، خانیہ میں ہے کہ ایک شخص کے سائمنہ جانور ہیں، ایک دوسرے شخص نے اس کو سائمنہ کے طور پر رکھنے کے لئے ہی خریدا، لیکن اس پر قبضہ نہیں کیا ہے، تا آنکہ اس پر پورا سال گزر گیا، اس کے بعد ان جانوروں پر اس کا قبضہ ہوا، تو خریدنے والے پر گزشتہ سال کی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ قیمت کی وجہ سے بائع کی ضمانت میں تھا (درمختار وردالمختار)۔

### زر ضمانت کی زکوٰۃ

۲- زر ضمانت کا مالک دراصل ضمانت جمع کرنے والا ہے، لہذا اتقاعہ میں زکوٰۃ اسی پر واجب ہونی چاہئے تھی مگر چونکہ یہ روپے والے کے تصرف میں نہیں ہوتا ہے اس لئے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

مال مرہون میں قبضہ کے بعد زکوٰۃ نہیں ہے، یعنی نہ مرتہن کے ذمہ زکوٰۃ ہے کہ وہ اس کی گردن کا مالک نہیں ہے اور نہ رہن رکھنے والے پر مال مرہون کی زکوٰۃ ہے، اس لئے کہ اس مال پر اس کا قبضہ نہیں تھا اور جب راہن مال مرہون کو واپس لے لیا تو وہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں دے گا۔

اس مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کی زکوٰۃ نہ تو ضمانت رکھنے والے پر ہوگی اور نہ اس شخص پر ہوگی جس کے پاس روپے جمع ہیں، البتہ جب وہ رقم مالک کے پاس واپس ہوگی، تو حوالان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (درمختار وردالمختار)۔

۳- اس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، جو مہتمم کے پاس جمع ہے۔

### مال حرام کی زکوٰۃ

مال حرام اگر جمع ہو گیا ہو اور دوسرے مال میں مخلوط نہ ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

مال معصوب میں زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ اس مال میں زکوٰۃ ہے جس کا بیع فاسد کے طور پر مالک بنا ہے، اس لئے کہ اس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، جب تک غیر کے ساتھ مخلوط نہ ہو (رد المحتار)۔

زکوٰۃ نہیں ہے، جیسا کہ اس مال پر زکوٰۃ نہیں جو کل مال خبیث ہو، قنیہ میں ہے اگر کل مال خبیث ہو اور وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس مال کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ سارا مال واجب التصدق ہے کہ محتاج مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے (در مختار رد المحتار)۔  
لیکن اگر اپنے مال میں اس کو اس طرح ملا لیا ہے کہ وہ منفصل نہیں ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”لو خلط السلطان المال المعصوب بما له ملكه فتجب الزكوة فيه ويورث عنه، لأن الخلط استهلاك إذ لم يمكن تمييزه عند أبي حنيفة وقوله أرفق (در مختار) وأما لو خلطه بمعصوب آخر فلا زكوة فيه“ (رد المحتار)۔

### مدیون پر زکوٰۃ

مدیون پر دین کی جو رقم باقی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس کا مالک نہیں ہوتا ہے اور اسے یہ رقم واپس کرنا ہے۔

”لہذا مکاتب پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ اس قرض لینے والے پر ہے جو کسی بندے کا مقرض ہو، اتنے مال میں جتنا اس نے بھی قرض لے رکھا ہے، البتہ جو مال دین سے زیادہ ہوگا، اگر وہ نصاب کو پہنچتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا“ (رد المحتار)۔

### دائن کے قرض کا حکم

باقی جو دائن ہے جس نے قرض دے رکھا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مدیون نے دین

کے ادا کرنے سے انکار کر رکھا ہے اور دائن کے پاس ثبوت شرعی نہیں ہے تو اس پر بھی اس کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

”و دین کان جحدہ المدیون ولا بینة علیہ“ (در مختار)

اور وہ قرض جس کا مدیون منکر ہے اور قرض دینے والے کے پاس اس کا کوئی ثبوت شرعی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

اگر بینہ حاصل ہو گیا اس طرح کہ اس نے کچھ لوگوں کے رو برو اس قرض کا اقرار کر لیا ہے اور بہت سالوں کے بعد مالک کو واپس ملا ہے تو بھی سنین ماضیہ کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہوگی کہ اس میں نمو کی شرط پائی نہیں گئی۔

لیکن پھر اس کے پاس گواہ ہو گئے، اس طرح کہ قرض دار نے کچھ لوگوں کے سامنے قرض کا اقرار کیا، پھر مالک کو چند سالوں کے بعد وہ قرض ملا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ مالک اس کے بڑھانے پر تادیر نہیں رہا، اور اصل اس مال کی زکوٰۃ نہ ہونے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ مال شمار میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور مال شمار وہ ہے جس سے مالک کو فائدہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو (در مختار)۔

لیکن اگر دین ایسے شخص پر ہے جس کو قرض لینے کا اقرار ہے مگر دینا نہیں، مال منول کرتا رہتا ہے، یا وہ تنگ دست ہے یا اس کو دیوالیہ تسلیم کر لیا گیا ہے، یا دین ایسا ہے کہ مدیون اس کا منکر ہے، مگر دائن کے پاس ثبوت شرعی ہے، امام محمد فرماتے ہیں کہ اس دین پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے پاس ثبوت ہے، مگر ضروری نہیں کہ قاضی کے پاس وہ تسلیم بھی کر لیا جائے، لیکن اگر دین کا یہ روپیہ مالک کے پاس آجائے گا تو گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی اس پر واجب ہوگی۔

”اگر دین ایسے شخص پر ہو جو قرض ادا کرتا ہے مگر دینے میں مال منول کرتا ہے یعنی دینا نہیں یا وہ قرض دار تنگ دست ہو یا دیوالیہ ہو جس کے مفلس ہونے کا اشتہار ہو چکا ہو، یا قرض دار

منکر ہو گا اور ان کے پاس دینے کا ثبوت ہو یا قاضی اس قرض کو جانتا ہو، پھر یہ کہ قرض مالک کو وصول ہو جائے تو اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ لازم ہوگی“ (درمختار)۔

### پراویڈنٹ کی زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم رٹائر ہونے کے بعد جب ملازم کے قبضہ میں آجائے گی اور اس کے بعد اس پر پورا سال گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ ملازم پر واجب ہوگی، گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہے، اس وجہ سے کہ وہ اس کے قبضہ سے باہر تھی، وہ اس میں تصرف سے محروم تھا۔

”لا زکوٰۃ فی مال الضمار وهو ما لا يمكن الانتفاع به مع بقاء المالك“ (درمختار)۔

(مال ضماریں زکوٰۃ نہیں ہے اور یہ وہ مال ہے جس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو، ورنہ حالیکہ اس کی ملکیت باقی ہو)۔

### نما کی حقیقت و صورت

نما اور نمو لغت میں نماز اور زیادتی کو کہتے ہیں:

لغت میں نما، زیادتی کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: ”نما المال ينمي نماء وينمو نمواً و انماہ اللہ“، یعنی مال میں زیادتی ہوتی۔

شریعت میں مال نامی وہ مال ہے جو حقیقتاً یا تقدیراً زیادتی کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقی زیادتی تو والد و تناسل کے ذریعہ ہوتی ہے یا مختلف تجارتوں کے ذریعہ، جیسے سوائم جانور اور اموال تجارت اور تقدیری اضافہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس میں خلقت، یعنی قدرتی طور پر اس کو نامی سمجھا جاتا ہے، جیسے سونا چاندی کی قدرت نے ان کو اسی لئے بنایا ہے اور اسی حکم میں وہ نفوذ بھی آتے

ہیں جو سونا چاندی کے قائم مقام بنائے گئے ہوں، جیسے کانغذی سرکاری نوٹ، ڈالر کی صورت میں ہو یا پونڈ کی شکل میں یا گیٹ کے سکوں کے روپ میں ہو۔

مال نامی وہ مال ہے جس کے ذریعہ تجارت کر کے مال میں اضافہ کیا جاسکتا ہو، یا جانور چرا کر نمو حاصل کر سکتا ہو، اس لئے یہ بھی نفع حاصل ہونے کا ایک سبب ہے۔

مگر ثمن مطلق میں خواہ سونا ہو یا چاندی، تجارت کی صلاحیت اس میں اصل خلقت کے اعتبار سے ثابت ہے (بدائع ۱۱/۲)۔

شریعت میں اس کی دو قسمیں ہیں، ایک حقیقی دوسری تقدیری، حقیقی زیادتی تو والد و تناسل اور تجارت کے ذریعہ ہوتی ہے اور تقدیری وہ مال ہے کہ جو اس کے قبضہ و تصرف میں ہو یا اس کے نائب کے، اور زیادہ ہونا ممکن ہو (رد المحتار ۸/۲)۔

مال نامی کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

۱- مال نامی خلقی، جس کو اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر نمو کے لئے پیدا فرمایا ہے، جیسے سونا، چاندی اور ان دونوں سے تیار کی ہوئی چیزیں، زیورات، برتن، زینت کی چیزیں اور اسی طرح ان دونوں سے بنے ہوئے سکے، دراہم و دنانیر، جن کو سکہ نافقہ خلقیہ کہا جاتا ہے۔

۲- مال نامی غیر خلقی، وہ اشیاء جن کو حکومت اور خواص نے مال نامی کے قائم مقام بنایا ہے، جیسے مختلف دھاتوں کے چھوٹے بڑے سکے، کانغذی نوٹ، ڈالر، پونڈ اور پال وغیرہ، ان کو سکہ نافقہ غیر خلقیہ کہتے ہیں۔

۳- مال نامی عملی، مال تجارت اور سوائم ہیں۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں:

”زکوٰۃ کے مال تین قسم کے ہیں، پہلی قسم ائمان مطلقہ ہے اور یہ سونا اور چاندی ہے، دوسری قسم اموال تجارت ہے اور یہ وہ سامان ہیں جو تجارت کے لئے بنائے گئے ہیں اور تیسری قسم سوائم جانور ہیں جو جنگل و میدان میں چل پھر کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں“ (۱۶/۲)۔

اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے:

”الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ أَلِيمٍ“ (توبہ: ۳۴)

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ“ (بقرہ: ۲۶۷)

### حاجات اصلیہ

حاجات اصلیہ جن کی ہر انسان کو لازمی طور پر ضرورت ہوتی ہے، خواہ اپنی ذات کیلئے ہو یا اپنے اہل و عیال کے لئے ہو، فوری ضرورت ہو یا کسی حصہ میں کام آنے والی ہو، جیسے رہنے کے مکانات، پہننے کے کپڑے، آرام و راحت اور دن رات برتنے کے سامان خواہ وہ خانہ داری سے متعلق ہوں، یا آنے جانے والے مہمانوں اور احباب و اقارب کی ضرورت سے متعلق ہوں، اسی طرح اپنی حفاظت کے دوسرے سامان اور حرفت و صنعت اور کاشت کاری کے ضروری سامان و آلات، جاڑے، گرمی اور برسات میں کام آنے والے سامان، اہل علم کے لئے مطالعہ اور حوالہ جات کی کتابیں۔

یہ بات مسلم ہے کہ حاجات اصلیہ میں موجودہ دور کا لحاظ و پاس ضروری ہے، جیسے سفر کے لئے کار، ہوئی جہاز وغیرہ بھی حاجات اصلیہ میں شمار ہوں گے یا اس طرح کے جدید سامان راحت۔

”اور نصاب اس شخص کی حاجات اصلیہ سے فارغ ہو، اس لئے جو مال حاجات اصلیہ میں لگایا ہوا ہے وہ نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اس مال کو ابن ملک نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جس سے آدمی اپنے آپ سے ہلاکت کو دفع کرے، خواہ حقیقت میں، جیسے اس کے کپڑے یا ہلاک تقدیری دفع کرے، جیسے قرض، یعنی مال جو حاجت اصلی میں لگا ہوا ہے وہ حکم میں اس کے



ہے کہ انسان اس سے اپنی ہلاکت کو دفع کرے، حقیقی طور پر، جیسے روزانہ کا خرچ، بود و باش کے مکانات، آلات حرب، وہ کپڑے جن کی اس کو ضرورت ہے تاکہ سردی گرمی میں کام لے اور تقدیری جیسے دوسروں کا قرض، اس لئے کہ قرض دار مجبور ہے کہ وہ اس مال سے ادا کرے جو اس کے قبضہ میں ہے تاکہ وہ اس کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار نہ ہو، اور حاجات جیسے پیشہ وروں کے اوزار اور سامان خانہ داری کے اسباب، سواری کے جانور، اہل علم کی کتابیں، اس لئے کہ جہالت ان کے نزدیک مثل ہلاکت ہے، جب ان کو چند درہم ہوتے ہیں وہ ان کو حوائج ضروریہ میں صرف کرتے ہیں، پس کامل معدوم ہو جاتے ہیں، جیسے قابل استعمال پانی کو پینے کے لئے محفوظ کر لیا جائے تو وہ نہ ہونے کے درجہ میں ہوتے ہیں اور اس وقت تیمم کرنا جائز ہوتا ہے“ (رد المحتار ۷/۲-۸)۔

یہ بات یہاں بتانے کی ہے کہ عورتوں کے زیورات ان کی حاجت اصلیہ کے اندر بہ ظاہر داخل ہیں اور شریعت نے ان کو سونا چاندی کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے زیورات میں زکوٰۃ نہیں ہوتی، جیسا کہ شوائع کا مسلک بھی ہے، مگر احناف کے یہاں عورتوں کے زیورات میں بھی زکوٰۃ ہے، اگر چاندی کا وزن ساڑھے باون تولہ کو پہنچ گیا، یا سونے کے زیورات کا وزن ساڑھے سات تولے ہو گیا ہے، یا دونوں قسم کے زیورات ہوں اور دونوں کی قیمت نصاب تک پہنچتی ہو تو عورتیں صاحب نصاب ہو جائیں گے اور ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا وہ دوسرے اعتبار سے صاحب نصاب ہیں اور ان کے پاس زیورات ہیں کم یا زیادہ تو ان پر ان کی بھی زکوٰۃ ہوگی، اس کے متعلق فقہاء لکھتے ہیں:

”زیورات حاجات اصلیہ سے زیادہ ہیں، اس لئے کہ وہ آرائش اور زیبائش کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، یہ اس کے فاضل ہونے کی دلیل ہے، اور یہ کہ وہ حاجات اصلیہ میں داخل نہیں ہیں“ (بدائع ۱۷/۲)۔

علماء معاشیات نے لکھا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ کا حکم ملکی مفاد کے پیش نظر ضروری تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کی دولت کا بڑا حصہ اس نام پر رعایا کے گھروں میں منجمد ہو کر رہ جاتا، کیونکہ سونا چاندی نقدین کے حکم میں ہیں، اور اصل دولت ملک کی یہی دونوں ہیں، جس ملک کے پاس سونا چاندی کا سرمایہ نہیں ہوتا اس کے سکے کی قیمت عالمی بازار میں بہت کم ہو جاتی ہے ابھی ہمارے ملک نے جب کئی کوئل سونا دوسرے ملک کو بیچ دیا تو دفعۃً یہاں کے سکے کی قیمت نیچے آگئی۔

دوسری وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ زیورات زیبائش و آرائش اور زینت و تخیل میں داخل ہیں، یہ خود حاجات اصلیہ سے زیادہ ہونے کی دلیل ہے، اس کے خلاف کسان کی زمین اور صنعت و حرفت والے کے آلات و مشینیں حاجات اصلیہ میں داخل رکھے گئے ہیں، اسی طرح آلات حرب، گھوڑے اور خدم و حشم بھی حاجات اصلیہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

حسن بصری سے مروی ہے کہ صحابہ کرام زکوٰۃ اس شخص کو دیا کرتے تھے جو دس ہزار درہم کا مالک ہوا کرتا ہے، یعنی اس کے پاس اتنے کے ہتھیار، گھوڑے، بلڈنگ اور خدام ہوا کرتے تھے، اور یہ اس وجہ سے کہ یہ ساری چیزیں حاجات اصلیہ میں داخل سمجھی جاتی تھیں اور ان کا رکھنا لازم ہوا کرتا تھا، اس کے سوا انسان کو کوئی چارہ کار نہ ہوتا تھا (رد المحتار ۲/۸۸)۔

فتاویٰ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ جس شخص کے پاس دکانیں اور مکان ہو جن سے آمدنی آتی ہو، لیکن وہ آمدنی اس کو اور اس کے اہل و عیال کو کافی نہ ہو تو وہ محتاج کے حکم میں ہے اور امام محمد کے نزدیک اس کو زکوٰۃ قبول کرنا درست ہے، البتہ امام ابو یوسف کے یہاں جائز نہیں ہے یا سال بھر کے لئے کافی ہے تو بعضوں نے کہا کہ زکوٰۃ جائز ہے اور بعضوں نے کہا جائز نہیں ہے، جو برائے خرچ ہے وہ نہ ہونے کے درجہ میں ہے اور خود سید الکونین رحمۃ اللہ علیہ اپنی ازواج مطہرات کے لئے سال بھر کے کھانے کا انتظام فرماتے تھے، اگر کسی کے پاس جاڑے کے کپڑے ہوں جس

کی گرمی میں ضرورت نہیں ہوتی ہے تو اس کو بھی زکوٰۃ لیما جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے بہت ساری دکانیں یا کمرے کرایہ پر دینے کے لئے تیار کئے ہیں اور اس سے آمدنی آتی ہے اور یہ دکانیں اور کمرے ہزاروں روپے قیمت رکھتے ہیں تو اس مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، اگر کرایہ کی یہ آمدنی اس کے اور اہل و عیال کے لئے کافی نہیں ہے تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے اور اس کا شمار محتاجوں میں ہوگا۔

یہی حال کاشت کی زمین کا ہے:

”امام محمد سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص زمین والا ہے جس میں وہ کاشت کرتا ہے یا دکان ہے جس کا کرایہ ملتا ہے، یا مکان ہے جس کی تین ہزار آمدنی ہے لیکن وہ اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لئے پورے سال کافی نہیں ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا تو ایسے شخص کو زکوٰۃ لیما حلال ہے، اگر چہ دکان اور کاشت کی زمین کی قیمت ہزاروں روپے کیوں نہ ہو، فتویٰ اسی پر ہے۔“

اس زمانہ میں دولت کی فراوانی ہے اور شادی کے موقع سے لڑکی والے اپنی لڑکی اور اس کے شوہر کو بہت سا سامان دیتے ہیں اگر اس کی قیمت لگائی جائے تو ہزار سے بڑھ کر لاکھ تک پہنچتی ہے تو یہ سامان بھی حاجاتِ اصلیہ میں ہی شمار ہوں گے اور ان پر زکوٰۃ نہ ہوگی، فقہاء نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ایک عورت جو سامان جہیز لے کر اپنے شوہر کے گھر آئی ہے کیا اس کو غنی کہا جائے گا؟ پہلے جو گذرا اس سے ظاہر یہ ہے کہ گھر کے سامان اور بدن کے کپڑے، استعمال کے برتن جن کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں حاجاتِ اصلیہ میں داخل ہیں، ان کی وجہ سے وہ غنی کے حکم میں نہ ہوگی (رد المحتار ۲/۸۸)۔

البتہ سامان کے علاوہ جو زیورات اور دوسرے قیمتی سامان ہوتے ہیں، جن کا مقصد صرف زینت و زیبائش اور آرائش ہے، جب وہ نصاب کو پہنچے گا تو اس کی وجہ سے وہ عورت

صاحب نصاب قمر پائے گی اور جو اس سے زیادہ ہو، جیسے زیورات اور ظروف اور وہ سامان آرائش جن کا مقصد صرف زینت ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائیں تو وہ غنی کے حکم میں ہو جائے گی۔

### دین سے خالی ہونا

جو شخص صاحب نصاب بنتا ہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ذمہ بندوں کا جو دین (قرض) باقی ہے اس کو اس سے وضع کر دیا جائے پھر اگر اس کے بعد بھی وہ صاحب نصاب بنتا ہے تو صحیح ہے، لیکن اگر اس صاحب مال کے ذمہ دوسروں کا اس قدر روپیہ بہ طور قرض باقی ہے کہ اگر اس کو وضع کر دیا جائے تو وہ ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مالک نہیں رہتا ہے تو اس کو صاحب نصاب نہیں کہا جائے گا، مثلاً اس کے پاس حولان حول کے بعد دس ہزار روپے ہیں، مگر وہ نو ہزار کا مقروض ہے، اس کے ذمہ اتنے روپے دوسروں کے باقی ہیں، تو وہ صاحب نصاب قمر نہیں پائے گا۔

”زکوٰۃ کے وجوب کے لئے وہ قرض مانع ہے جو بندوں کا کسی کے ذمہ ہو، جیسے دین بیع کی قیمت اور تلف شدہ چیزوں کا ضمان و تاوان اور زخم لگانے کا بدلہ، خواہ قرض نقد ہو یا مکملی یا موزونی چیزیں ہوں یا کپڑے یا جانور ہوں، وہ جو خلع کے عوض میں آیا ہو یا دم عمد کے صلح میں، وہ فی الحال ہو یا مؤجل ہو، یا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، جیسے بقایا زکوٰۃ، لیکن اگر زکوٰۃ سائمہ جانوروں کی ہے تو وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں“ (ہانگیری ۱/۱۷۳)۔

باقی ایسا دین جس کا تعلق حقوق العباد سے نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ سے ہے ایسا دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے، جیسے نذر کفارہ کی رقم اور حج کی ادائیگی کے لئے رکھے ہوئے روپے۔

ہر وہ قرض جس کا مطالبہ لوگوں کی طرف سے نہ ہو، جیسے اللہ کے دیون، مثلاً نذر اور کفارہ کی رقم، صدقہ فطر اور حج فرض کی ادائیگی باقی ہو، یہ سب زکوٰۃ کے لئے مانع نہیں ہیں، یعنی ان سب کے باوجود اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی (ہانگیری ۱/۱۷۳)۔

یہ تو اس دین سے متعلق گفتگو تھی جو اس شخص کے ذمہ دوسروں کا ہے جو صاحب نصاب بن رہا ہے، اب سوال اس دین کا ہے جو صاحب نصاب کا دوسروں کے ذمہ باقی ہے خود اس شخص کا اگر دوسروں کے ذمہ قرض باقی ہے تو وہ اس قرض کی زکوٰۃ کیسے نکالے گا؟ اور کس صورت میں نکالنا واجب ہے؟ اور کب اس قرض کی زکوٰۃ نکالنا اس کے ذمہ واجب نہیں ہے، پھر یہ کہ قرض جو دوسروں کے ذمہ ہے اس کی زکوٰۃ و قرض کے وصول ہونے پر دے گا یا پہلے، وصول ہونے کے بعد حوالان حول کے بعد دے گا یا گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، یہ ایک مستقل بحث ہے۔

اس طرح کے دین کی فقہاء نے تین قسمیں کی ہیں:

۱۔ دین قوی۔ ۲۔ دین متوسط۔ ۳۔ دین ضعیف۔

دین قوی کی صورت یہ ہے کہ کسی کو اس نے نقد روپیہ یا سونا چاندی قرض دے رکھا ہے یا تجارت کا مال دیا ہے اس کی قیمت باقی ہے اور اس کے پاس اس قرض کا ثبوت ہے، یا لینے والے کو قمار ہے، ایسے قرض کے وصول ہونے پر دیکھا جائے گا کہ اگر وہ بقدر نصاب ہے تو وصول ہونے کے بعد گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہوگا اور اگر تھوڑا وصول ہوا تو اس کے بقدر زکوٰۃ نکالتا رہے گا اور گزرے ہوئے سالوں کی بھی زکوٰۃ دے گا، اگر صاحب نصاب ہے اور اگر یہ قرض بقدر نصاب نہیں ہے بلکہ اس سے کم ہے مگر یہ خود صاحب نصاب ہے، یا اتنا ہے کہ دونوں کو ملا کر صاحب نصاب بنتا ہے تو بھی اس پر زکوٰۃ کا نکالنا واجب ہوگا، فقہاء لکھتے ہیں:

”دین کی تین قسمیں ہیں: ایک دین قوی ہے جو مال تجارت کا اور قرض کا بدل ہوتا ہے، لہذا دین قوی میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب اس پر پورا سال گزر جائے اور جب تک چالیس درہم قبضہ میں نہ آجائیں اس وقت تک وہ مؤخر ہوتا ہے، جب کوئی چالیس درہم پر قابو پالیتا ہے تو اس میں ایک درہم زکوٰۃ نکالنا لازم ہوتا ہے (فتاویٰ تاضی خان علی ہاشم الہندیہ ۳۳ ۵۳)۔“

معلوم ہونا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین طرح کے قرض ہوتے ہیں: ایک دین قوی، دوسرا متوسط اور تیسرا ضعیف، جب نصاب پورا ہو جاتا ہے اور اس پر سال گزر جاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، لیکن فی الفور نہیں بلکہ جب چالیس درہم دین قوی سے قبضہ میں آجائیں پس دین قوی جیسے قرض اور مال تجارت کا بدل، اس میں جب چالیس درہم قبضہ میں آجائے تو ایک درہم زکوٰۃ دینا لازم ہے“ (در مختار)۔

دین کی دوسری قسم دین متوسط ہے، یہ وہ قرض ہے جو نہ تو نقد کی صورت میں دیا گیا ہے، نہ سونا چاندی کی صورت میں اور نہ مال تجارت کی صورت میں، بلکہ ان صورتوں کے علاوہ صورت اختیار کی گئی ہو، مثلاً زمین فروخت کی تھی، اس کی قیمت باقی ہے، گھریلو سامان دیا تھا اس کی رقم باقی ہے یہ دین متوسط ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ بقدر نصاب ہے اور کئی سال بعد اس کی وصولی عمل میں آئی ہے تو یہ رقم جب وصول ہو کر آجائے گی تو اب اس کی زکوٰۃ دینا پڑے گی موجودہ سال کی بھی اور گزشتہ سالوں کی بھی، اگر وہ صاحب نصاب پہلے سے ہے یا اس قدر مال کا مالک ہے کہ وصول کردہ رقم ملا کر وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے تو اس کی بھی زکوٰۃ دے گا، لیکن اگر اس کی یہ حالت نہیں ہے، دار و مدار اسی قرض پر ہے تو جب تک نصاب کے برابر وصول ہو کر نہ آجائے اس وقت تک اس پر اس رقم کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”دین قوی کے علاوہ متوسط میں جب دو سو درہم پر قبضہ ہو جائے یہ دین متوسط ہے، جیسے سائمر کی قیمت اور خدمت کے غلام کی قیمت وغیرہ جو حوائج اصلیہ میں مشغول ہیں، جیسے کھانا، پیما اور دوسرے املاک ارضین، اور لگائے جائیں گے وہ سال بھی جو دین متوسط کے قبضہ سے پہلے گزر چکے ہیں، صحیح روایت میں اور اسی کے مثل وہ مال ہے جو کسی شخص پر دین تھا اور اس کو وراثت میں ملا اور دین متوسط میں روایتیں ہیں، ظاہر الروایت یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اس وقت ادائیگی لازم نہیں ہے، جب تک دو سو درہم قبضہ میں نہ آجائے جب اتنی رقم آجائے گی تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور ابن سناء سے ایک روایت امام صاحب کے واسطے سے

یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ اس وقت تک نہیں ہے جب تک قبضہ نہ ہو جائے اور اس پر ایک پورا سال گزر نہ جائے، اس لئے کہ وہ ابھی مال زکوٰۃ میں داخل ہوا ہے تو وہ ایسا ہے کہ وہ ابتداءً اس کا وارث ہوا ہے“ (رد المحتار ۲/۲۸۸)۔

دین ضعیف وہ ہے کہ نہ نقد رقم قرض دی ہو نہ مال تجارت کا بدل ہو، بلکہ کسی اور وجہ سے کسی کے ذمہ قرض ہو گیا ہو، جیسے شوہر نے خلع بہ عوض مال کیا اور وہ بیوی کے ذمہ ہے یا بیوی کا مہر شوہر کے ذمہ باقی ہے ایسے قرض کا حکم یہ ہے کہ جب اس طرح کا قرض وصول ہو کر قبضہ میں آجائے گا اس وقت سے زکوٰۃ کا مسئلہ شروع ہوگا، گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، وصول ہو جانے کے بعد جب اس پر پورا سال گزر جائے گا اور وہ بقدر نصاب ہوگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

”دین ضعیف میں دو سو درہم قبضہ میں واپس آجائے اور قبضہ کے بعد اس پر سال گزر جائے اور یہ مال کا بدل نہیں ہوتا، جیسے مہر کی رقم جو عورت کی اپنے شوہر پر دین ہوتی ہے یا دیت ہے یا بدل کتابت ہے یا بدل خلع ہے یہ سب دین ضعیف میں داخل ہے، لیکن اگر اس کے پاس پہلے سے کچھ مال ہو تو وہ دین ضعیف سے مل جائے گا“ (در مختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۲۹۹)۔

### طویل الاجل (مدت)

زراعت، تعمیر مکان یا کاروبار کے سلسلہ میں حکومت سے جولا کھوں یا کڑوروں کا قرض لیا جاتا ہے یہ لینے والا اگر صاحب نصاب پہلے سے ہے یعنی خود اس کے پاس اتنی مالیت ہے کہ صاحب نصاب قرار پاتا ہے لیکن اگر اس حکومتی قرض کا حساب کیا جاوے اور اس کو وضع کر دیا جائے تو پھر وہ صاحب نصاب باقی نہیں رہتا ہے، یہ دین (قرض) چونکہ بندے کا ہی ہے، اس لئے اس پر قاعدہ میں اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جب تک اس رقم کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس اس قدر مالیت باقی نہیں رہتی ہے جو اسے صاحب نصاب بناوے، اگر صاحب

نصاب رہتا ہے تو قرض کی رقم مجرا کرنے کے بعد بقیہ کی زکوٰۃ دے گا مختصر یہ کہ پورے قرض کو منہا کیا جائے گا، قاعدہ فقہیہ کا تقاضا یہی ہے۔

نہ مکاتب پر زکوٰۃ ہے اور نہ کسی انسان کے قرض دار پر اس قرض کی زکوٰۃ ہے جو اس کے ذمہ باقی ہے اس کو مجرا کرنے کے بعد اگر نصاب کو وہ پہنچ جائے گا تو وہ اس زائد کی زکوٰۃ ادا کرے گا (رد المحتار ۹/۲۳)۔

### کمپنی

اگر حصص کے ذریعہ تجارتی کمپنی قائم کی گئی ہے اور سیکڑوں یا بیسیوں آدمیوں کی اس میں شرکت ہے تو کمپنی پر حوالان حول کے بعد زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور نہ اس کی مجموعی آمدنی کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ اگر کمپنی میں کوئی مشین لگائی گئی ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ان مشینوں کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہے کہ یہ آلات محترفین میں داخل ہے، اس کے علاوہ جو نقد آمدنی تجارت پر لگی ہوئی ہے وہ ایک شخص کی نہیں ہے لہذا یہ شرکاء کمپنی پر تقسیم ہوگی ان میں سے جو شرکاء صاحب نصاب ہوں گے وہ اپنے پاس کی نامی مالیت اور کمپنی میں لگی ہوئی مالیت دونوں کو ملا کر سالانہ زکوٰۃ ادا کریں گے۔

اگر چاندی دو شخصوں میں مشترک ہو تو اگر ہر ایک کا حصہ مقدار نصاب کو پہنچتا ہے اور ان کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور مقدار نصاب کے برابر نہیں ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں اور شرکت کی حالت میں وہی معتبر ہوتا ہے جو انفرادی طور پر معتبر شمار ہوتا ہے (بدائع ۱۶/۲۳)۔

### ہیرے، جواہرات کی زکوٰۃ

یہ تو طے ہے کہ اگر کوئی ہیرے جواہرات کی تجارت کرتا ہے تو تمام مال تجارت کی طرح اس کی بھی قیمت لگا کر زکوٰۃ دے گا، باقی وہ شخص جو انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری غیر واجبی ٹیکس سے بچنے



کے لئے ہیرے جوہرات لاکھوں روپے کے خرید کر جمع کرے گا تو قاعدہ فقہیہ کے مطابق اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، خواہ وہ کتنی ہی مالیت کی کیوں نہ ہو، اگر نیت اس میں تجارت کی نہیں ہے۔

”موتیوں اور جوہر میں زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ وہ ہزاروں روپے کے برابر کیوں نہ ہو، اس پر سمجھوں کا اتفاق ہے، البتہ اگر یہ چیزیں برائے تجارت ہوں تو پھر زکوٰۃ واجب ہوگی، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ سونا چاندی اور سائنہ جانوروں کے علاوہ جو چیزیں ہیں ان میں زکوٰۃ اس وقت ہے جب تجارت کی نیت پائی جائے بشرطیکہ اور کوئی مانع نہ ہو، جوہر میں لعل یا قوت اور زمر و جیسی چیزیں بھی داخل ہیں، یعنی ان پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے“ (ردالمحتار ۲/۱۸)۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لعل و زمر اور یا قوت کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ سب قیمتی چیزیں ہیں، یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی ہزاروں ایکڑ زمین خرید کر رکھے تو اس زمین کی قیمت میں زکوٰۃ نہیں، پیداوار ہوگی تو اس میں عشر آئے گا ورنہ نہیں، اسی طرح پالتو جانوروں میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، خواہ کتنی ہی جمع کر لئے جائیں یا کپڑے اور دوسرے سامان جمع ہو جائیں اگر وہ تجارت کے نہیں ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورتیں اگر تزئین و آرائش کے لئے جوہرات استعمال کریں گی تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

### اموال تجارت کی زکوٰۃ

تجارت کے وہ سامان جو تاجروں کے قبضہ میں ہوتا ہے اور جس کی وہ خرید و فروخت کرتا ہے یہ بھی مال نامی ہے اور شرعاً اس پر بھی زکوٰۃ ہے کل سامان کی جو دکان اور اسٹاک میں ہے قیمت لگائی جائے اور جو قیمت آئے گی اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرے گا، اب سوال یہ

ہے کہ قیمت کس دن اور وقت کی لگائی جائے گی، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ واجب ہونے کے دن کی قیمت لگائی جائے گی اور صاحبین فرماتے ہیں کہ ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور راجح صاحبین کا قول ہے۔

اس شہر کی لگائی جائے گی جس میں وہ رہتا ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک قیمت کا اعتبار کیا جاتا ہے اس دن کا جس دن واجب ہوا ہے اور صاحبین کے نزدیک ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوتا ہے (المحررات ۲/۲۳۹)۔

دیکھا جائے گا کہ جس شہر میں وہ تجارت کر رہا ہے اس شہر میں ادائیگی کے دن مروجہ اور عام قیمت عند التجار کیا تھی اس کا اعتبار ہوگا، اگر تھوک مال کی تجارت ہے کہ تھوک کی قیمت معتبر ہوگی اور اگر پھٹکر کی تجارت ہے تو اس کی قیمت اسی حساب سے لگائی جائے گی اور اگر اس سے کوئی مال خریدتا ہے تو وہ کیا حساب دیتا ہے۔

باقی جو زمین کا کاروبار کرتا ہے اس طرح کہ خریدتا ہے اور بیچتا ہے رکھتا نہیں ہے، مالک زمین سے ایک پلاٹ خرید لیا اور پھر ضرورت مندوں کے ہاتھ جس کو جس قدر ضرورت ہے قیمت دیتا ہے تو ایسی زمین مال تجارت قرار پائے گی اور جس طرح سامان تجارت کی قیمت لگائی جاتی ہے، اسی طرح اس تجارت والی زمین کی قیمت بھی (جو اس وقت ہے) لگائی جائے گی اور نقد کے ساتھ اس کی قیمت کو مالک زکوٰۃ ادا کرے گا نہ پہلے کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور نہ آئندہ کی متوقع قیمت کا اعتبار ہوگا، بلکہ دیکھا جائے گا، اس وقت اگر کوئی خریدار ہوتا تو وہ کس بھاؤ سے لینا اور مالک زمین کس نرخ سے دیتا۔

### شیر زوالی کمپنی کی زکوٰۃ

چند آدمی مل کر جب کوئی کارخانہ کھولتے ہیں اور خود ان کے پاس پورا سرمایہ نہیں ہوتا ہے تو اس کے حصص متعین کرتے ہیں اور ہر حصہ کی ایک مناسب قیمت زمانہ کے اعتبار سے طے

کر دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ فی حصہ کی قیمت اتنی ہے ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق دس یا بیس حصے تک خرید سکتا ہے اور سال میں جو نفع ہوگا وہ تمام خریدنے والوں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان حصوں کی جو قیمت اس وقت بازار میں ہوگی ہر حصہ والے کو اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی کہ یہ روپے بغرض تجارت لگائے گئے ہیں، مگر شرط ہے کہ وہ صاحب نصاب بنتا ہو۔

”و شرط نية التجارة في العروض إما صريحا ولا بد من مقارنتها بعقد التجارة أو دلالة بأن يشتري عينا لغرض التجارة“ (رد المحتار، زکوٰۃ ۲)۔

البتہ یہ دیکھا جائے گا یا کمپنی سے معلوم کیا جائے گا کہ کمپنی کی جو مشینیں لگائی گئی ہیں یا مکان تعمیر ہوئے ہیں یا فرنیچر بنائے گئے ہیں ان میں ہر حصہ سے کتنی فیصد رقم لگی ہے اتنی رقم فی صد زکوٰۃ سے بری ہو سکتی ہے کہ آلات التخریفین پر زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح مکان اور فرنیچر پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

باقی جو روپے سامان تجارت پر لگے ہوئے ہیں ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی، حصے خریدنے والے کو چونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کیا سامان ہے کیا نہیں ہے، قیمت لگانے کی بات بہت دشوار ہے تو اپنا سرمایہ جو اس نے لگایا ہے یا خرید ہے اس کے مطابق زکوٰۃ دیتا رہے گا اور اگر کمپنی حساب دیتی رہتی ہے کہ آپ کی اتنی رقم ہے تو اس حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔

### بونڈس پر زکوٰۃ

بونڈس کی جو صورت سول میں لکھی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس میں خریدنے پر دباؤ نہیں ہوتا ہے بلکہ حکومت یا کمپنی اعلان کرتی ہے یا درخواست کرتی ہے اور لوگ سود کی لالچ میں یہ بونڈس خریدتے ہیں بغرض حصول سود خریدنا جائز نہ ہوگا کہ یہ:

”أَحْسَلُ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (البقرۃ) کے اندر داخل ہے اور اگر بونڈ خرید لیا ہے

خواہ پانچ سال کے لئے ہو یا دس سال کے لئے ہو، چونکہ اس کی رقم کی واپسی کا خریدار کو یقین ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس رقم کی زکوٰۃ وہ ہر سال ادا کرتا رہے یا پھر بعد وصول گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ نکالے اگر وہ بقدر نصاب ہے یا یہ شخص صاحب نصاب ہے۔

”ولو كان الدين على مقر الخ واصل إلى ملكه لزم زيادة ما مضى“ (در

مختار مع شامی ۱۲/۲)

(اگر قرض ایسے شخص پر ہے جس کو قرض کا اقرار ہو تو جب وہ قرض واپس آجائے گا تو گزشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی)۔

کیونکہ یہ قرض دین قوی میں داخل ہے جس کی تفصیل پہلے بھی گزر چکی ہے اور جو اضافہ ملے گا اس کا غریبوں پر صدقہ کرنا ضروری ہوگا کہ وہ مال خبیث میں داخل ہے۔

البتہ کبھی حکومت بوند خریدنے پر مجبور کرتی ہے جیسا کہ جنگ کے زمانہ میں ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ قرض کی صورت نہیں ہوگی، یہ ظلم ہوگا اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

جو مال کسی کا ظلماً لے لیا جائے اور پھر سالہا سال کے بعد واپس ملے تو اس میں زکوٰۃ گزشتہ سالوں کی نہیں ہے، اس لئے کہ نمو کا موقع نہیں رہا اور اس میں بنیادی چیز حضرت علیؑ والی حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مال ضماریں زکوٰۃ نہیں ہے، مال ضماریں وہ مال ہے کہ ملک کے باوجود فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو (در مختار علی ہاشم رد المحتار ۱۲/۲)۔

اگر حکومت اس پر کچھ اضافہ کرے تو اس کا استعمال روپے کے مالک کے لئے جائز ہوگا۔

### زکوٰۃ کا نصاب شرعی

نصاب کا مدار سونا، چاندی پر رکھا گیا ہے، اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے تو اس کا نصاب شریعت نے بیس مثقال متعین کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس بیس مثقال سونا ہے تو وہ آدھا

مشقال حولان حول کے بعد زکوٰۃ میں نکالے گا۔

”سونا جو بیس مشقال سے کم ہو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن جب بیس مشقال ہوگا تو اس میں آدھا مشقال زکوٰۃ ہوگی“ (ہدایہ ۱/ ۱۱۷)

اور اگر صرف چاندی ہے تو اس کا نصاب دو سو درہم ہے۔

چاندی جو دو سو درہم سے کم ہے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے، پس جب کسی کے پاس دو سو درہم ہو اور اس پر پورا سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ پانچ درہم ہوگی، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ کو لکھا تھا کہ زکوٰۃ ہر دو سو درہم چاندی میں پانچ درہم وصول کرو اور ہر بیس مشقال سونا میں آدھا مشقال وصول کرو“ (ہدایہ ۱/ ۱۷۶، باب زکوٰۃ الاسوال)۔

دو سو درہم کا وزن تولے سے ساڑھے باون تولہ ہوتا ہے اور بیس مشقال برابر ساڑھے سات تولے کے ہوتا ہے۔

باقی سامان تجارت تو اس کی سونے یا چاندی سے قیمت لگائی جائے گی، جب اس کی ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ مالیت ہوگی، تو وہ صاحب نصاب قرار پائے گا، چاندی سے قیمت لگانا جائز ہے، اسی طرح سونے سے بھی، اس زمانہ میں چاندی سے قیمت لگانے میں غریبوں کا نفع ہے۔

”الزکوٰۃ واجبة فی عروض التجارة کائنة ما كانت إذا بلغت قیمتھا نصابا من الورق أو الذهب لقوله علیه السلام فیہا یقومہا فیؤدی من کل مائتی درہم خمسة درہم ولأنہا معدة للاستنماء“ (ہدایہ ۱/ ۱۷۷)۔

## نصاب کس سے مقرر کیا جائے

لیکن آج جب کہ سونا، چاندی کی قیمت میں کوئی توازن نہیں ہے تو سوال ہوگا کہ ایسے زمانہ میں قیمت چاندی سے لگے گی یا سونے سے، اس بات میں فقہاء نے فیصلہ کیا ہے کہ جس سے محتاجوں کا زیادہ فائدہ ہو، اس سے قیمت لگائی جائے گی۔

”ثم قال: یقومها بما هو أنفع للمساكين احتیاطاً لحق الفقراء الخ وتفسیر الألف أن یقومها بما یبلغ نصاباً“ (ہدایہ ۱/۱۷۸)۔

لہذا آج کل قیمت چاندی سے لگانے میں فقیروں کا فائدہ ہے اسی طرح اگر دونوں چیزیں کسی کے پاس ہوں، سونا بھی اور چاندی بھی تو دونوں کو ملا کر نصاب بنایا جائے گا (ہدایہ ۱/۱۷۸)۔

مفتی بقول امام صاحب کا ہے آج کل فتویٰ اسی پر دیا جاتا ہے اور غریبوں کا فائدہ بھی اسی میں ہے۔

## طلبہ غیر مستطیع

غیر مستطیع طلبہ پر جو خرچ آتا ہے وہ آج کل ارباب مدرسہ مدزکوۃ سے ہی پورا کرتے ہیں، کھانا بھی دیتے ہیں اور پھر پوشاک یا اس کی قیمت دیتے ہیں، اسی طرح لٹاف دیتے ہیں اور پاپوش یا اس کی قیمت دیتے ہیں، لیکن اگر مدرسہ ان سے تعلیمی فیس، ہوسٹل فیس کے نام پر بھی کوئی رقم لینا چاہے یا لینا ہو تو یہ رقم بھی طلبہ کو مدزکوۃ سے دینا درست ہے کہ مدرسہ سے خود لے کر اس فنڈ میں جمع کرادے، اس میں بھی شرعاً مضائقہ نہیں ہے کہ مجموعی طور پر غیر مستطیع طلبہ پر جتنا خرچ آتا ہے اتنی رقم مدرسہ مدزکوۃ سے ان کے حوالہ کر دے اور ان سے کہہ دے کہ وہ مدرسہ کے خزانہ میں اپنی طرف سے جمع کر دیں خواہ نقد کی صورت میں دے، چیک کی صورت میں دینا زیادہ بہتر ہے

تا کہ کوئی دوسرا سوال پیدا نہ ہو اور یہ ساری رقم مذکوٰۃ سے دی جائے گی، فقہاء کی تملیک والی شرط اس طرح سے پوری ہو جائے گی۔

”ویشترط أن يكون المصروف تملیكا لا إباحة“ (درمنازع ۱۳۱ ص ۲)۔

### مہتمم مدرسہ

مہتمم مدرسہ کو زکوٰۃ دہندہ کا بھی وکیل مانا گیا ہے اور طلبہ مدرسہ کا بھی، دونوں حیثیت سے علماء نے دی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مہتمم مال زکوٰۃ پر قبضہ کر لیتا ہے تو ضمناً طلبہ کا قبضہ بھی ہو جاتا ہے، مگر زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک طلبہ کو اس کا مالک نہ بنا دیا جائے یا وہ طلبہ کی ذات پر خرچ نہ ہو جائے، علماء محققین اسی کے قائل ہیں (دیکھئے معارف القرآن اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند مل و مکمل)۔

### کمیشن پر چندہ

حدیث تفسیر طحان کے پیش نظر کمیشن پر چندہ کو ناجائز کہا جاتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اجرت مجہول ہوتی ہے، اسی وجہ سے مدارس میں ہر علاقہ کی کارکردگی سفراء کے لئے سالانہ متعین کر دی جاتی ہے کہ سال میں اتنا چندہ کر کے لانا ہے، ساتھ ہی یہ بھی ترغیب دی جاتی ہے کہ اگر آپ متعین مقدار سے جس قدر زیادہ لائیں گے اس پر آپ کو چھ فیصد کے حساب سے انعام دیا جائے گا، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سفیر اپنے علاقہ میں محنت کرتے ہیں، پہلے متعین مقدار پوری کرتے ہیں، پھر زیادہ کے لئے تگ و دو کرتے ہیں اور انعام حاصل کرتے ہیں۔

سفراء اور محصلین جو زکوٰۃ، فطرہ اور قیمت چرم قربانی کے ساتھ عطیات بھی وصول کرتے ہیں، ان کو عالمین میں شمار کیا جائے یا نہیں؟ اور ان کو مذکوٰۃ سے تنخواہ دی جائے یا نہیں؟ اسی طرح جو عملہ حساب و کتاب کا اندراج کرتا ہے ان کو بھی اس مد سے مشاہرہ دینا درست ہوگا یا

---

نہیں؟ قابل غور ہے ہمارے علماء اس کو جائز نہیں کہتے ہیں۔  
یہ طے ہے کہ یہ سفراء اور مصلحین امیر المؤمنین یا ان کے نائبین کی طرف سے مقرر نہیں  
ہوتے ہیں اور نہ بیت المال میں یہ رقم جمع ہوتی ہے۔



## اموال زکوٰۃ سے متعلق مسائل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ☆

سامان تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ

۱- ایسا سامان جو خرید کیا جا چکا ہو، لیکن ابھی قبضہ میں نہیں آیا ہو، بعض فقہاء کے نزدیک اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اکثر مشائخ عراق نے اس میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے، فتاویٰ تانا رخانہ میں ہے:

”خرید کی ہوئی شے جس پر ابھی قبضہ نہیں کیا ہو، اکثر مشائخ عراق نے نقل کیا ہے کہ وہ قبضہ سے پہلے تمام ہی فقہاء حنفیہ کے نزدیک نصاب نہیں ہوگا، دوسرے مشائخ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو ثمن کے سلسلہ میں مذکور ہوا، بعض فقہاء کہتے ہیں کہ بیع قبضہ سے پہلے بھی بالاتفاق نصاب ہے“ (۲۲۲ صفحہ ۳۰۳)۔

علامہ حصکھی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ تجارت کے لئے خرید کردہ سامان پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ نہیں، ”ولا فیما اشتراہ تجارۃ قبل قبضہ“ (در مختار علی ہامش الرد ۷۴)، اس لئے میری رائے میں ایسے مال تجارت کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں کہ خریدے ہوئے مال پر کو اس کی ملکیت قائم ہے، لیکن قبضہ ثابت نہیں، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ تینوں اس بات پر

☆ ناظم امجد العالی الاسلامی حیدرآباد، و جنرل سکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

متفق ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملک مطلق شرط ہے اور ملک مطلق کے لئے ملک رقبہ اور قبضہ دونوں ضروری ہے:

”ومنها المملک المطلق وهو أن يكون ملكا له رقبة ويدا وهذا قول أصحابنا الثلاثة“ (بدائع الصنائع ۹/۲۳۰)۔

البتہ فقہاء شوافع کے نزدیک چونکہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے قبضہ ضروری نہیں (حوالہ سابق)، اس لئے اس صورت میں ان کے یہاں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### پیشگی کرایہ اور ڈپازٹ کی زکوٰۃ

کرایہ کے مد میں جو رقم پیشگی طور پر ادا کی جائے وہ ظاہر ہے کہ اجرت معجلہ ہے اور اس پر مالک مکان کی ملکیت قائم ہوگی، اس لئے اس کی زکوٰۃ مالک مکان کو ادا کرنی چاہئے، ابن ہمام لکھتے ہیں:

”طویل اجارہ (جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں اور ہر ماہ کے شروع میں تین دنوں کے لئے خیار شرط لیتے ہیں)، میں چند سال کی اجرت پیشگی ادا کر دی جائے تو اس کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی، اس لئے کہ قبضہ کر کے وہ اس کا مالک ہو گیا ہے۔“

امام نووی کا بیان ہے:

”اگر آجر کے پاس کرایہ کا مکان ہو اور کرایہ دار نے ابھی مکان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو، اس کرایہ پر سال بھی گزر گیا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو گیا، اس لئے کہ آجر کو اس پر ملکیت تامہ حاصل ہے“ (شرح مہذب ۲/۲۳۰)۔

لیکن جو مسئلہ لائق بحث و فکر ہے وہ یہ ہے کہ جو رقم مالک کے پاس بطور ضمانت اور ڈپازٹ کے رکھا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟ بعض فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مال مرہون

پر قیاس کرتے ہوئے اس کی زکوٰۃ دونوں میں سے کسی پر واجب نہ ہو کہ مالک مکان کی اس پر ملکیت نہیں ہے اور کرایہ دار کا قبضہ نہیں ہے، چنانچہ شامی میں ہے:

”مال مرہون میں زکوٰۃ واجب نہیں، نہ مرہون پر کہ وہ اس کا مالک نہیں، نہ راہن پر کہ اس کو قبضہ حاصل نہیں“ (رد المحتار ۶/۲۴۱)۔

بیع بالوفاء میں علامہ شامی کی رائے یہ ہے کہ خریدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ قیمت مکان کے عنوان سے جو رقم اس نے بائع کو سپرد کی ہے وہ اصل میں قرض ہے اور مکان کی حیثیت بیع کی نہیں، بلکہ مال مرہون کی ہے۔

لیکن اسی بیع و فاء کے مسئلہ میں اکثر مشائخ کی رائے ہے کہ زکوٰۃ بائع کے ذمہ ہوگی نہ کہ خریدار کے (حوالہ سابق)، جب بیع و فاء میں بائع کو مالک شمار کیا گیا ہے تو زیر بحث مسئلہ میں بھی مالک مکان کو اس رقم کا مالک سمجھا جانا چاہئے اور اسی پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔

راقم سطور کے نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس رقم کو مال مرہون قرار دینا تو مشکل ہی ہے، اس لئے کہ مال مرہون امانات کے قبیل سے ہے اور امانات میں تصرف جائز نہیں اور اس پیشگی رقم میں مالکان مکان تصرف کرتے ہیں، لہذا اس کی حیثیت طویل الاجل دین کی ہے، دین کے بارے میں کو فقہاء نے زکوٰۃ کے ذیل میں لکھا ہے کہ وہ مدیون کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، لیکن یہ رائے محض حکماً ہے، حقیقتاً تو دین مدیون کی ملکیت میں آجاتا ہے، گویا مالک مکان اس ڈپازٹ کی رقم کا مالک ہو گیا، اب مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ یہ دین اتنی مقدار مال میں زکوٰۃ کے لئے مانع ہو گا یا نہیں؟ تو راقم سطور کا خیال ہے کہ جیسے دین مہر کو فقہاء نے موجودہ عرف کی بناء پر وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع نہیں مانا ہے، اسی طرح اس دین کو بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع نہیں ہونا چاہئے اور دوسرے مال کے ساتھ مل کر اس پر زکوٰۃ واجب قرار دی جانی چاہئے، البتہ جس سال وہ اس رقم کو واپس کرے گا، اس سال کے مال میں سے اتنی مقدار پر

زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، زکوٰۃ کے سلسلہ میں شریعت کا عمومی مزاج بھی اس کے حق میں ہے، صورت حال یہ ہے کہ مالک مکان اس مال میں نفع خیز تصرف کرتا ہے اور اپنی معاشی حیثیت میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور اول تو اس رقم کی واپسی کے مواقع کم پیدا ہوتے ہیں، لیکن اگر ایسے مواقع پیدا ہوئے تو مالک مکان کے لئے یہ بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ کسی نئے کرایہ دار سے اس سے زیادہ ڈپازٹ کی رقم حاصل کر کے پہلے کرایہ دار کا قرض ادا کر دے، ان حالات میں اس طرح کے مسائل میں محض فقہی جزئیات پر قناعت کر کے کوئی رائے قائم کرنا غالباً صحیح نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہوگا کہ ان مسائل میں شریعت کے اصول قواد اور اس کے مجموعی مزاج و مذاق پیش نظر رکھا جائے، شریعت میں اموال زکوٰۃ میں زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ مال نامی ہے یا نہیں؟ مال نامی سے مراد ایسا مال ہے جس میں افزائش و نمو کی جاسکے، غیر مقبوض مال پر اسی لئے زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاتی کہ مالک اس سے نفع اٹھانے سے قاصر ہوتا ہے۔

اب غور کیا جائے کہ صورت زیر بحث میں کرایہ دار عملاً اس سے یہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، جبکہ مالک مکان افزائش معاش میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر اوقات اسی مقصد سے ڈپازٹ کی رقم حاصل کرتا ہے۔

ان حالات میں غرباء کو ان کے حق سے محروم رکھنا اور اس رقم سے ہر طرح کا معاشی فائدہ اٹھانے کے باوجود اس کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینا شریعت کی رحمت عامہ اور اس کے مزاج و مذاق سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔

مدارس اور اداروں کی املاک کا حکم

جس مال کا کوئی متعین مالک نہ ہو، بلکہ مدارس اور ادارے اس کے مالک ہوں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ملک العلماء کا سانی کا بیان ہے:

”وقف کے مویشی اور گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب نہیں کہ وہ اس کا مالک نہیں، کیونکہ زکوٰۃ میں مالک بنایا جاتا ہے اور جس چیز کا خود ہی مالک نہ ہو، اس میں دوسرے کو مالک بنانے کا تصور نہیں کیا جاتا“ (بدائع الصنائع ۹/۲)۔

### مال حرام پر زکوٰۃ کا حکم

مال حرام کے سلسلہ میں اصل حکم تو یہ ہے کہ اگر اصحاب مال تک رسائی ممکن ہو تو ان کو واپس کر دیا جائے، یہ ممکن نہ ہو تو کل کا کل فقراء پر خرچ کر دیا جائے اور صدقہ کی نیت بھی نہ کی جائے کہ آپ ﷺ نے مال حرام کو صدقہ کا محل قرار نہیں دیا ہے: ”لا صدقة فی غلول“ (ترمذی) مال حرام کو صدقہ نہ کیا ہو، لیکن وہ اس کی حلال کمائی سے ممتاز و مشخص ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں کہ زکوٰۃ تو اس مال میں ہے جس کا وہ مالک ہو اور یہ شخص اس کا مالک ہی نہیں، لیکن اگر یہ حرام مال، حلال کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گیا کہ حساب و کتاب محفوظ نہیں رہا، حتیٰ کہ تمیز ممکن نہیں رہی تو یہ گویا اس مال کا ”اتہلاک“ ہے، اتہلاک کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ اس مال کا ضامن قرار پاتا ہے، اس لئے اس مال پر اب اس کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے اور جب وہ اس مال کا مالک ہو گیا تو ظاہر ہے اب اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات ملاحظہ ہوں:

”اگر سلطان نے مال مغصوب کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیا، وہ اس کا مالک ہو جائے گا، اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور وراثت جاری ہوگی کیونکہ اس طرح مخلوط کر دینا کہ تمیز باقی رہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس مال کو ہلاک کر دینا ہے (درمختار علی المراد ۲۵/۲)۔

کیونکہ اپنے درہم کو دوسرے درہم کے ساتھ مخلوط کر دینا ہمارے نزدیک اتہلاک ہے، صاحبیسی کے قول پر چونکہ وہ ضامن نہیں ہوتا اس لئے ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتی“ (رد المحتار ۵/۲)۔

شامی ہی نے تہستانی کے حوالہ سے لکھا ہے:

”مال مغصوب میں اور ایسے مال میں کہ بیع فاسد کے ذریعہ اس کا مالک ہو، زکوٰۃ واجب نہیں، مال مغصوب سے مراد وہ مال ہے جس کو دوسرے مال کے ساتھ مخلوط نہ کیا گیا ہو کہ وہ اس کی ملکیت ہی میں نہیں ہے“ (رد المحتار ۵/۲۴۰)۔

پس رشوت و بینک انٹرسٹ کا اگر حساب محفوظ نہ ہو اور تمیز دشوار ہو جائے تو اب اس کو شامل کر کے پورے مال کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### دیون کی زکوٰۃ

حنفیہ کے یہاں دیون کی نوعیت کے اعتبار سے تین قسمیں کی گئی ہیں: ایک صورت ایسے دین کی ہے جو کسی مال کے عوض میں واجب نہیں ہوتا، جیسے مہر وغیرہ، دین کی یہ صورت اس وقت زیر بحث نہیں ہے، مالی عوض کے طور پر واجب ہونے والے دیون کی دو قسمیں ہیں: ایک سامان تجارت کی قیمت اور اسی حکم میں قرض بھی ہے، اس کو دین قوی کہتے ہیں، اس مال کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ مال ضمان کے زمرہ میں نہ آئے، البتہ اس کی زکوٰۃ مال پر قبضہ کے بعد واجب ہوگی اور گزرے ہوئے دنوں کی بھی دینی ہوگی۔

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت کے بدلے واجب ہو، جیسے سامان تجارت، پارچہ جات غلام یا مال تجارت کی کمائی، اس میں زکوٰۃ واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں (بدائع الصنائع ۱۰/۲ نیز ملاحظہ ہو: اوسط ۱۹۵/۲، رد المحتار ۳/۳۵)۔

علامہ ابن ہمام نے سامان تجارت کے ساتھ ”بدل قرض“ کا بھی صراحتاً ذکر کیا ہے (فتح القدیر ۱۲۳/۲)، اصل میں سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے، اس لئے زکوٰۃ واجب قرض اردی جاتی ہے۔

دوسری صورت ان دیون کی ہے جو مال ہی کے عوض میں ہو، لیکن سامان تجارت کی قیمت یا قرض نہ ہو، جیسے استعمالی کپڑے، رہائشی مکان وغیرہ کی قیمت، یہ دین فقہاء کے یہاں ”دین وسط“ سے موسوم ہے، دائن کو گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہے، لیکن دین پر قبضہ کے بعد اس میں اور دین قوی کے حکم میں مفتی بقول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کے ہاں صرف اس قدر فرق کیا گیا ہے کہ دین قوی میں نصاب کے خمس حصہ پر قبضہ ہو جائے تب ہی زکوٰۃ ادا کر دینی ہے اور دین وسط میں ایک پورے نصاب کے مقدار رقم حاصل ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، صاحبین کے یہاں جوں جوں رقم ملتی جائے اس کی زکوٰۃ ادا کرتا جائے، مقدار کی قید نہیں، البتہ کاسائی کے بقول امام ابوحنیفہؒ کی صحیح تر روایت یہ ہے کہ دین وسط میں بھی گزشتہ دنوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (بدائع ۱۰/۲)، تاہم اکثر کتب میں امام صاحب کی وہی رائے نقل کی گئی ہے، جو پہلے مذکور ہوئی، ظاہر ہے کہ صاحبین کی رائے میں احتیاط بھی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے سہولت بھی۔

اس طرح دین کی ان ہر دو صورتوں میں دائن ہی پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے۔

البتہ دین کے متوقع الحصول ہونے اور نہ ہونے کا بھی احکام پر اثر پڑتا ہے، حنفیہ کے نزدیک جن دیون کی وصولی متوقع نہ ہو، اگر اتفاق سے وصول ہو جائیں تو ان کے گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ بقول صاحب ہدایہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ مال ضمار میں زکوٰۃ نہیں ہے (فتح القدیر ۲/۱۲۲-۱۲۳)۔ ابن ہمام نے حسن بصریؒ اور عمر بن عبد العزیزؒ سے بھی ایسے سوال پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا نقل کیا ہے جن کی وصولی کی امید اٹھ چکی ہو۔

ضمار کی مختلف صورتوں کے ذیل میں فقہاء نے دین قابل وصول اور ناقابل وصول کی صورتیں بھی واضح کی ہیں، چنانچہ ایسا مقروض جو قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کو قرض کا اقرار بھی ہو، اس کے ذمہ واجب الاداء دین کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اگر وہ تنگ دست ہو

اور فی الحال اس سے قرض کی واپسی کی امید نہ ہو پھر بھی قول مشہور کے مطابق اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ لیکن حسن بن زیاد کی رائے ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ دائن اس مال سے نفع نہیں اٹھا پا رہا ہے۔ ”لیس نصاباً؛ لأنه لا یستفیع به“ (فتح القدیر ۲/۱۲۳) نیز اگر مقروض ایسا دیوالیہ ہے کہ عدالت نے اس کو مفلس قرار دے دیا ہے تو ایسی صورت میں بھی امام محمدؒ کے نزدیک اس دین پر دائن کو زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں چونکہ کسی شخص کے دیوالیہ و مفلس ہونے کی بابت عدالت کا فیصلہ بے اثر ہوتا ہے، اس لئے دین پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے (بہاریہ) ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کہ اسلامی عدالت کا نظام مفقود ہے اور ہے تو اس کا دائرہ اثر محدود ہے کسی شخص کے عملاً دیوالیہ ہو جانے پر ہی اس کے مفلس قرار پانے کی بنیاد ہے، کو فقہاء کے یہاں یہ صراحت موجود ہے کہ عدالت سے اس کا فیصلہ نہ ہو تو امام محمدؒ کے یہاں بھی اس دین کی زکوٰۃ واجب ہوگی (بدایع الصنائع)، مگر ظاہر ہے کہ یہ بات دارالاسلام کے حالات کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے۔

غور کیا جائے تو ان صورتوں میں امام محمدؒ اور حسن بن زیاد کی رائیں شریعت کے مجموعی مزاج سے قریب ہیں، نہ اس لئے کہ زکوٰۃ واجب ہونے میں اصل یہ ہے کہ مال نامی اور فرائض پذیر ہو، اور دیون چونکہ مدیون کے پاس رہنے کی وجہ سے دائن کے حق میں منجملہ اور غیر نامی ہے اس لئے قیاس تو یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہی نہ ہو، چنانچہ مال ضامن کو دراصل اسی وجہ سے ہمارے یہاں زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، بقول کاسانی:

”اس لئے کہ مال جب مالک کے حق میں ممکن الانتفاع نہ رہا تو اس کی وجہ سے مالک غنی نہیں ہو سکتا“۔

البتہ فقراء کے حقوق اور نفع کی رعایت کرتے ہوئے اسے حکماً نامی تسلیم کیا گیا ہے، تب بھی ان مذکورہ صورتوں میں کہ دین کی وصولی کا امکان کم ہوتا ہے، دائن کے حق میں اس مال کو



غیر نامی قرا دیا جانا چاہئے۔

اسی طرح مدیون دین سے انکاری ہو، لیکن دائن کے پاس ثبوت فراہم ہو، ایسی صورت میں بھی قول مشہور یہی ہے کہ دائن پر اس دین کی زکوٰۃ واجب ہوگی (بدایہ)، لیکن عدالت کی پیروی میں جو سرگرائی ہے، غالباً فقہاء متاخرین کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا، چنانچہ انہوں نے اس صورت میں بھی دائن کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرا دیا ہے، کیونکہ گواہوں کو شہادت کے لئے تیار کرنا، پھر قاضی سے انصاف کی توقع مشکل ہے اور عدالت میں حاضری کی رسوائی ان سب سے سوا ہے (ملاحظہ ہو: عنایہ علی ہاشم الفتح وفتح القدير ۲/۱۲۳)۔

اگر مدیون انکاری ہو اور ثبوت فراہم نہ ہو، تو اب حنفیہ متفق ہیں کہ اس دین پر زکوٰۃ نہیں، آئندہ اگر خلاف توقع دین وصول بھی ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ نہیں (بدایع الصنائع ۲/۹۲)، بہر حال یہ ہے کہ وہ دین جو ضما کر کے درجہ میں ہو، اس پر زکوٰۃ نہیں اور ضما کی حقیقت کا ساقی کے الفاظ میں یوں ہے:

وہ مال جس پر ملکیت قائم رہنے کے باوجود اس سے نفع نہیں اٹھایا جاسکتا“

(بدایع ۲/۹۲)۔

ایسا شخص جو دین کی ادائیگی میں مال منول سے کام لیتا ہو، فقہاء حنفیہ کی متداول تحریروں میں صریحاً غالباً اس کا ذکر نہیں، فقہاء شوافع نے ایسے دین کو غصب کردہ مال کے حکم میں رکھا ہے، امام شافعیؒ کے قول قدیم کے مطابق ان کی زکوٰۃ دائن پر واجب نہیں، قول جدید کے مطابق واجب ہے، نوویؒ کا بیان ہے:

”اگر دین کی وصولی معذرت ہو جائے یا مدیون کی تنگ دستی یا اس کے انکار اور گواہوں کے عدم ثبوت یا مال منول یا مدیون کی عدم موجودگی کی وجہ سے تو وہ مال مغصوب کے حکم میں ہے۔“

اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے بارے میں مختلف قول ہیں، صحیح یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب

ہوگی (شرح مہذب، ۲۱/۶)۔

در اصل فقہاء شوافع کے یہاں عمومی طور پر دیون میں زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے، اور دیون کے لئے بھی دین کو مانع زکوٰۃ نہیں مانا گیا ہے، صاحب ”ہدایہ“ کے حسب روایت مال ضامن میں بھی ان کے ہاں زکوٰۃ واجب ہے، حنفیہ کا عمومی نقطہ نظر ان اموال کے متعلق جو مالک کے لئے ناقابل انتفاع ہو، یہ ہے کہ ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر دین زکوٰۃ کا سال گزرنے تک بھی وصول نہ ہو پائے اور اس کی وجہ باوجود مطالبہ و تقاضہ کے محض مدیون کی پہلو تہی ہو، تو دائن پر اس سال اس مال کی زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں ”فتاویٰ تانا خانہ“ کے ایک جزئیہ سے بھی روشنی پرتی ہے:

”ایک شخص کا والیان حکومت میں سے کسی پر دین ہو، اس کو دین کا اتر بھی ہو، لیکن دین ادا نہ کرنا ہو، نہ تعدی کرنا ہو، فقہاء کہتے ہیں کہ بارگاہ خلیفہ میں اس سے مطالبہ کرے اگر اب بھی دین وصول نہ ہو تو جس سال دین وصول نہ ہو پائے اس سال کی زکوٰۃ اس شخص پر واجب نہ ہوگی“ (۲۲/۲، ۳۰۳)۔

پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے کاٹ لیا جاتا ہے، اجرت ہے اور اس پر جو اضافی رقم ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے وہ انعام ہو یا اجرت، ملازم ابھی اس کا مالک نہیں، اس لئے اس پر گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، بحث صرف فنڈ کے اس حصہ سے ہے جو ملازمت کے درمیان تنخواہ سے کٹ کر جمع ہو۔

فقہاء کے یہاں اس میں اختلاف ہے کہ اجرت کا شمار کس قسم کے دین میں ہے؟

سرخسی نے امام ابوحنیفہؒ سے تینوں طرح کے اقوال نقل کئے ہیں، دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف (بسوط ۲/۱۹۶) تاہم ظاہر روایت یہی ہے کہ اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”امام ابوحنیفہؒ کے ظاہر روایت کے مطابق اجرت سے پہلے ہی نصاب زکوٰۃ متصور ہوگی، لیکن جب تک پورے نصاب دوسودرہم پر قبضہ نہ کر لے زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہ ہوگی“ (۲۲/۲-۳۰۲-۳۰۳)۔

تاہم دین قوی و اوسط کی تعریف پر نظر کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کی ان عبارتوں میں صراحت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، غلام ہی کی اجرت مراد ہے، اس لئے کہ دین کی ان دونوں قسموں میں دین کے لئے مال کا عوض ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ غلام ہی کی خدمت حنفیہ کے یہاں مال کے درجہ میں ہے، اس طرح آزاد کی اجرت دین ضعیف قرار پاتی ہے، جس پر ملازمین کو ملکیت تو حاصل ہے ”ید“ و قبضہ حاصل نہیں ہے، لہذا اس رقم پر گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، مولانا تھانویؒ کے دو متعارض فتاویٰ میں ان کے حسب ایما مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی جمیل احمد صاحب نے اسی کو ترجیح دیا ہے کہ اس رقم میں گزشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (امداد الفتاویٰ ۲/۳۳-۳۸)۔

### حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ کا تعلق دراصل انسان کی شخصی ضروریات سے ہے، ان شخصی ضروریات میں زمانہ و مقام اور اشخاص کے اعتبار سے تفاوت عین فطرت ہے، حاجت اصلیہ کی فقہاء نے جو تعریف کی ہے وہ اس طرح ہے:

”حاجت اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے بلاکت کو دور کر دیں، یہ کبھی حقیقتاً ہوگا، جیسے نفقات، رہائشی مکانات، آلات دفاع، ٹھنڈک اور گرمی سے بچنے کے لئے کپڑے کبھی معنی

و تقدیراً ہوگا، جیسے دین، صنعتی آلات، مکان کے ضروری سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لئے علمی کتابیں“ (۲۵: ۲۷۷)۔

یہ ظاہر اس بات سے کہ ”حاجت اصلیہ سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کے ذریعہ بلاکت سے بچا جاسکے“ احساس ہوتا ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ بہت تنگ ہے، لیکن اوپر حاجت اصلیہ کے ذیل میں آنے والی جن اشیاء کا ذکر ہے، ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فقہاء کے یہاں اس کا کس قدر وسیع تصور ہے، انہوں نے بلاکت جسمانی کی طرح بلاکت معنوی کو اسی زمرہ میں رکھا ہے، یہاں تک کہ اہل علم کے لئے کتابوں کو حاجت اصلیہ کا درجہ دیتے ہوئے صراحت کی ہے کہ جب ان کے لئے بلاکت ہی کے درجہ میں ہے، ”فبان الجہل عندہم کالہلاک“ (حوالہ سابق)، علامہ کاسانی نے حاجت اصلیہ کی توضیح کرتے ہوئے کہا ہے کہ سامان بقاء اس میں داخل ہے۔

”لأنه من ضرورات حاجة البقاء وقيام البدن“ (بدائع الصنائع ۱۱/۲)۔

(اس لئے کہ وہ قیام جسم اور بقاء انسانی کی ضروریات میں سے ہے)۔

لیکن غیر علماء کے لئے علمی کتابوں کو حاجت اصلیہ میں شمار نہیں کیا گیا ہے۔ ٹحطاوی کا

بیان ہے:

”وكتب العلم لغير أهلها ليست من الحوائج الأصلية“ (ٹحطاوی علی مراتب

الغلاص ۳۸۹)۔

غور کیا جائے کہ فقہاء نے پیشہ ورانہ آلات حرفہ، حفاظتی اسلحے اور موسمی لحاظ سے سرد و گرم لباس، اہل علم کے لئے اس کے موضوع کے مطابق مطالعہ کی کتابیں، جن کو حاجت اصلیہ کے زمرہ میں رکھا ہے، کا تعلق شخصی احوال سے ہے، جس میں تفاوت اور فرق کا پایا جانا فطری بات ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ضروریات زمانہ اور حالات کے لحاظ سے متغیر ہوتی رہیں گی، لباس

و پوشاک کا معیار بدلے گا، سواری میں فرق ہوگا، رہائشی اور سکونتی مکان میں نقشہ اور سہولتوں کے لحاظ سے فرق واقع ہوگا اور یہ ساری چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل ہوں گی، البتہ یہ ضرور ہے کہ فقہاء نے ”حاجت“ اور ”تخصیص وزینت“ کے درمیان جو فرق کیا ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اور حرمتِ زکوٰۃ کا حکم متعین کرتے وقت اس کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ زکوٰۃ کا مصرف فقراء و مساکین ہیں، حاجتِ اصلیہ کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہو جائے کہ مرفہ الحال لوگ بھی مستحقینِ زکوٰۃ کی صف میں آجائیں۔

### طویل الاجل ترقیاتی قرضے و جوہ زکوٰۃ میں مانع ہیں یا نہیں

وہ شخص جو اپنی موجودہ مالیت کے اعتبار سے صاحبِ نصاب ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مدیون اور مقروض بھی ہو تو کیا یہ دینِ زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہوگا؟ اگر مانع ہو تو نصاب میں سے دین منہا کرنے کے بعد مقدارِ نصاب باقی نہ رہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور منہائی کے بعد بھی نصاب باقی رہ جائے تو اتنی مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی، اور اگر دینِ زکوٰۃ میں مانع نہ ہو تو پھر پورے مال میں زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

اس سلسلہ میں فقہاء کے دو گروہ ہیں، اکثر فقہاء نے دین کو زکوٰۃ کے لئے مانع تسلیم کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ تو اس کے قائل ہیں ہی (یعنی ۲/۳۳۲)، ابوہریرہؓ، سیدنا عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حسن بصریؒ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے (مسوۃ فقہ ابراہیمؒ ج ۱/۵۲۳، مسوۃ فقہ عمر ۳/۵۳، مسوۃ فقہ عبداللہ بن عباس ۲/۱۰، مسوۃ فقہ الحسن البصری ۲/۳۷۳)، ائمہ اربعہ میں امام شافعیؒ کا قول جدید (جس پر فقہ شافعی میں فتویٰ ہے)، یہ ہے کہ زکوٰۃ بہر حال تمام موجودہ اموال میں واجب ہوگی اور دینِ زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا (شرح مہذب)، یہی رائے امام مالکؒ کے استاذ ربیعہ الرائے اور امام ابوحنیفہؒ کے استاذ حمادؒ کی بھی ہے (یعنی ۲/۳۳۲، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۱۹۳)، علامہ ابن حزمؒ نے بھی اپنے مخصوص مزاج کے مطابق بڑے شد و مد سے اس نقطہ نظر کو

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (مکمل ۳۲۰)۔

### مانعین کی دلیلیں

- پہلا اگر وہ جو دین کو زکوٰۃ کے لئے مانع قرار دیتا ہے، ان کی حسب ذیل دلیلیں ہیں:
- ۱- حضرت عثمان غنیؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”یہ تمہارے زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے، پس جس کے ذمہ قرض باقی ہو، اسے چاہئے کہ پہلے دین ادا کر دے پھر زکوٰۃ ادا کرے“ (مؤطا امام محمد ۱۲۸، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۱۹۳، لاسوال ۷۳۷)۔
  - ۲- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ کسی شخص کے پاس ہزار درہم ہوں اور کسی اور کے اس پر ہزار درہم واجب ہوں تو ایسے شخص پر زکوٰۃ نہیں (المغنی ۲/۳۳۲)۔
  - ۳- آن حضور ﷺ نے انبیاء (مال داروں) پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، یہ مضمون متعدد حدیثوں سے ثابت ہے اور جو شخص دین کی ادائیگی کا خود محتاج و ضرورت مند ہو اور ماہ بند ہونے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہو سکتا ہو، اس کو کیونکر غنی سمجھا جاسکتا ہے۔
  - ۴- مدیون ہونے کی وجہ سے کو یا بقدر دین مال پر مالک کی ملکیت ہی قائم نہیں، ظاہر ہے جب مال پر ملکیت ہی نہ ہو تو اس مال کی زکوٰۃ، کیونکر واجب ہوگی۔
  - ۵- زکوٰۃ واجب ہو تو ایک ہی مال پر دوہری زکوٰۃ عائد ہو جائے گی، حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں (البحر الرائق ۲/۲۱۹)۔

### مشبتین کا نقطہ نظر

جن لوگوں نے دین کے باوجود موجودہ مالیت کو دیکھتے ہوئے زکوٰۃ واجب قرار دی ہے، ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم عام ہے اور ہر اس شخص پر زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے جو نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو، مدیون اور غیر مدیون کا کوئی فرق نہیں کیا

گیا ہے، خود حنفیہ بھی پیداوار کی زکوٰۃ میں دین کو مانع نہیں مانتے (شرح مہذب) قریب قریب یہی بات علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی لکھی ہے (کلی ۲۲۰/۳)۔

اصل میں فقہاء شوافع نے زکوٰۃ میں ٹیکس اور موؤنت کے پہلو کو غالب رکھا ہے، جمہور فقہاء نے عبادت کے پہلو کو غالب رکھا ہے کہ عبادت میں شریعت کا عمومی مزاج سہولت اور تسامح ہے، یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں مانع اور مدیون کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں اور شوافع کے یہاں واجب ہے، ان دونوں گروہوں کے دلائل سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا زکوٰۃ میں مانع ہونا مزاج شریعت سے زیادہ قریب ہے، ابن رشد کے الفاظ میں:

”الأشبه بفرض الشرع اسقاط الزکوٰۃ عن المدیون“ (بدایۃ المجتہد)۔

کون سے دیون مانع زکوٰۃ ہیں؟

جو لوگ دین کو زکوٰۃ میں مانع مانتے ہیں، ان کے یہاں بھی دین کی مختلف اقسام کی گئی ہیں اور احکام کی تفصیلات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱- اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ میں دین مانع نہ ہوگا (رد المحتار ۶/۳، اشعرا الدرائی فقیر والی ۳۳۳، المغنی)۔

۲- مالکیہ نے اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کے درمیان فرق کیا ہے کہ اموال ظاہرہ یعنی مویشی اور زمینی پیداوار میں دین مانع زکوٰۃ نہیں ہوگا، اموال باطنہ، یعنی سونا چاندی اور سامان تجارت وغیرہ میں مانع ہوگا، یہی ایک روایت امام احمد کی بھی ہے (المغنی)۔

۳- حنفیہ کے یہاں تفصیل یہ ہے کہ دین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، یہ زکوٰۃ کے واجب ہونے میں مانع ہوگا، جیسے کسی شے کی قیمت، اجرت و کرایہ، بیوی کا نفقہ نیز زکوٰۃ، عشر اور خراج جو کو اللہ کے لئے نکالا جاتا ہے، لیکن اس کا مطالبہ بندوں

کی طرف سے ہوتا ہے، وہ دین جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہ ہو، وہ زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع نہ ہوگا، جیسے نذر، کفارات اور حج، صدقہ انظر، قربانی اور حج کی مطلوبہ قربانی (فتح القدیر ۱۱۸/۲، رد المحتار ۶/۲، بدائع الصنائع ۶/۲، خلاصۃ الفتاویٰ ۱/۲۳۰)۔

لیکن اصل میں جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ دین کے مانع زکوٰۃ ہونے میں دین حال اور دین مؤجل کے درمیان کچھ فرق ہے یا نہیں، عام طور پر متقدمین کا رجحان اسی طرف ہے کہ دین ہر صورت میں مانع زکوٰۃ ہے، فوری ادا طلب ہو یا دیر سے، لیکن مشائخ کا ایک گروہ شروع سے دین مؤجل کے مانع ہونے سے انکار کرتا ہے، خود امام کا ساقی کا بیان ہے:

”وقال بعض مشائخنا: إن الموجل لا يمنع؛ لأنه غير مطالب به عادة“ (بدائع ۶/۲)۔

علامہ ابن ہمام کہتے ہیں:

”کیا دین مؤجل بھی دین موجل کی طرح مانع زکوٰۃ ہوگا، حاکم شہید کے طریق میں اس سلسلہ میں کوئی روایت موجود نہیں، اگر ہم کہیں کہ مانع ہوگا تو ایسا بھی ایک قول ہے اور اگر کہیں کہ مانع نہیں ہوگا تو ایک قول ایسا بھی ہے، بیوی کا مہر واجب ہو اور ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو زکوٰۃ سے مانع نہ ہوگا، تحذیر الفقہاء میں بعض فقہاء سے ایسا ہی نقل کیا گیا ہے، کیونکہ اس کو دین شمار نہیں کیا جاتا، بعض فقہاء کی رائے ہے کہ اگر دین مہر مؤجل ہو تو مانع زکوٰۃ نہیں، کیونکہ عادت اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا“ (فتح القدیر ۱۱۹/۲-۱۲۰)۔

علامہ شامی نے دین مؤجل کے سلسلہ میں طحاوی سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ ایسے دین کو مانع زکوٰۃ نہیں مانتے تھے، نیز شامی نے ہستانی سے بعض اہل علم کی یہ بات نقل کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ اہل دین زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع نہیں (رد المحتار ۵/۲)۔

”فتاویٰ تاتارخانیہ“ میں نجم الامم سرحسی کے واسطے سے ان مشائخ سے نقل کیا گیا ہے



کہ دین مؤجل و جوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔

”وذکر نجم الأئمة السرخسی عن مشائخه أنه لا يمنع“ (۲۶: ۲۹۲)۔  
عورتوں کے مہر مؤجل کے سلسلہ میں بھی بعد کے مشائخ کا عام رجحان یہی رہا ہے کہ وہ  
جوب زکوٰۃ میں مانع نہیں، اور بز دوی نے اس رائے کی تحسین کرتے ہوئے کہا ہے: و أنه حسن  
(ہند یہ ۱۴۳/۱)۔

فقہاء کی ان عبارات سے واضح ہے کہ مشائخ احناف میں ایک قائل لحاظ تعداد ان  
لوگوں کی ہے جو دین مؤجل کو مانع زکوٰۃ نہیں مانتے ہیں، خود صاحب مذہب امام ابوحنیفہ سے ایک  
روایت اس کے مطابق منقول ہے اور ہستانی جیسے بلند پایہ فقیہ نے اس رائے کا صحیح و معتبر ہونا نقل  
کیا ہے۔

### زیر بحث مسئلہ میں معتدل نقطہ نظر

زکوٰۃ کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ضروری ہے کہ فقہی جزئیات سے پرے اٹھ کر  
شریعت کے مقصد و منشاء اور احکام زکوٰۃ کی روح کو بھی ملحوظ رکھا جائے، ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے سلسلہ  
میں شریعت کی روح یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں خدا کے واسطے سے اس کے غریب بندوں کا حق  
بھی محسوس کرے اور غرباء پر خرچ کرے، اسی لئے فقہاء کے یہاں یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جہاں  
وجوب اور عدم وجوب دونوں پہلو موجود ہو وہاں اس پہلو کو ترجیح دی جائے جس میں فقراء کو فائدہ  
ہوتا ہو، اب صورت حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں تجارت اور کاروبار کے لئے ترقیاتی قرضوں کا  
رواج عام ہے جو طویل مدت میں اور آسان اقساط پر ادا طلب ہوتا ہے، مقرض اس پیسہ سے  
بڑے بڑے معاشی فائدے حاصل کرتا ہے اور یہ رقم اس کے پاس جامد نہیں ہوتی بلکہ گردش میں  
رہتی ہے اور فقہاء کی زبان میں بالفعل مال نامی کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر اس دین کو زکوٰۃ سے  
مانع قرار دیا جائے تو فقراء ہمیشہ اپنے حق سے محروم رہیں گے، اس لئے جیسے متاخرین علماء نے

بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر عورتوں کے دین مہر کو زکوٰۃ میں مانع نہیں مانا ہے، یہ بات عین مناسب ہے کہ طویل مدتی استثماری دیون میں ہر سال کی ادائگی قسط کو اس سال کی زکوٰۃ کو مستثنیٰ قرار دیا جائے اور باقی مالیت پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے، اس پر فقہاء کے اس جزئیہ سے بھی روشنی ملتی ہے جس میں بیوی کے نفقے کے دین کو زکوٰۃ سے مانع نہیں مانا گیا ہے، اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نفقہ ایک ساتھ واجب نہیں ہوتا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے واجب ہوتا ہے۔

”لأنها تجب شيئاً فتسقط إذا لم يوجد قضاء القاضى أو التراضى“

(بدائع ۲/۷، امداد الفتاویٰ ۸/۲-۹، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۶۶-۳۶۶)۔

### کمپنی پر زکوٰۃ

مشترک اموال پر زکوٰۃ صرف مویشیوں کی صورت میں حنفیہ کے سوا دوسرے فقہاء کے یہاں واجب ہوتا ہے۔ حنفیہ کے یہاں مویشیوں کا اشتراک بھی زکوٰۃ واجب ہونے میں مؤثر نہیں ہے۔

”قال أصحابنا إذا كان النصاب بين الخلطين لا توجب فيه

الزكوة“ (تارخانیہ ۲/۲۹۷)۔

حصص کی لکھتے ہیں:

”لا تجب الزكوة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة

وإن صحت الخلطة فيه باتحاد أسباب“۔

اس لئے کمپنی کے شرکاء کی انفرادی حالت کا اعتبار ہوگا نہ کہ پوری کمپنی کا۔

ہیرے اور جواہرات

زکوٰۃ چونکہ عبادات میں سے ہے اور نصوص نے زکوٰۃ کے اموال و مقادیر کی تعیین کی

ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں قیاس واجتہاد کو دخل نہیں، زمین سے نکلنے والے معدنیات میں صرف سونا اور چاندی ہی میں زکوٰۃ واجب ہے، دوسری دھاتیں کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہوں اگر تجارتی مقصد کے لئے جمع نہ کی گئی ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں، امام نووی فرماتے ہیں:

”ولا تجب فیما سواہما من الجواهر أو کالیاقوت و الفیروز و اللؤلؤ و مہرجان“ (درمختار ۳/۳۲۲)۔

سونے چاندی کے علاوہ دوسرے جواہرات جیسے یاقوت، فیروز، موتی اور مہرجان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

شارح ”نور الایضاح“ کا بیان ہے:

”ولا زکوٰۃ فی الجواهر و اللآلی إلا أن تملیکھا بنیۃ التجارۃ کسائر العروض“ (مرآۃ الفلاح مع حاشیہ المظاہر ۳/۳۹۱)۔

(جواہر اور موتیوں میں زکوٰۃ نہیں سوائے اس کے کہ بنیت تجارت اس کا مالک ہو ایسی صورت میں دوسرے سامان تجارت کی طرح اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہے)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”و أما الیواقیت و اللآلی و الجواهر فلا زکوٰۃ فیہا و إن كانت حللیا إلا أن تكون للتجارۃ“ (فتاویٰ الہندیہ ۱/۱۸۰)۔

(یاقوت، موتی اور جواہر میں زکوٰۃ نہیں کو وہ زیورات کی شکل میں ہوں، سوائے اس کے کہ تجارت کے لئے ہو)۔

ہاں اگر تجارت کی نیت سے یہ معدنیات خریدی جائیں تو اب سامان تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر خرید کرتے وقت محض رقم کو محفوظ کر دینا مقصود تھا، بعد کو فروخت کر دے تو خیال ہوتا ہے کہ اب بھی اس کا شمار اموال زکوٰۃ میں نہیں ہوگا۔ ٹحطاوی کی اس وضاحت

سے اس سلسلہ میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:

”اصل یہ ہے کہ سونے چاندی اور مویشی کے علاوہ دوسری چیزوں میں اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ معاملہ کرتے وقت تجارت کی نیت ہو، اگر معاملہ کے بعد تجارت یا کوئی چیز برائے استعمال خریدی اور ارادہ ہو کہ نفع آجائے تو بیچ دے گا، ایسی صورت میں بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں“ (مکملہ فقہی مقالات، ج ۱، ص ۳۹۱)۔

### اموال تجارت کی زکوٰۃ میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟

سامان تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت خرید کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ سامان کی موجودہ قیمت معتبر ہوگی، البتہ کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس وقت مال پر سال گزرے اور زکوٰۃ واجب ہوئی اس وقت کی قیمت معتبر ہوگی، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جس وقت زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

”اگر قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یوم وجوب، یعنی اختتام سال کا اعتبار ہوگا، صاحبین کے نزدیک اس دن کی قیمت کا جس دن مصرف زکوٰۃ میں اس کو ادا کرے“ (مراۃ الفلاح، ج ۱، ص ۳۹۱، ہندیہ، ج ۱، ص ۱۸۰)۔

”فتاویٰ تارخانیہ“ میں ایک مثال سے اس مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے:

”ایک شخص کے پاس تجارت کے دو سو قفیز گیہوں ہوں جس پر سال گزر جائے اس کی قیمت دو سو درہم ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر خود گیہوں سے زکوٰۃ ادا کرے تو چالیسواں حصہ، یعنی پانچ قفیز ادا کرنا ہوگا، اور اگر چالیسویں حصہ کی قیمت ادا کرنا چاہے تو پانچ درہم ادا کرے گا، اگر ادا نہ کر پائے یہاں تک کہ گیہوں کی قیمت بڑھ گئی اور چار سو درہم ہو گئی تو اگر خود گیہوں سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو بالاتفاق وہی پانچ قفیز ادا کرے گا، اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یوم وجوب، یعنی جس دن سال تمام ہوا ہے اسی دن کی قیمت کے لحاظ سے پانچ درہم ادا

کرے گا اور صاحبین کے نزدیک ادائیگی زکوٰۃ کے دن کے اعتبار سے دس درہم“ (۱۵: ۱۸ خانہ)۔  
- (۲۲۲/۲)۔

امام شافعی کے یہاں بھی قول صحیح وجدید اس سے قریب ہے، نووی کا بیان ہے:  
”اگر زکوٰۃ کی ادائیگی میں اتنی تاخیر کی کہ قیمت گر گئی اور بجائے دو سو درہم کے سو درہم ہو گئی تو دیکھا جائے گا اگر یہ اس سے پہلے ہوا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ممکن ہوتی تو قول جدید اور صحیح کے مطابق ڈھائی درہم (یعنی اسی قیمت کے لحاظ سے) زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر زکوٰۃ ادا کرنے میں تاخیر کی اور قیمت چار سو درہم ہو گئی تو اگر قیمت میں یہ اضافہ اس سے پہلے ہو گیا کہ زکوٰۃ ادا کرنا ممکن ہو سکے، اور ہم کہہ چکے ہیں کہ یہی وجوب ادائیگی کی شرط ہے قول جدید کے مطابق اسے دس درہم ادا کرنے ہوں گے“ (شرح مہذب ۶۹/۲)۔

خیال ہوتا ہے کہ صاحبین کی رائے زیادہ قابل عمل ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ میں اصلاً تو وہ شئی واجب ہوتی ہے جس کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے، قیمت وہ اس کے بدل اور عوض کے بطور ادا کرتا ہے، تو ضرور ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ اتنی رقم ادا کر دے جس میں اس سامان کا بدل بننے کی صلاحیت موجود ہو، دوسرے فی زمانہ قیمت میں اتار کم ہی ہوتا ہے، قیمت میں اضافہ کی شرح زیادہ ہے تو ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار کرنے کی صورت میں فقراء کے لئے زیادہ نفع کی توقع ہے اور یہ بجائے خود زکوٰۃ کے احکام میں ایک اہم وجہ ترجیح ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سونے اور چاندی میں سے اس چیز کے ذریعہ اشیاء کی قیمت لگانے کو کہتے ہیں جن میں فقراء کے لئے نفع ہو۔  
اگر تھوک سے فروخت کرنے والی دکان ہے تو ظاہر ہے کہ تھوک کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اور ”ریٹیل سیل“ کا کاروبار ہے تو اسی قیمت کا اعتبار ہوگا، دونوں طرح خرید و فروخت کرتا ہو تو ”تقویم بالانفع“ کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے پھٹکر قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرے، جو اراضی، زمینیاں کے تجارتی کاروبار کے مقصد سے لی جائیں وہ تجارتی سامان ہونے کی وجہ سے

اموال زکوٰۃ میں شامل ہیں، ان کی موجودہ معروف قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، نہ کہ مستقبل میں متوقع قیمت کے لحاظ سے، اور فقہاء کی جو آراء ذکر کی گئی ہیں ان کا حاصل یہی ہے۔

### شیرز اور بونڈ زکی زکوٰۃ

شیرز کے سلسلہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کمپنی کا کام فقہی نقطہ نظر سے تجارت اور خرید و فروخت کے ذیل میں آتا ہے یا اجارہ کے دائرہ میں؟ فقہاء کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود خرید و فروخت کے علاوہ اگر ایسی صنعت بھی ہو کہ اس کا اثر مصنوعات میں باقی رہتا ہو جیسے کپڑے کا رنگ، دباغت کا تیل اور مشینوں کی مرمت میں پرزوں کی تبدیلی وغیرہ تو اس کا حکم بھی تجارت کا ہوگا اور ان اشیاء کا شمار بھی سامان تجارت میں کیا جائے گا، اس لئے ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی، کاسائی لکھتے ہیں:

”ایسی چیز جس کا اثر زیر عمل شئی میں باقی رہتا ہو جیسے رنگ، زعفران، چمڑے کو دباغت دینے والی چربی، تو یہ مال تجارت شمار ہوگی“ (بدائع الصنائع ۱۳/۲)۔

”کمپنی کے ایسے کاروبار جس میں مشینوں اور آلات کا استعمال اس طرح ہوتا ہو کہ یہ اپنی حالت پر باقی رہیں اور مصنوعات میں تیاری کے بعد ان کا اثر باقی نہ رہے ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی“ (۲۳۰/۲)۔

اسی حکم میں صنعتی آلات ہیں:

”وَأَمَّا آلاتُ الصَّنَاعِ وَظُرُوفُ أَمْتَعَةِ التِّجَارَةِ لَا تَكُونُ مَالِ التِّجَارَةِ“ (بدائع الصنائع ۱۳/۲)۔

”اگر دس ہزار روپے میں خرید کیا کہ اس کو لوگوں کو کرایہ پر دے گا اور سال بھی گزر گیا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ اس نے اس کو آمدنی کے لئے خریدا ہے نہ کہ تجارت کے لئے، اگر اس کی یہ بھی نیت ہو کہ بعد کو اسے فروخت کر دے گا، تو اس کا اعتبار نہیں، یہی حکم بار

---

مدداری اور سفر کے اخٹوں اور کرایہ کے گدھوں کا ہے“ (۲۲۱/۲۲۲)۔

لہذا جو کمپنی تجارتی کاروبار کرتی ہو اس کے حصص پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو کمپنی اس دائرہ میں نہ آتی ہو، اس میں اصل لگایا ہوا سرمایہ تو سامان اجارہ کے حکم میں ہوگا، اور اس کے قدر میں جو اضافہ ہوا ہے وہ نفع متصور ہوگا اور اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

جیسا کہ اموال تجارت کی زکوٰۃ کے ذیل میں مذکور ہوا، شیئرز میں اس کی موجودہ نرخ کا اعتبار ہوگا جہاں تک باؤنڈز کی بات ہے تو اس کی حیثیت دین قوی کی ہے، اس لئے قرض کی وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، سود کی شکل میں جو رقم حاصل ہو وہ تو حرام ہونے کی وجہ سے کل کا کل واجب التصدق ہے، لیکن اگر اس شخص نے صدقہ نہ کیا ہو تو پھر اس کا حکم بھی زکوٰۃ کے باب میں دوسرے اموال حرام کا سا ہوگا، مال حلال کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ سودی رقم کا حساب بھی محفوظ نہ رہے تو امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق دوسرے اموال کے ساتھ ملا کر اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

## جوابات سوال نامہ بابت زکوٰۃ

مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی ☆

ملک تام سے کیا مراد ہے؟

ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کسی مال پر ملکیت اس طور پر ثابت ہو کہ وہ اس مال مملوک میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہو، یعنی شریعت کی حدود میں جب چاہے جو چاہے تصرف کر سکتا ہو، ہمارے فقہاء کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقبۃً بھی اس کا مملوک ہو اور یداً بھی، (بدائع ۹/۲، شامی ۴/۲) یعنی اس شئی کی ملکیت اور اس میں تصرف دونوں چیزیں جس آدمی کو حاصل ہوں اس کی ملک تام مانی جائے گی، اسی لئے ان اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے کہ جس میں ملکیت تو پائی جائے، مگر تصرف سے آدمی عاجز ہو، مثلاً جو مال کھو گیا ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ چلتا ہو، اسی طرح جو سمندر میں گر گیا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت اور غیر موصول مال تجارت کی زکوٰۃ

۱- خریدار نے اپنا جو مال کسی چیز کے خریدنے کے لئے فروخت کنندہ کے سپرد کر دیا وہ خریدار کی ملکیت سے نکل کر فروخت کنندہ کی ملک میں پہنچ گیا، لہذا اس کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی۔

☆ شیخ الحدیث جاسر عیوبیہ بتور بلاندہ و سکریشی ہرائے سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔



۲- خرید فروخت کا معاملہ مکمل ہو جانے اور مشتری (خریدار) کی طرف سے قیمت کے ادا کر دینے کے بعد اگرچہ مال تجارت پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، مگر جب تک قبضہ نہ ہو یہ ملک تام، یا مطلق نہیں ہوتی، اس لئے کہ قبضہ کے بغیر خریدار اس میں کسی تصرف سے عاجز ہوتا ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہوگی (۳۱۲/۴)۔

البتہ چونکہ مدار اس کا اس پر ہے کہ آدمی ملک کے بعد بھی تصرف سے عاجز ہو، اس لئے اگر بدون قبضہ بھی تصرف کر سکتا ہو، یعنی جن اموال، یا جن بلاد میں کسی شخص کو محض خریدنے کے بعد پورے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہو جاتا ہو، ان میں چونکہ اس شرط کا تحقق ہوگا، لہذا خریدار کو اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگرچہ مال ابھی اس کے شہر، یا اس کے کوہام میں نہ پہنچا ہو۔

### کرایہ دار کی طرف سے پیشگی رقم، یا ڈپازٹ کی زکوٰۃ

- ۱- کرایہ دار جو رقم بطور کرایہ پہلے سے ادا کر دیتا ہے وہ اس کی ملک سے نکل کر کرایہ کے سامان کے مالک کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے اور اس پیشگی کرایہ کی رقم پر اس کی ملک تام ثابت ہوتی ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ موجر، یعنی کرایہ پر سامان دینے والے پر ہوگی۔
- ۲- جو پیسہ کرایہ دار بطور ڈپازٹ، یعنی زر ضمانت ادا کرتا ہے وہ کرایہ دار کی ہی ملک ہوتا ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہی ہوگی، فقہ حنفی کی کتابوں میں بیع و فاء کی جو صورت معروف ہے اس میں علامہ شامی نے مشتری، یعنی پیسہ دینے والے پر وجوب کو ترجیح دی ہے (۳۱۲/۶)، اور بیع و فاء میں خریدار کی طرف سے دی گئی رقم کی حیثیت ڈپازٹ جیسی ہوتی ہے۔

البتہ اس زکوٰۃ کی ادائیگی معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے کرایہ دار پر لازم نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس سے پہلے پہلے اس کی حیثیت قرض کے مال کی ہے، جس میں زکوٰۃ اگرچہ گذشتہ سالوں کی ادا کرنی پڑتی ہے، مگر قبضہ میں آنے کے بعد، اس سے پہلے نہیں۔

## مدارس و اداروں کی املاک میں زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرطوں سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب شخصی املاک میں ہوتا ہے، خواہ یہ ملک انفرادی ہو، یا اجتماعاً قومی و ملی املاک محل زکوٰۃ نہیں ہیں، اس لئے کہ بیت المال میں جمع شدہ اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مال وقف میں زکوٰۃ نہیں ہے (بدائع ۹/۲، فقہ الاسلامی وادنیہ ۲/۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹)۔

## جمع شدہ مال حرام پر زکوٰۃ

مال حرام پر اس شخص کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی جس کے قبضے میں وہ جمع ہو رہا ہے، یا جو کسی طرح سے اس کو حاصل کر رہا ہے، جہاں تک سوال ہے خلط کا تو آج کل نوٹ ہی رشوت و سود میں آتے ہیں، ان کی جو حیثیت ہے اس میں خلط کو مؤثر نہ ہونا چاہئے، اور اگر مؤثر بھی ہو تو بھی زکوٰۃ تو پاکیزہ کمائی والے حصہ میں ہوگی نہ کہ حرام میں، جیسا کہ فقہاء کی تصریحات و تفصیلات سے ظاہر ہے۔

## دین کی زکوٰۃ کس پر ہوگی؟

۱- دین کی زکوٰۃ دائن پر ہی ہوگی، اس لئے کہ مال اسی کی ملک ہوتا ہے، البتہ جب تک دائن کا قبضہ نہ ہو تب تک مطالبہ نہیں ہوگا اور قبضہ کے بعد مطالبہ میں تفصیل ہے، اس لئے کہ دین کی مختلف صورتیں و اسباب ہوتے ہیں۔

۲- دین کی زکوٰۃ کسی بھی صورت میں مدیون سے لئے جانے کا سوال ہی نہیں ہے، اگرچہ مدیون اس سے کتنا ہی نفع اٹھائے، اس لئے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ایک بنیادی شرط ہے اور دین کا مالک صرف دائن ہوتا ہے، مدیون اس پر قبضہ اور اس میں تصرف کے باوجود بھی اس کا بایں معنی مالک نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس پر شرعی مطالبات عائد ہوں۔

- ۳- دین کی وصولیابی و نامیدی کے مسائل کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے:
- الف: چونکہ ملک کے ساتھ ”تام و مطلق“ کی قید لگی ہے، اس لئے اصولی طور پر اسی دین کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کی وصولیابی اور جس میں تصرف پر آدمی قادر ہو۔
- ب: نیز دین پر زکوٰۃ کی بابت یہ بھی ایک اصولی بات ہے کہ کسی بھی قسم کی دین کی وصولیابی سے پہلے اس کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوتا، اگرچہ یہ وصولیابی جزئی ہو اور اسی جزئی وصولیابی پر اس وصول شدہ جزء کی زکوٰۃ لازمتر اردی جائے۔
- ج: اگر کسی دائن کے پاس اس کے دین کے علاوہ کوئی مال موجب زکوٰۃ موجود ہے جس پر سال گزر چکا ہے تو جو بھی دین آدمی کو حاصل ہو موجود کے ساتھ ملا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، خواہ دین جس قسم کا ہو۔
- د: اور اگر قرض دائن کی رقم کے علاوہ کوئی مال نصاب و موجب زکوٰۃ دائن کے پاس موجود نہیں ہے تو:
- ۱- جو قرض و دین اس کا تجارتی ہو، یا نقد لیا دیا گیا ہو اگر وہ بقدر نصاب ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، پھر اس کے بعد اس کی وصولیابی ہو رہی ہے تو جو مل جائے اس کے حساب سے زکوٰۃ نکالتا جائے، اس کے لئے نہ وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی ضرورت ہے اور نہ بقدر نصاب وصولیابی کی اور نہ ہی کسی مقدار خاص کی (اصن العتای ۳/۲۶۳)۔
  - ۲- جو غیر تجارتی دین ہے، مثلاً اپنی ضرورت کا کوئی سامان بیچ دیا تھا تو اگر بقدر نصاب اور سال گذرا ہوا ہے تو جب پورے نصاب کی وصولیابی ہوگی تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، البتہ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔
  - ۳- بعض صورتوں میں وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی بھی شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہوا، عام طور سے جو لوگوں کا دوسرے پر قرض ہوتا ہے اور وہ تجارتی لین دین کا، یا ضروریات کے

لئے نقد کے لین دین کا ہوتا ہے، اس میں وصولیابی پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی، البتہ دین کی تیسری قسم جس میں مہر کو بھی شمار کیا گیا ہے اس میں وصولیابی کے بعد سال کا گذرنا بھی ضروری ہے۔

### پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

اس فنڈ کی جو نوعیت ہے کہ وصولیابی سے پہلے آدمی کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہوتا، ہاں بطور قرض لے سکتا ہے، مگر پھر واپس کرنا پڑتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت ایک قسم کے دین کی ہے، لہذا وصولیابی سے پہلے اس پر کسی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور وصولیابی کے بعد اگر آدمی کے پاس دوسرا نصاب موجود ہے تو اس کے ساتھ جوڑ کر حولان حول اور نصاب کی قید کے بغیر اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور اگر اس کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو جب بقدر نصاب ہو اور سال گذر جائے تب زکوٰۃ ہوگی، اس لئے کہ فقہاء حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ فنڈ دین کی تیسری قسم میں شامل ہے، پھر یہ کہ ملک کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور اجرت پر قبضہ کے بغیر ملکیت ثابت نہیں ہوتی، تو یہ فنڈ آدمی کا حق تو ہے اس لئے کہ معاملہ میں طے کیا گیا ہے، مگر جب تک قبضہ میں نہ آئے یعنی وصول نہ ہو، اس کی ملک نہیں قرار پائے گا (دیکھئے: احسن الفتاویٰ ۳/۶۰، وادار الفتاویٰ ۳/۹۲-۵۰، جوہر الفقہ وغیرہ)۔

### شرط نما

وجوب زکوٰۃ کے لئے وہ مال جس میں زکوٰۃ واجب ہو رہی ہو اس کا نامی ہونا ایک بنیادی شرط ہے، ”الفقہ الاسلامی“ میں ہے:

”لأن معنی الزکاة وهو النماء، لا يحصل إلا بالمال النامی“ (الفقہ الاسلامی ۳/۷۰)۔

(یہ شرط اس لئے ہے کہ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی ”زیادتی“ کا حصول ایسے ہی مال کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو کہ بڑھنے والا ہو)۔

البتہ اس شرط کے اعتبار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعتاً و عملاً بڑھ رہا ہو، بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ بڑھنے کے حال میں ہو، اس لئے کہ قدرت نے اس کو ایسا ہی بنایا ہے، جیسے کہ سونا و چاندی اور آج کل روپیہ وغیرہ جو کہ سونے و چاندی کی جیسی حیثیت رکھتا ہے، یا یہ کہ آدمی کی غرض اس مال کو اپنے پاس رکھنے سے یہی ہے، جیسے مال تجارت خواہ وہ سال بھر کے عرصہ میں فروخت ہوا ہو اور کچھ بڑھا ہو، یا یہ کہ اب بھی دوکان میں موجود ہو، یا اس میں آدمی کو گھانا ہوا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بڑھنے کا تعلق خود اس شے سے ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، نہ کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے، یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ آج کل بعض حضرات نے کرایہ کے ذریعہ بنائی جانے والی املاک کو مال نامی میں شمار کیا ہے اور ان کی حیثیت دیگر اموال نامیہ کی قرار دی ہے، حالانکہ عام طور سے فقہاء اس کی نفی کرتے رہے ہیں، یا کرتے ہیں، امام احمد نے اگر کرایہ کا ذریعہ بنائے جانے والے زیور پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے تو اس کے سونا اور چاندی ہونے کی وجہ سے اور ذاتی استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے، پھر یہ کہ فقہاء نے منصوص اشیاء کے علاوہ محض اموال تجارت میں زکوٰۃ کو ذکر کیا ہے اور اسباب نماء میں تجارت کے ساتھ تولد و تناسل کو ذکر کیا ہے، کرایہ کا تذکرہ تو بظاہر کہیں ملتا نہیں۔ (فقہ الزکاۃ میں نماء کی شرط پر گفتگو کرتے ہوئے ۱۳۹۱ھ پر سطر ۱۹ میں نماء حقیقی کی تعریف میں شامی سے بحوالہ ”بحر“ نقل کیا ہے: ”الحقیقی الزیادۃ بالتوالد و التناسل و التجارات و نحوھا“۔ اس عبارت میں ”و نحوھا“ کا لفظ نہ شامی میں آیا ہے اور نہ بحر میں اور نہ بظاہر یہ لفظ احناف کی دوسری کتابوں میں آیا ہے، اللہ بہتر جانے کہ یہ کہاں سے آگیا)۔

## تیسری شرط حاجتِ اصلیه

یہ صحیح ہے کہ شرعاً اسراف و تنعم پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ کسی نص میں یہ بات نہیں آئی ہے اور نہ فقہاء کی تصریح میں کہ آدمی کے کھانے پینے کا اور پہننے واڑھنے کا ایک معیار متعین ہے، وہی حاجت ہے اور ماسوا اس سے زائد ہے، بلکہ تفصیلات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مالِ زکوٰۃ میں ایجابِ زکوٰۃ کے لئے دوسری شرطوں کے ساتھ یہ مطلوب ہے کہ کھانے و پینے، پہننے واڑھنے، رہنے و سہنے کی ضروریات میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو، شروع سال میں بھی اور اخیر میں بھی، یا یہ کہ سال بھر کی ضرورت میں صرف کئے جانے والے مال سے الگ نصاب اس کے پاس موجود ہو۔

مثلاً ایک آدمی کے پاس یکم محرم کو بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے اور جب سال ختم ہوا تو سال بھر اسی مال کی آمدنی و نفع، یا اصل کو خرچ کرنے کے بعد بقدر نصاب مال اس کے پاس موجود ہے، یا یکم محرم کو اس کے پاس دو نصاب موجود ہیں، ایک اس نے رکھا ہے سال بھر کی ضروریات میں صرف کرنے کے لئے اور ایک زائد ہے تو دونوں صورتوں میں اس کے پاس ضرورت سے فاضل و فارغ نصاب موجود ہے۔

نیز شریعت ایجابِ زکوٰۃ کے لئے صرف یہ دیکھتی ہے کہ آدمی کے پاس شروع سال و اخیر میں بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے، اس نے اس درمیان کتنا کمایا اور کہاں کہاں؟ کیا اور کیسے صرف کیا اس سے بحث نہیں ہوتی، البتہ دوسری صورت جو ذکر کی گئی ہے اس میں ضروریات کے لئے محفوظ کئے جانے والے سرمایہ میں آدمی کا جو واقعی معیار ہوا سے اس کی رعایت کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے کھانے اور پینے کا معیار الگ الگ ہوتا ہے جب شریعت نے اس میں پابندی نہیں بنایا ہے تو کسی زمانہ و ماحول کی بھی پابندی نہیں ہوگی، کتب فقہ کی تصریحات سے ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

## دین اور زکوٰۃ

اگر آدمی مالدار ہونے کے ساتھ مدیون ہو تو زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ تفصیل گذر چکی ہے، اور فقہاء کی تصریحات سے کوئی فرق اس اعتبار سے سمجھ میں نہیں آتا کہ قرض طویل المدت ہو تو سالانہ نقطہ کا شمار کر کے باقی پر زکوٰۃ ہو، بلکہ دین کی پوری رقم سے زکوٰۃ ساقط ہوگی اگرچہ معاہدہ کے مطابق دسیوں سال بعد پورے قرض کی ادائیگی کی نوبت آئے۔

## کمپنی پر زکوٰۃ

ایجاب زکوٰۃ کے لئے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے۔

## ہیرے اور جواہرات

ہیرے وغیرہ جب تجارت کے لئے نہ ہوں تو بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے (فتاویٰ ۱۲/۲، ۱۳/۲، ۱۴/۲، ۱۵/۲، ۱۶/۲، ۱۷/۲، ۱۸/۲، ۱۹/۲، ۲۰/۲، ۲۱/۲، ۲۲/۲، ۲۳/۲، ۲۴/۲، ۲۵/۲، ۲۶/۲، ۲۷/۲، ۲۸/۲، ۲۹/۲، ۳۰/۲، ۳۱/۲، ۳۲/۲، ۳۳/۲، ۳۴/۲، ۳۵/۲، ۳۶/۲، ۳۷/۲، ۳۸/۲، ۳۹/۲، ۴۰/۲، ۴۱/۲، ۴۲/۲، ۴۳/۲، ۴۴/۲، ۴۵/۲، ۴۶/۲، ۴۷/۲، ۴۸/۲، ۴۹/۲، ۵۰/۲، ۵۱/۲، ۵۲/۲، ۵۳/۲، ۵۴/۲، ۵۵/۲، ۵۶/۲، ۵۷/۲، ۵۸/۲، ۵۹/۲، ۶۰/۲، ۶۱/۲، ۶۲/۲، ۶۳/۲، ۶۴/۲، ۶۵/۲، ۶۶/۲، ۶۷/۲، ۶۸/۲، ۶۹/۲، ۷۰/۲، ۷۱/۲، ۷۲/۲، ۷۳/۲، ۷۴/۲، ۷۵/۲، ۷۶/۲، ۷۷/۲، ۷۸/۲، ۷۹/۲، ۸۰/۲، ۸۱/۲، ۸۲/۲، ۸۳/۲، ۸۴/۲، ۸۵/۲، ۸۶/۲، ۸۷/۲، ۸۸/۲، ۸۹/۲، ۹۰/۲، ۹۱/۲، ۹۲/۲، ۹۳/۲، ۹۴/۲، ۹۵/۲، ۹۶/۲، ۹۷/۲، ۹۸/۲، ۹۹/۲، ۱۰۰/۲)۔ اس لئے کہ یہ سونے و چاندی کی طرح طبعاً اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، لہذا ان میں نما کے تحقق کے لئے ان کی تجارت ضروری ہے، اس کے بغیر یہ نامی نہ ہوں گے اور مال کا نما ہونا و جوہر زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط ہے۔

## اموال تجارت پر زکوٰۃ

۱- اموال تجارت کو زکوٰۃ میں خرید و فروخت کے بجائے بازار کے بھاؤ و قیمت کا اعتبار ہوگا، اور جب زکوٰۃ ادا کرنے کی نوبت آئے اس دن جو قیمت ہو اس کا شمار کیا جائے گا (اس پر اہل فتویٰ اور فقہاء کا اتفاق ہے، (فتاویٰ اسلامی و ادنیٰ ۷۲/۲، ۷۳/۲) اور تھوک پھینکر میں تاجر کے حال کا لحاظ کیا جائے گا، اس لئے کہ بازار میں دونوں کا شرح الگ الگ ہوتا ہے۔

۲- جب زمین کی تجارت کی جائے تو وہ بھی دیگر اموال تجارت کا حکم رکھے گی: 'سواء

كان مال التجارة عروضاً أو عقاراً الخ“ (بدائع ۲۰/۲) اور اس میں بھی اگر علاقے کا کوئی معیار ہو تو اسی معیار کے مطابق زمین کی قیمت جوڑی جائے گی، یا پھر کم سے کم دام جو تاجر نے طے کر لیا ہے کہ اس سے کم نہیں کرنا ہے، جیسے کہ عام اموال کی تجارت میں پھٹکن فروخت کرنے والوں کے حق میں اس کو معیار بنایا جاسکتا ہے (متفرق خریدار جس قیمت سے لیتے ہیں وہ معتبر ہے اور اس میں اگر اختلاف ہو تو اکثر اور اشہر کا اعتبار ہے اور وہ قریب قریب متعین ہوتی ہے، یعنی وہ قیمت کہ اگر کوئی تخفیف کی درخواست نہ کرے تو اس پر فروخت کیا جائے (امداد الفتاویٰ ۲/۲۸۸)۔

### شیرز پر زکوٰۃ

شیرز پر بھی زکوٰۃ ہے اور بوقت ادائیگی زکوٰۃ کی جو قیمت ہو اس کا اعتبار ہوگا، ادا کردہ قیمت سے زائد ہونے والی رقم نفع ہے اور تجارتی سرمایہ و اموال میں اصل و نفع سب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

البتہ عام رجحان یہ ہے کہ شیرز کے صرف اس حصے پر زکوٰۃ ہوگی جو تجارتی کاروبار میں صرف کیا جا رہا ہو اور اس کا جو حصہ کمپنی کی ضرورت کی عمارت و آلات میں صرف ہو اور لگایا گیا ہو اس حصے میں زکوٰۃ نہیں ہوگی، اسی طرح انہیں کمپنیوں کے شیرز میں زکوٰۃ ہوگی جو کہ تجارت کرتی ہیں اور جو کمپنیاں شیرز سے املاک حاصل کر کے ان کے ذریعہ کاروبار کرتی ہیں کہ ان املاک کو کرایہ پر دیتی ہیں ان کے شیرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

دوسرا رجحان بعض علماء عصر کا یہی ہے کہ شیرز پر زکوٰۃ بغیر کسی تفصیل کے ہے، اس لئے کہ اس وقت کے عرف میں ”شیرز“ خود ایک سامان تجارت کی حیثیت رکھتے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ فقہ الزکوٰۃ ۱/۵۲۳-۵۲۶)، اور اسی حیثیت سے ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، لوگ خرید و فروخت میں ان کی مجموعی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور تفصیلات کے درپے نہیں ہوتے اور واقعہ یہی



ہے کہ اس وقت عرف نے خود شیئر زکوٰۃ ایک مال سامان کی حیثیت عطا کر دی ہے، اس لئے اس رجحان کو قبول کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی میں سہولت بھی ہے اگرچہ تجارتی کمپنیاں کس قدر آلات و اسباب میں اور کس قدر سامان تجارت میں لگاتی ہیں، اس کے جاننے میں بھی اس لئے زحمت نہیں ہے کہ کمپنیاں پوری تفصیل شائع کرتی رہتی ہیں، اور شیئرز کے مالکان کو پوری تفصیل سے باخبر رکھتی ہیں، اس لئے آدمی آسانی کے ساتھ تفصیل سے واقف ہو کر شیئرز کی زکوٰۃ دے سکتا ہے، لیکن زیادہ آسان یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیئرز کی پوری رقم پر اجمالاً اور مجموعی طور پر زکوٰۃ نکالی جائے۔

### باؤنڈس کی زکوٰۃ

باؤنڈس میں لگائی گئی رقم قرض ہوتی ہے اور فقہاء حنفیہ کی تفصیل کے مطابق یہ دین دین قوی ہوگا، اس لئے وصولیابی پر بشرط نصاب گذرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، لیکن اس میں لگائے گئے اصل سرمایہ کی اس پر جو مزید رقم آدمی کوماتی ہے وہ سود ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی (فقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۷۷۳)۔

### سونے و چاندی میں سے اصل نصاب

زکوٰۃ سے متعلق نصوص اور عام فقہاء کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسے سونا و چاندی میں سے ہر ایک خلقتہ، طبعاً، اور استعمالاً ثمن ہے اسی طرح نصاب زکوٰۃ میں بھی دونوں میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، جیسے جانوروں کا نصاب مستقل ہے دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر متفرع نہیں ہے، دیت کی بابت بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل اونٹ تھا، لہذا اس کی قیمت کو معیار بنا کر کمی و بیشی کی گئی (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب المدیات، الفصل الثانی ۳۳۳ و ۳۳۴، متعدد روایات ہیں جو کہ صراحۃً یا دلالتاً اس مضمون کو بتاتی ہیں)۔ مگر

سونے و چاندی کے نصاب کے متعلق احقر کا خیال ہے کہ کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے متعلق نصوص زیادہ ہیں، اور وہ قوت میں بھی فائق ہیں، اسی لئے چاندی کا نصاب اتنا ہی ہے اور سونے کے نصاب کی بابت کچھ اختلاف رہا ہے، بلکہ مشہور تابعی حضرت عطاء کا بیان تو یہ ہے کہ اس عہد میں چاندی ہی زیادہ رائج تھی، یعنی دراہم نہ کہ دینار (فقہ الزکوٰۃ ۱/۲۳۶ تا ۲۵۱)۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک مستقل ہے، لہذا جہاں جس کے نصاب میں فقراء کا فائدہ ہو، یعنی آدمی صاحب نصاب قرار پائے وہیں اس نصاب کا اعتبار ہوگا، اگرچہ دونوں کے نصابوں کی قیمتوں میں تفاوت فاحش پایا جاتا ہو، جیسا کہ آج کل عام طور سے ہے اور چونکہ چاندی کے نصاب کی مالیت ہر عہد میں کم رہی ہے (ابتدائی عہد کو چھوڑ کر)، اس لئے علماء کا عام رجحان چاندی کے نصاب اور اس کی قیمت کے اعتبار کا رہا ہے، اور ہے، اور اس باب میں ”انفع للفقراء“ کے اعتبار کا قاعدہ کتب فقہ میں اور فقہاء کے یہاں عام ہے (لفظہ الاسلامی وادلائہ ۱/۲۶۱ تا ۲۳۱)۔

## مصارف زکوٰۃ

### طلباء کو ماہانہ وظیفہ

سوال میں مذکورہ نظام کے مطابق طلبہ کو ماہانہ رقم بطور وظیفہ دینا اور پھر ان کے واجبی مصارف میں صرف کے لئے اس رقم کا مدرسہ میں ان سے جمع کرانا، بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا، بلکہ زکوٰۃ کی رقم کو صحیح طور پر صرف کرنے کی اس سے بہتر و بے داغ کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی، آج کل دنیوی تعلیم میں رہائش و تعلیم کا خرچ عام ہے، دینی تعلیم میں بھی بہت سے لوگ ان امور پر خرچ کرتے ہیں یا اس کا مزاج رکھتے ہیں، اس لئے مستطیع طلباء سے رہائش و تعلیم کے مصارف لئے جاسکتے ہیں، نیز ان سے جو مصارف لئے جاتے ہیں ان کی استطاعت کے

مطابق ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ وہ صرف طعام کے مصارف تو اپنے پاس سے دیں اور باقی مصارف مدرسہ سے لے کر جمع کریں۔

### اہل مدرسہ کس کے وکیل؟

عملاً اور واقعہً تو اہل مدارس کے لئے نہ زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے توکیل پائی جاتی ہے اور نہ مستحقین کی طرف سے، ہاں کبھی کبھی دینے والے ایسی باتیں، مثلاً ہم آپ کو دے رہے ہیں مصرف میں صرف کے آپ ذمہ دار ہیں کہہ دیا کرتے ہیں، اس لئے یہ توکیل انتظاماً اور کام چلانے کے لئے ہے، بعض اکابر دیوبند کی تحریرات میں طلباء کی طرف سے توکیل کی بات ملتی ہے، مفتی شفیع صاحب نے بھی اخیر میں اس کی طرف رجوع کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی اہل مدرسہ کی طرف سے طلباء کے ہر قسم کے مصارف میں براہ راست زکوٰۃ کی رقم کا لگانا محل تامل ہے، مثلاً رہائشی ضرورتوں میں جب کہ وہ رہ کر چلے جائیں گے اور یوں وہ مالک تو بنیں گے نہیں، بیت المال کے نظام میں بظاہر اس انداز کی کسی شکل میں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا، کم از کم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی تحریر کے مطابق دینے والوں کے بعد عدم واپسی اور جمع شدہ مال میں عدم وجوب زکوٰۃ کی حد تک تو یہ بات قبول کر ہی لینی چاہئے، اس طرح جب تک مال زکوٰۃ صرف نہ ہو تب تک عدم ادائیگی زکوٰۃ کی مالیت بھی، یعنی یہ کہ ذمہ داران وکیل طلباء ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے قابض ہوئے، لہذا دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور نہ ان کا کوئی حق باقی رہا اور نہ ہی ذمہ داری، باقی اس قبضہ کو مکمل طور پر طلباء کا قبضہ مان لینے اور پھر ہر قسم کے مصارف میں صرف کرنے میں ضرورت غور تحقیق کی ہے، جن حضرات کی تحریرات سے سند پکڑی جاتی ہے، ان کی نیز دوسرے عام ارباب افتاء کی تصریحات تو یہی ہیں کہ اہل مدرسہ کو مال زکوٰۃ طلباء کے ہاتھ میں ہی ان کی ضروریات کی صورت میں دینا چاہئے، مثلاً

کھانا و کپڑا وغیرہ اور ادارے کی دوسری ضروریات میں ان کے واسطے سے بطور تملیک رقم کو خرچ کرنا چاہئے۔

بہر حال یہ اہل مدارس کی ضروریات کے لئے غیر مفید بلوغت حیلے کے بجائے ایک مفید و مناسب توجیہ ہے، کچھ لوگ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، مگر ضرورت تنقیح و تحقیق کی ہے۔

### عالمین زکوٰۃ اور ان کا معاوضہ

الف- عالمین زکوٰۃ حکومت مسلمہ کے کارندے ہوتے ہیں اور اس واسطے سے وہ فقراء کے وکیل ہوتے ہیں، اہل مدارس کو بھی اگر فقراء کا وکیل مان لیا جائے تو سفراء و مصلحین چندہ ان کے کارندے ہوں گے، اور ان کو ان کے عمل کے عوض زکوٰۃ کا دینا درست ہوگا، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے متعدد فتاویٰ میں اور قوت کے ساتھ سفراء کا مال زکوٰۃ میں سے ان کے عمل کا معاوضہ دینے کو ذکر کیا ہے، لیکن صرف اسی حد تک انہوں نے گنجائش دی ہے، مزید صرف میں دیگر ارباب افتاء کی طرح انکار یا تملیک وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے (کتابتہ المفتی ۳۲۶۱-۳۲۶۹)۔

ب- یہ معاوضہ متعین مشاہرہ ہونا چاہئے، کمیشن درست نہیں ہے، حدیث تفسیر طحان کی صحت قوت کی وجہ سے اور ان عقلی وجوہ کی بناء پر جو فقہاء نے تفسیر طحان کی حدیث کے سلسلہ میں بیان کی ہے۔ کمیشن پر چندہ سے متعلق احقر کے مبسوط مقالے کا مطالعہ کیا جائے۔

ج- مشاہرہ، یا فیصد کی بنیاد پر معاوضہ (اگر اس کی کوئی جائز شکل بنتی ہو) اس کی شرعاً تحدید ہے وہ ہے کام کرانے والے کی ضرورت اور کفایت کی رعایت، اور اس بنیاد پر اس کو اس کے حال و معیار کے مطابق متوسط معاوضہ دیا جائے جس میں نہ تو انتہائی تنگی سے کام لیا جائے کہ معاملہ تفتیر کی حد میں داخل ہو جائے اور نہ اتنی سخاوت سے کہ معاوضہ تعذیر کی حدوں کو بھی تجاوز کرنے لگے، فقہاء و محققین نے عامل زکوٰۃ کے حق میں اس کی وضاحت کے ساتھ تصریح کی ہے

(سارف القرآن ۳۹۸، بحوالہ احکام القرآن للجصاص والقرطبی)، امام طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عمرؓ وغیرہ سے اسی کو نقل کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے (تفسیر طبری ۱۱۱-۱۱۲، الفہم الاسلامی ۸۷۱/۲-۸۷۷)، البتہ احناف کے یہاں یہ قید ہے کہ اگر عامل کی ضروریات نصف سے زائد کی متقاضی ہوں تو نصف سے زائد نہیں دیں گے (۵۹/۲-۶۰)، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص متوسط معاوضہ لیکر کام کرنے پر تیار ہو اسی سے کام لیا جائے۔

د- جو لوگ سفراء کو عاملین کے تحت داخل مانتے ہیں ان کے قول پر زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا حساب کرنے والوں کو صرف اس کام کا معاوضہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاسکتا ہے، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کی روشنی میں، نیز اہل مدرسہ کو طلباء کا وکیل قرار دینے پر بھی درست ہے۔

ہ- احتیاط اس میں ہے کہ جب چندہ کرنے والوں اور حساب لکھنے والوں کا کام زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدوں کی رقوم سے متعلق بھی ہوتا ہے، اور یوں بھی عاملین زکوٰۃ میں واقعہ جو بات پائی جاتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی، زکوٰۃ کی رقم سے براہ راست ایسا کوئی کام کرنے والوں کو ان کے کام کا معاوضہ نہ دیا جائے۔

### خلاصہ بحث

- ☆ ملک تام سے کیا مراد ہے: اپنے مملوک مال میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہونا۔
- ☆ پیشگی اداکردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی، بلکہ فروخت کنندہ پر۔
- ☆ غیر موصول مال تجارت کی زکوٰۃ ملک تام نہ ہونے کی بناء پر خریدار پر نہیں ہوگی اور یہ کہ وہ قبضہ کے بغیر تصرف میں آزاد ہوگا۔
- ☆ پیشگی کرایہ کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان و سامان پر ہوگی۔
- ☆ ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی، مگر رقم کے واپس ہونے کے بعد۔
- ☆ مدارس وغیرہ کی املاک پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

- ☆ مال حرام پر زکوٰۃ نہیں ہے۔
- ☆ دین کی زکوٰۃ صرف دائن پر ہوگی اور دین کی واپسی کے بعد اگر اس کے علاوہ اس کے پاس نصاب ہے تو اس کے ساتھ ملا کر اور اگر دین ہی نصاب ہے تو عاقرض و تجارتی دین میں جو وصول ہو اس پر گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ہوگی، اور بعض صورتوں میں تفصیل ہے۔
- ☆ پراویڈنٹ فنڈ کا حکم زکوٰۃ میں قرض کا ہے اور اس قسم میں شامل ہے جس میں زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ہوتی ہے، اگر کوئی دوسرا مال موجب زکوٰۃ موجود نہ ہو۔
- ☆ شرط نما: وجوب زکوٰۃ کے لئے نما، یعنی مال کی بڑھوتری ایک بنیادی شرط ہے، خواہ یہ بڑھوتری اس لئے مانی جائے کہ مالک نے مال کے ساتھ ایسی صورت و نیت اختیار کر رکھی ہے، مثلاً تجارت، یا یہ کہ وہ طبعی طور پر ایسی ہو کہ تجارت و معاملات کی روح ہو، جیسے سونا و چاندی وغیرہ۔

### تیسری شرط حاجت اصلیه

حاجت اصلیه کا مطلب ہے آدمی کی سال بھر کی کھانے، پینے و پہننے، اوڑھنے، رہنے، سہنے کی واقعی ضروریات میں جو کچھ صرف ہو جائے، یا اعتدال کے ساتھ جو کچھ صرف کرنے کے لئے طے کیا جائے اس میں اشخاص و ازمان کا اختلاف ہو سکتا ہے۔

### کمپنی پر زکوٰۃ

شرکاء پر ہوگی، جبکہ ہر ایک کی ملک بقدر نصاب ہو یا ان پر جن کی ملک بقدر نصاب ہو۔ ہیرے اور جواہرات اور ان جیسی چیزوں پر جب استعمال ہوں تو نما کی شرط کے نقد ان کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ہے۔

## اموال تجارت پر زکوٰۃ

جو بھی مال تجارت ہو، خواہ زمین و مکان بشرط نصاب اس پر زکوٰۃ اور ادائیگی کے دن کی مالیت اور قیمت کے حساب سے۔

## شیرز پر زکوٰۃ

شیرز کی مالیت پر زکوٰۃ ہے، مگر اس حصہ پر جو تجارت میں مصروف ہو اور آج کے عرف میں یہ خود مال تجارت ہیں، اس لئے اجمالی و مجموعی رقم پر بھی زکوٰۃ ہو سکتی ہے۔

## بانڈس پر زکوٰۃ

اصل رقم پر ہوگی اور مال قرض پر زکوٰۃ کے ضابطہ کے تحت، اس لئے کہ یہ رقم قرض ہوتی ہے۔

## سونے و چاندی میں اصل نصاب

سونے و چاندی میں سے ہر ایک نصاب کے باب میں مستقل ہے اور شارع نے دونوں کی استقلاً لتعین کی ہے، ایک کی دوسرے پر بنا کرتے ہوئے نہیں۔

## طلباء کو ماہانہ وظیفہ

وظیفہ کی شکل میں زکوٰۃ ان کے جملہ مصارف کو جوڑ کر دی جاسکتی ہے۔

## اہل مدرسہ کی وکالت

یوں تو سرمایہ داروں کی طرف سے مانی جاتی ہے، مگر اکابر کی ایک جماعت طلباء کا وکیل مانتی ہے۔

## عالمین زکوٰۃ

- الف- سفراء مدارس کو مفتی کفایت اللہ صاحب زکوٰۃ سے تنخواہ و معاوضہ دینا جائز کہتے ہیں اگر اہل مدارس کو فقراء و طلباء کا وکیل مان لیں تو دوسرے حضرات کے نزدیک درست ہے۔
- ب- لیکن معاوضہ متعین مشاہرہ ہونا چاہئے۔
- ج- معاوضہ کی تعیین میں کام کرنے والوں کی ضرورت کا اور محنت کا لحاظ کیا جائے۔
- د- گنجائش دینے والوں کے قول پر زکوٰۃ کا حساب کرنے والوں کو بھی زکوٰۃ سے تنخواہ دی جاسکتی ہے۔



## زکوٰۃ کے مسائل

مولانا زبیر احمد قاسمی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی نے اپنے پانچویں سمینار منعقدہ ”اعظم گڈھ“ میں زیر بحث لانے کے لئے جن مسائل کو موضوع قرار دیا ہے، ان میں ایک مسئلہ زکوٰۃ بھی ہے۔ بلاشبہ ان سے متعلق جتنے بھی سوالات ترتیب دیئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ اہم اور افادیت کے حامل ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی مسائل ہیں جو اپنی جگہ معروف و معلوم اور کتب فقہ میں مصرح موجود ہیں، جس میں نہ اختلاف رائے کی کوئی گنجائش محسوس ہوتی ہے اور نہ دور حاضر میں وہ کسی نئے اجتہاد اور غور و فکر کے محتاج نظر آتے ہیں، اس طرح انہیں زیر بحث لانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس کے علاوہ ان میں ایسے بھی سوالات نظر آئے جن کے متعلق اختلاف رائے بہر حال لازمی ہے، کیونکہ اس کے سلسلے میں خود حضرات ائمہ کے مختلف اقوال صراحتاً ہماری کتب متداولہ میں منقول ملتے ہیں، مثلاً بیع قبل القبض کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں۔

اس لئے ایسے مسائل میں تو ”اختلاف العلماء رحمۃ اللہ علیہم“ کے پیش نظر اسے مہلتی بہ کی ذاتی و شرعی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ وقت ضرورت متدین علماء اور معروف صاحب فتویٰ، فقہاء کی طرف رجوع ہو کر ان کے فتویٰ پر عمل کرتا رہے، اپنے اس خیال و احساس اور مذکورہ

☆ صدر المدینین اشرف العلوم کہوں (بہار)۔

بالا رائے کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سے متعلق بعض خاص سوالات کے سلسلے میں اپنے محدوہ مطالعہ و تحقیق کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا اور جس طرف اپنا رجحان ہوا اسے پیش کر دوں:

۱- ایک تاجر بغرض تجارت بیع و شراء کرتا ہے، اور مشتری قیمت سپرد کر دیتا ہے، لیکن بیع اس کے قبضہ میں نہیں آتی ہے تو بائع پر اس مقبوضہ ثمن کی زکوٰۃ بشرط نصاب و حول بہر حال لازم ہوگی۔

لیکن مشتری پر اس بیع غیر مقبوضہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس میں فقہاء کی عبارتیں خود مختلف ہیں۔

اپنا خیال یہ ہے کہ اس میں قبضہ کے قبل تو زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، مگر بعد قبضہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی بشرط نصاب و حول واجب الاداء ہوگی، کیونکہ یہ بہر حال مال تجارت کے بدل کے طور پر مشتری کا ایک دین بدمہ بائع رہتا ہے جو دین قوی کے حکم میں ہے اور دین قوی میں حسب تفصیل فقہ بعد قبضہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

۲- کرایہ دار جو رقم بطور اجرت معجلہ مالک مکان کے حوالہ کرتا ہے، اس کی زکوٰۃ تو مالک پر بشرط نصاب و حول لازم ہو جائے گی۔

”لأنه ملك الأجرة بالتعجيل كلها“ (بحر الرائق ۲/۴۱۹)۔

”وإذا عجل الأجرة لا يملك الاسترداد“ (مآی ۱۰/۶)۔

جیسی فقہی عبارتوں کا یہی مقتضا ہے۔

البتہ وہ رقم جو بطور ڈپوزٹ اور زر ضمانت، کرایہ دار جمع کرتا ہے اس کی زکوٰۃ بشرط نصاب و حول خود کرایہ دار پر واجب ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی ہوگی، کیونکہ یہ رقم یا تو امانت ہے یا بعد الاذن تصرف کے سبب قرض، ورنہ کالمغصوب، بہر حال جب اس کی واپسی کا ظن غالب ہوگا

تو دین قوی کا حکم رہے گا، ورنہ مال ضار کا حکم۔

اس رقم کو کالمر ہون کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایک حق ثابت اور دین موجود کو ممکن الاستیفاء اور سہل الحصول بنانے کے لئے جس چیز کو صاحب حق اپنے پاس محبوس کرتا ہے وہ شئی مرہونہ بنتی ہے، یہاں مالک مکان کا کوئی حق یا دین فی الحال کرایہ دار پر ثابت و موجود نہیں، وصولی کرایہ کا حق تو حسب شرائط مہینہ اور سال کے اختتام پر ثابت ہوگا، ڈپوزٹ کی رقم صرف اس احتمال و امکان کی بنیاد پر جمع کی اور کرائی جاتی ہے کہ حسب معاہدہ وقت معہودہ پر اگر کرایہ مکان وصول نہ ہو سکے گا، تو اس رقم سے محسوب ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ ایک حق موہوم اور دین مظنون کے بدلے شئی محبوسہ کو رہن نہیں کہا جاسکتا، اس لئے اسے یا تو امانت کے لئے یا قرض یا کالمغصوب اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہونی چاہئے۔

یہاں اس کی وضاحت ہو جانی مناسب ہے کہ بلاشبہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک تام ضروری ہے اور ملک کی تمامیت رقبۃ وید اہر دونوں طرح کی ملکیت پر موقوف ہے، مگر ملک ید کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ میرے پاس اور میرے ہاتھ میں بالفعل موجود ہو، بلکہ جس چیز میں ہمیں شرعاً تصرف کا حق ہو ہم تصرف میں کسی کے اذن کے محتاج نہ ہوں، اور اس کا کبھی نہ کبھی مقبوضہ ہو جانا مظنون۔ ظنن غالب ہو، وہ حکماً مقبوضہ اور یداً مملوکہ ہی کہلائے گی، ورنہ دین قوی وغیرہ میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کو واجب الاداء کہنے کا کوئی جواز نہ ہونا چاہئے۔

اس کے ساتھ یہاں اس امر کا استحضار بھی ضروری ہے کہ شئی مرہونہ بقدر دین ہی مضمون ہوتی ہے اور اسی کے بقدر وہ مشغول بالدين مشغول بالاجتہ ہونے کے سبب کالمعد و مہترار پاتی ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ راہن پر بعد الاسترداد بھی واجب نہیں ہو پاتی، لیکن کیا اس کا بھی فتویٰ دیا جاسکتا ہے کہ بشرط نصاب قدر دین سے زائد مالیت کی زکوٰۃ بھی بعد الاسترداد و الانفکاک سنین ماضیہ کی واجب الاداء نہیں ہوگی، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی سے ملک ید کی حقیقت سمجھی

جاسکتی ہے۔

۳- کسی مال کا ایسا ہونا کہ اس کا کوئی مالک معین نہ ہو، نہ معلوم الذات ہو، نہ معلوم النوع والجنس، اس کی نظیر شریعت میں نہیں ”لا سیابۃ فی الإسلام“ حدیث ہے، ہاں بیع بشرط خیار اس کی نظیر ہو سکتی تھی، مگر وہ بھی مختلف فیہ ہے، اس لئے سوال یوں کیا جائے کہ جس مال کا کوئی معلوم الذات معین مالک نہ ہو، بلکہ معلوم النوع والجنس اور مجهول الذات مالک ہو، جیسے کہ مال موقوفہ اور مدارس اسلامیہ جیسے اداروں میں جمع شدہ مال تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟۔

چونکہ مدارس اسلامیہ میں زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم پر مستحق زکوٰۃ طلبہ کی ملکیت ہوتی ہے، سفراء اور نظماء مدرسہ کا قبضہ دراصل طلبہ مستحق کا قبضہ ہوتا ہے، سارے اکابر دیوبند اس کے قائل ہیں اور یہ معلوم النوع مگر مجهول الذات طلبہ اشخاص حقیقی نہیں، اشخاص حکمی ہیں، اس لئے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی ”لعدم تصور التملیک من الأشخاص الحکمیۃ“۔

۴- مال حرام یا تو واجب التصدق ہوتا ہے یا اصل مالک پر واجب الرو، مال حلال کے ساتھ اس کا خلط کو بوجہ اہتملاک موجب ملک ہے، مگر اس مقدار کا وہ مستہلک ضامن ہونے کے سبب مدیون بھی بن جاتا ہے، اس لئے بقدر حرام مشغول بالدين والحاجة ہونے کے سبب کامل معدوم ہی ہوگا، اس لئے اس قدر حرام کے استثناء کے بعد صرف ماہی پر بشرط نصاب و حول زکوٰۃ واجب ہوگی، دیکھئے: (درختار ۲/۳۳)۔

اور اس صورت میں ثبوت ملکیت کا ثمرہ صرف وراثت و توریث میں ظاہر ہوگا، اور بس۔

۵- دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، اس تفصیل و شرائط کے ساتھ جو فقہ کی تمام ہی کتب متداولہ میں صراحتاً موجود ہیں، دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف کی ماہیت و حقیقت کا بیان پھر ان کے درمیان سنین ماضیہ اور سنین آتیہ کے اعتبار سے وجوب ادائیں فرق کا مسئلہ، اسی طرح کس دین کے کس مقدار پر قبضہ کے بعد کسب سے وجوب ادا کا حکم ہوگا، اور اس سلسلے میں خود امام

ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان میں اختلاف اور تعدد اقوال کی ساری بحثیں اور تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں، اس کے نقل و اعادہ کی کیا ضرورت۔

مدیون پر اس قدر دین کی زکوٰۃ واجب ہونے کی بات ”لکونہ مشغولا بالحاجة كالسعدوم“ ہونے کے باوجود خلاف عقل و نقل ہے، البتہ اس دین سے اگر مدیون نے بذریعہ تجارت نفع حاصل کیا ہوگا تو بشرط نصاب و حول مال مستفاد کی طرح اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

۶- سرکاری غیر سرکاری ملازمین کو ریٹائر ہونے کے بعد جو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملا کرتی ہے، وہ بہر حال ایک دین ضعیف کے حکم میں ہے، اس کا حکم شرعی معلوم و معروف ہے کہ بعد اقبض بشرط نصاب و حول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

۷- دین اور قرض کے درمیان جو جوہری فرق ہے اسے مستحضر رکھا جائے تو کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ حکومت یا کمپنی سے بغرض تجارت حاصل کردہ طویل المیعاد قرض و جوہر زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں، اور نہ اس کے جواب میں دین مؤجل کے مانع ہونے نہ ہونے کے درمیان اختلاف ائمہ اور تعدد اقوال کی طرف ذہن بٹلکے گا، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، جس میں لزوم نہیں، اس لئے اس کی تاخیر بھی صحیح و لازم نہیں: ”التأجيل في القبض باطل“ جیسے اصول اور ”كل دين حال إذا جله صاحبه صار مؤجلا القرض فإن تأجيله لا يصح“ جیسی عبارتوں کا یہی اقتضاء ہے۔

اس لئے حکومت یا کسی سے بھی حاصل کردہ قرض کی رقم، خواہ بظاہر وہ مؤجل ہی ہو، تکمیل نصاب میں یقیناً وہ مانع ہوگا، چنانچہ مکمل قرض کے بقدر وضع کر کے ہی اس کے مالک نصاب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

۸- ہیرے جوہرات کی خریداری بغرض زینت و آرائش ہو یا مقصد اظہار تحول ہو اس

میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر بغرض تجارت نہ ہو اور عملاً اس کی تجارت بھی کر رہا ہے تو اس میں بشرط نصاب و حول زکوٰۃ واجب الاء ہوگی، لیکن سول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جوہرات کی خریداری کرے، یا کسی قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اپنے سرمایہ کو ہیرے اور جوہرات وغیرہ (خلفی طور پر) غیر مای اشیاء کی شکل میں تبدیل کرے، اور فی الحال عملاً اس میں تجارت بھی نہیں کر رہا ہے، مگر اس کی نیت یہی ہو کہ مناسب موقع پر حسب احوال و مواقع سرمایہ کو فروخت کر لیں گے، تو ایسے جوہریوں کا کیا حکم ہوگا؟۔

میرا خیال یہ ہے کہ جو اس ارادہ سے خریدے اسے حکماً بغرض تجارت خریدار قرار دے کر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگانا چاہئے، اور ہماری سمجھ کے مطابق سد ذرائع جیسے فقہی اصول کا یہی مقتضی ہے، ورنہ پھر اس حرص و ہوس کے فراط، بددینی اور خوف خداوندی سے عاری ماحول میں اسقاط زکوٰۃ کا ایسا حیلہ سرمایہ داروں کے ہاتھ آ جائے گا، کہ بس۔ الامان والحفیظ۔ اور فقراء و مساکین تو ”نگ ننگ دیدم دم نہ کشیدم“ کا منظر پیش کریں گے، اس لئے نہ صرف دینا، بلکہ قضاء بھی وجوب زکوٰۃ کا فتویٰ اور حکم ہونا چاہئے، سد ذرائع کے علاوہ دوسرے اصل کلی مثلاً ”الامر اذا ضاق اتسع و اذا اتسع ضاق“ کا بھی ہی اشارہ ہو رہا ہے۔

۹۔ تجارتی اموال کے قدر و مالیت کے تحقیق میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ سے تو حوالان حول، یعنی وجوب ادا کے دن کی قیمت نرخ کا معتبر ہونا منقول ہے، مگر صاحبین فرماتے ہیں کہ اگر اسی دن ادا نہیں کیا تو پھر ادائیگی کے دن کی قیمت نرخ کا اعتبار ہوگا، اور ہمارے خیال میں صاحبین ہی کا قول لیسر و ارتق ہونے کے سبب لائق ترجیح ہے، اب وہ تاجر جس معیار کا ہے، یعنی تھوک فروش ہے یا خوردہ فروش وہ اپنے معیار و مقابل کے اعتبار سے ہی نرخ و قیمت کا حساب لگائے گا۔

۱۰۔ جو لوگ ”ارضیات“ کی تجارت کرتے ہیں اگر وہ زمین عشری یا خراجی نہیں تب تو

اس کی مالیت پر بشرط نصاب و حول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہونے میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ کوئی خفاء۔ البتہ اگر وہ زمین عشری یا خراجی ہوگی تو اس میں بظہر اشکال ہوگا کہ عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم لگانے سے تضاعف حق اللہ لازم آئے گا، اور فقہی عبارت، مثلاً ”حقوق اللہ تعالیٰ المتعلقة بالأموال لا يجب فیہا حقان“ وغیرہ کے خلاف ہوگا، مگر اس سلسلہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ امام محمدؒ کی تحقیق و توجیہ کو راجح قرار دیتے ہوئے ان تجارتی اراضیات میں عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی لگانا چاہئے، یہ فرماتے ہیں کہ عشر و خراج کا محل دراصل پیداوار حقیقی یا حکمی ہوگا اور وجوب زکوٰۃ کا محل نفس زمین اور اس کی قیمت ہوگی، ”فلا يلزم كون حق الله مضاعفاً في محل واحد“۔

### مخبر ثالث

مخبر ثانی میں صرف یہی ایک سوال تھا کہ اموال تجارت کے نصاب متعین کرنے میں سونے چاندی میں سے کس کے نصاب کو اہل تسلیم کیا جائے؟ اور چونکہ اس کا جواب نفع للفقراء کی روشنی میں واضح تر تھا، اس لئے اس سے تعرض کئے بغیر مخبر ثالث کے سوالات پر غور کیا۔

۱- اس میں پہلا مسئلہ یہ غور طلب نظر آیا کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم اور ان کے ماتحت سفراء و مصلین مد زکوٰۃ کی رقوم پر کس حیثیت سے قابض ہوتے ہیں، چونکہ ”جوہر الفقہ“ (۳۸۷۳) میں موجود مباحث و نقول سے یہ بات منہج ہو جاتی ہے کہ رجوع و اعتراف اور افادہ اور استفادہ کے بعد حضرات اکابر مثلاً حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، بلکہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ سب ہی لوگ بالاتفاق تسلیم کر چکے ہیں کہ مہتمم مدرسہ معطی و مستحق زکوٰۃ دونوں کے وکیل ہوتے ہیں، اس لئے جیسے خود فقراء و مستحقین زکوٰۃ کے قابض ہونے کی شکل میں صرف قبضہ فقراء سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، ملک معطی سے وہ رقم نکل جاتی ہے اور معطی بری الذمہ ہو جاتا ہے، اسی طرح مہتمم اور اس کے مامور و ماتحت سفراء کے قبضہ میں آتے

عی معطی کی زکوٰۃ ادا شدہ بن جائے گی، کیونکہ ”ید الوکیل کید الموکل“ مسلمہ قاعدہ شرعیہ ہے۔

یہاں اس تفریح حکم کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ یہ مہتمم و سفراء معطی زکوٰۃ کے وکیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، اس لئے جس طرح خود معطی کو اپنی زکوٰۃ بلا تملیک فقراء کسی دوسرے مصارف خیر، مثلاً تعمیر مساجد، بناء مدارس اور تکفین میت وغیرہ میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں، اسی طرح مہتمم حضرات بھی بلا تملیک مصارف خیر میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے، اس طرح یہ مسئلہ ہمارے خیال میں مفروع عنہا بن چکا ہے، ان حضرات اکابر کی اجتماعی رائے سے اب اختلاف کرنے کے بجائے اتفاق کر لیا ہی انشاء اللہ خیر قرار پائے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سفراء و مصلین کو منصوص مصرف زکوٰۃ ”العاملین علیہا“ میں داخل مان کر وہ زکوٰۃ سے انہیں تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں۔

اپنا خیال اور رجحان اس طرف ہے کہ اس سلسلہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ جواز کو تسلیم کر لیا جائے (کتابیہ لمفتی ۲۶۹/۳)۔

یہ صحیح ہے کہ عاملین کا تقرر و انتخاب امیر و سلطان کی طرف سے ہوتا ہے جو مدارس کے سفراء کے حق میں بظاہر مفقود ہے، مگر ملک ہندوستان میں جب خود امیر و قاضی کا تقرر و انتخاب ارباب حل و عقد کی طرف سے کیا جاسکتا ہے اور اس پر دور حاضر کے سارے معروف علماء کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے تو مدارس کے مہتمم حضرات جو اپنے اپنے دائرہ میں ارباب حل و عقد کے ہی منتخب و مقرر کردہ ہوتے ہیں ان کی حیثیت امیر کی کیوں نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی وہ تحریر جو حضرت تھانوی کے رفع اشکال کے طور پر ہمارے سامنے ہے وہ اس کی واضح دلیل کہی جاسکتی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں: ”بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت



(سیاست اور انتظام ملکی) جس کا ثمرہ تنفیذ حدود و قصاص ہے، دوسرا نظم حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، لیکن امر ثانی میں اہل حل و عقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد کی رائے و مشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی انتظام مدارس جو برضاء ملاک و طلبہ ابقاء دین کے لئے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر ہوگا (امداد الفتاویٰ ۶/۲۶۷)۔ بلکہ ”فتاویٰ خلیلیہ“ (ص ۳۱۹) میں ان کے الفاظ میں یہ صراحت ہے کہ اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں، ”چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقراء کے وکیل ہیں، معطین چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقراء تسلیم کر کے اپنا چندہ ان کے حوالہ کر دیا (جوہر الفقہ ۲/۳۸۸)۔

بہر حال ان اکابر کی ان تحریروں سے بھی مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتویٰ کی تائیدی ہوتی ہے، اور جب ان حضرات کی تحریر سے سفراء کا مثل عمال ہونا اور عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہونا واضح ہو رہا ہے تو ”إذا ثبت الشیء ثبت بلوازمہ“، کے تحت ان کو مد زکوٰۃ سے عوض عمل بھی دینا جائز ہونا چاہئے، لیکن زمانہ حرص و ہوس کا ہے، صبر و قناعت اور جذبہ ایثار سے عام قلوب خالی ہو چکے ہیں اس لئے قدر کفان کی تعین وغیرہ میں باہمی نزاع و اختلاف کا قوی اندیشہ ہے، اس لئے برضاء طرفین بطور تنخواہ اس کی پہلے ہی تعین کی جاسکتی ہے، یہ محض تغیر اسم ہے تغیر مسمیٰ نہیں، درحقیقت یہ کفان اور عمال ہی رہے گا۔

باقی رہا کمیشن کی اجازت دینا تو یہ کسی طرح صحیح طریقہ کار نہیں کہا جاسکتا، اس سلسلے میں عام طور پر اس کے عدم جواز کی جو دلیلیں بیان کی جاتی ہیں، کو ہمیں ان دلائل اور طرز استدلال سے کوئی انس اور مکمل اتفاق نہیں، مگر اس طریقہ کار کا کبھی مفصی الی الخصار ہو جانا لازم، بلکہ معلوم و مشاہد ہے، اس کمیشن کی اجازت پر ہمیں کبھی شرح صدر نہیں ہوا۔

۳- اب رہا تیسرا مسئلہ ”فی سبیل اللہ“ کے مفہوم و مصداق کی تعیین کا تو اس سلسلے میں حدیثاً و قدیماً بہت ساری بحثیں ہو چکی ہیں، اور ہر طرح کے رطب و یابس دلائل کا ایک انبار باخبر حضرات کے سامنے آچکا ہے، لیکن حق یہی ہے کہ نظر یہ تعمیم کے حاملین کی جتنی بھی پیش کردہ دلیلیں ہیں، ہرنگ اجتہاد و استنباط ہیں، اس پر نقد و تبصرہ، توجیہ و تاویل سے قطع نظر کسی دلیل میں وہ قوت اور وزن نہیں جو نظر یہ تخصیص کے دلائل میں ہیں۔

اور اگر صحیح فیصلہ کی بنیاد قوت دلائل پر ہوا کرتی ہے، اور یقیناً ہوا کرتی ہے، تو یہ بات طے شدہ سمجھنی چاہئے کہ قرآن پاک میں مصارف زکوٰۃ میں تین آئے ہوئے لفظ فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اور صرف جہادِ عسکری ہے اور بس۔

یہ صحیح ہے کہ قرآنی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایتوں میں فی سبیل اللہ کا استعمال لغوی معنی میں بھی ہوا ہے اور یہ لفظ لغوی طور پر سارے ہی قریبات و طاعات کو عام اور شامل ہے، لیکن یہ بھی ایک زبردست سچائی اور حقیقت ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں جو فی سبیل اللہ آیا ہے وہ بطور منقول شرعی، بلکہ منقول عربی کی حیثیت سے جہادِ عسکری کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے کہ ”سارے استدلال پر بھاری ہے شہادت اس کی“۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اس لفظ کے مطلق استعمال کی صورت میں بتاؤر ذہنی صرف جہادِ عسکری کی طرف ہوتا تھا، اور یہ مفہوم و مصداق عوام و خواص میں اتنا معروف تھا کہ از قبیل عوام ایک صحابیہ اور ایک صحابی جن کا کوئی علمی مقام معروف نہیں اور جن کی کوئی فقیہانہ امتیازی شان نہیں وہ بھی فی سبیل اللہ کا یہی مفہوم سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

آخر ابو داؤد کی روایت میں حضرت ام مفضل کا جو واقعہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر حضرت ابو مفضل سے سفر حج کے لئے اونٹ مانگا تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ اونٹ تو میں نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور صحابیہ اس عذر کو معقول سمجھتی ہوئی کوئی بحث و اعتراض نہیں

کرتیں اور نتیجتاً وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کی سعادت سے محروم ہو جاتی ہیں، اس سے کیا یہ حجت قائم نہیں ہو جاتی کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فی سبیل اللہ مفہوم و مصداق جہاد عسکری ہی تھا، اور غالباً اسی فرق و تباہ اور منقول شرعی و عرفی ہونے کی بنیاد پر تابعین، تبع تابعین اور سارے ائمہ مجتہدین کا اس مفہوم پر اجماع ہو چکا ہے، اقوال شاذہ اور تفردات قابل اعتناء کب اور کس مسئلے میں ہوتے ہیں کہ یہاں ان کی طرف ادنیٰ التفات کا جواز نکالا جائے، سلف و خلف کے اس اجماع کی صورت میں موجود ایک قطعی اور بدیہی دلیل کے مقابلہ میں دور حاضر یا ماضی قریب و بعید کے اصاغر و اکابر کی محض اجتہادی و استنباطی اور صرف ظنی و نظری دلیلوں کا کیا وزن ہو سکتا ہے، فیما بین تذهبون۔

یہ صحیح ہے کہ ام معقل رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ ”فہلا خرجت علیہ فإن الحج فی سبیل اللہ“ جس سے فی سبیل اللہ کے مصداق میں یک کونہ عموم کا ثبوت ہوتا ہے، یہاں اس حدیث پر سنداً و متنناً بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دراصل ایک لفظ کے معنی لغوی اور سطح ظاہر سے استفادہ کی صورت ہے اور بس۔

آپ جیسے باخبر حضرات سے کون زیادہ واقف ہوگا کہ یہ بھی ایک معروف طرز استدلال ہے کہ بسا اوقات مختلف مصالِح کی بنیاد پر آیت و روایت کی ظاہری سطح پر نظر رکھتے ہوئے اسے مواقع استدلال میں پیش کر دیا جاتا ہے، مگر درحقیقت آیت و روایت کا حقیقی انطباق مقصود نہیں ہوتا، اور اس کے نظائر جناب رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور فقہائے عظام سبھوں کے استدلال میں ملتے ہیں، مثلاً جناب رسول اللہ ﷺ جب رئیس المنافقین کے لئے دعاء استغفار کرتے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآنی آیت: ”إِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْلاً تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ“ (سورہ توبہ ۸۰) پیش کرتے

ہوئے آڑے آتے ہیں تو آپ جو اب میں جو یہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو استغفار سے منع تو نہیں کیا گیا ہے، بلکہ بخاری کے الفاظ میں آپ جو فرماتے ہیں کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا یہ کون سا استدلال ہے؟ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ کی شکل ہے حقیقی اطباق نہیں۔

اور مثلاً حضرت ابن عباس کے پاس ایک مسلمان آتا ہے جو قتل مسلم کا ارادہ رکھتے ہوئے قتل مسلم کے متعلق دریافت کرتا ہے تو آپ ”مَنْ يَقْتُلُ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا“ (سورہ نسا ۹۳) کی آیت تلاوت کرتے ہیں، یہاں بھی مصلحتاً اور سد الباب الفقہی وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ ہے، اسی طرح جب حضرت احنف بن قیس جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے شریک ہونے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں تو ان کی ملاقات حضرت ابو بکرہ سے ہوتی ہے اور احنف بن قیس کے ارادہ پر مطلع ہو کر انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جو حضرت ابو بکرہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

”إِذَا التَّقِيُّ الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفِهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ الْخ“

یہ بھی اسی قبیل سے ہے، ورنہ حضرت علی اور حضرت عائشہ وغیرہما اگر حضرات صحابہ پر جو اباب حق کا محض اجتہادی خطا کے سبب قتال تھا، روایت کا اطباق ممکن نہیں، یہاں حضرت ابو بکرہ تقلیل فتنہ کی وقتی مصلحت کے سبب الفاظ کی ظاہری سطح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ روایت پیش کرتے ہیں اور بس۔

اور مثلاً فقہاء کرام جو لکھتے ہیں کہ اگر بحالت صوم غیبت کرنے کے ارادے سے کوئی مسئلہ دریافت کرے تو جواب میں یہ حدیث سنا دیا جائے ”مَنْ اغْتَابَ فَاْفَطَرَ“ یہ استدلال بھی ظاہر ہے کہ روایت کا صحیح اطباق نہیں صرف مصلحتاً موقع استدلال میں پیش کر کے ظاہری سطح سے استفادہ ہے، الغرض اس طرح کے بہت سے نظائر ہیں، اس لئے اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ام معقل سے ”فإن الحج في سبيل الله“ فرمایا تھا، تاہم مصرف زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے مفہوم و مصداق کے مختص بالغز وہ ہونے کی اجماعی رائے پر کوئی آج نہیں آسکتی۔

اور سچی بات یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے مختص بالجہاد العسکری ہونے کے سبب مضبوط اور جامع تردیدیں بس یہی اس کا عرفی و اجماعی ہونا ہی ہے، دیگر سارے دلائل کے متعلق فیہ ما فیہ کہا جاسکتا ہے، مثلاً کلمہ ”انما“ اگر حصر حقیقی کے لئے ہی ہو اور کوئی فی سبیل اللہ کو ہر قاضی، مفتی، عالم مشغول بخدمت الدین پر عام و شامل مان لے تو اس سے مصارف زکوٰۃ کے ”اصناف ثمانیہ“ کا حصر حقیقی کب ٹوٹے گا۔ اصناف تو اب بھی وہی آٹھ رہیں گے، ایک صنف کے صرف افراد بڑھیں گے، ”ولا مانع من ذلك“، اسی طرح دوسرے دلائل کا بھی تجزیہ ممکن ہے، اس لئے اس سے زیادہ مزید کچھ کہنا حاصل یا تحصیل حاصل ہے۔

اجماع سلف صالحین کے خلاف آج فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیر کی کوشش، اعادنا اللہ، ”مَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا“ (سورہ نسا: ۱۱۵) کی وعید کا مستحق بنا سکتی ہے۔

## زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی وصولی کا طریقہ

### مدارس اسلامیہ کے سفراء و محصلین کی حیثیت اور کمیشن کا مسئلہ

مولانا انیس الرحمن قاسمی ☆

۱- زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا رکن ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ شانہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے دیگر ارکان کی تفصیلات بیان کی ہیں، اسی طرح قرآن و حدیث میں زکوٰۃ سے متعلق ضروری احکام کہ کن احوال میں زکوٰۃ فرض ہے؟ اور کس مقدار میں فرض ہے، نیز زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا طریقہ کیا ہے، ہمیں واضح طور پر ملتے ہیں، چنانچہ زکوٰۃ کی تحصیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ شانہ نے کتاب اللہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے:

”خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“ (سورہ توبہ: ۱۰۳)۔

(اے رسول آپ مسلمانوں کے مال کا صدقہ وصول کیجئے اور اس کے ذریعہ ان کو پاک اور مزکی بنائیے اور ان کے لئے دعاء کیجئے آپ کی دعاء ان کے حق میں راحت و سکون ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے)۔

اس آیت کے ذیل میں جمہور مفسرین نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس میں زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کا اختیار رسول اکرم ﷺ اور ان کے بعد امام المسلمین کو دیا گیا ہے، آیت میں لفظ ”خذ“ امر کا صیغہ ہے جو مستلزم ہے وجوب کو، جس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی امام کے ذریعہ ہو اور نہ صرف اس کی وصولی ہو، بلکہ خرچ بھی امام ہی کے ذریعہ ہو، چنانچہ دوسری آیت جو زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں ہے اس میں یہ واضح حکم ہے کہ مساکین اور فقراء کے بعد زکوٰۃ کی مد سے اولاً ان عاملین کو دیا جائے گا جو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم و حفاظت اور حساب و کتاب پر مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلُفَعَةَ قُلُوبُهُمْ  
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ  
حَكِيمٌ“ (سورہ توبہ: ۶۰)

(صدقات صرف فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہے اور ان لوگوں کے لئے جو زکوٰۃ کے کام کے لئے مقرر کئے گئے ہوں اور ان کے لئے جن کے دل میں حق کی الفت پیدا کرنی ہے، اور غلام کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لئے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کا فریضہ ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

”یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ زکوٰۃ کے وصول کرنے اور تقسیم کرنے کی ولایت امام اور اس کے مقرر کردہ والی کو حاصل ہے، اس مدعا پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حصہ عاملین کا بھی زکوٰۃ میں فرض کیا ہے اور یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اداء زکوٰۃ کے لئے عامل کا ہونا ضروری ہے اور عامل وہ شخص ہے جس کو امام وصولی زکوٰۃ کے لئے مقرر کرتا ہے، پس اس نص نے صاف بتا دیا کہ امام ہی وہ شخص ہے جس کو زکوٰۃ وصول کرنا چاہئے اور اس نص کی تائید اللہ

تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے ”خذ من أموالهم صدقة“ (تفسیر کبیر)۔

آیت کے اسی مفہوم کو تمام مفسرین اور فقہاء نے بیان کیا ہے، اسی لئے وہ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ کی وصولی کا اختیار امام المسلمین کو حاصل ہے اور عامل وہ شخص ہے جو زکوٰۃ کے لئے امام کی طرف سے مقرر ہو چنانچہ الکافی کے حوالہ سے ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”ومنهما العامل هو من نصبه الإمام لاستيفاء الصدقات والعشور كذا

فی الکافی“ (الہندیہ ۱/۱۸۸)۔

اور صاحب بدائع لکھتے ہیں:

”و أما العالمون عليها فهم الذين نصبهم الإمام لجباية الصدقات“

(بدائع ۲/۹۰۳)۔

امام بامرتی کہتے ہیں:

”العامل هو الذى يبعثه الإمام لجباية الصدقات“ (حلی ہاشم فتح القدر ۲/۲۶۲)

اسی طرح دیگر فقہاء نے عاملین کی تعریف یہی کی ہے کہ وہ زکوٰۃ پر امام کا مقرر کردہ ہوتا

ہے چنانچہ امام رازی شافعی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

”العامل هو الذى نصبه الإمام لأخذ الزكاة“ (تفسیر کبیر ۱۶/۱۱۳)۔

نیز عامل میں وہ تمام افراد داخل ہیں جو زکوٰۃ کے حصول، اس کی حفاظت، اس کی تقسیم

اور اس کے حساب و کتاب پر مقرر ہوں، چنانچہ فقہ شافعی میں عامل کی تفصیلات میں حاشر، عریف،

حاسب، کاتب، جابی، قسام، حافظ المال کو داخل کیا گیا ہے، چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

”قال أصحابنا: وإذا لم تقع الكفاية بعامل واحد أو كاتب واحد أو

حاسب أو حاشر ونحوه زيد في العدد بقدر الحاجة وفي أجرة الكيال والوزان

وعاد الغنم وجهان مشهوران“ (المجموع شرح المہذب ۶/۱۸۸)۔



اسی طرح حنبلی کے مشہور فقیہ علامہ علاء الدین ابو الحسن علی بن سلیمان المرادوی رحمہ اللہ عامل کی تشریح میں محصل، محافظ، کاتب، تقسیم کنندہ، عشر وصول کنندہ، وزن کرنے والا، گننے والا وغیرہ کو داخل کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”العامل علی الزکاة هو الجابی لها، والحافظ، والكاتب والقاسم  
والعاشر والکیال والوزان والعماد والساعی والرعی والسائق والحمال  
والجمال ومن یحتاج علیہ فیہا غیر قاض ولا وال“ (الانصاف ۳/۲۲۳)۔

فقہاء کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں ”العالمین“ مطلق ذکر کیا ہے اور اس میں وہ تمام افراد داخل ہیں جو عشر و زکوٰۃ وصول کرتے ہیں یا اس کی حفاظت کرتے ہیں یا اس کو ڈھوتے ہیں یا اس کا حساب و کتاب کرتے ہیں یا اس کی تقسیم کرتے ہیں۔

لیکن اب سول پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں، جبکہ خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا، اس لئے اب جو مالک اسلامیہ ہیں کیا ان کے بادشاہ پر امیر المؤمنین کا اطلاق ہوگا یا نہیں، اور کیا انہیں اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کے لئے عمال مقرر کریں، اور اگر وہ عمال مقرر کرتے ہیں تو کیا وہاں بادشاہ کی اجازت کے بغیر کسی پرائیویٹ ادارہ، مدرسہ یا تنظیم کو شرعاً اس کا اختیار ہے کہ وہ مال زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے عامل مقرر کرے اور اپنے مقرر کردہ عمال کو زکوٰۃ کے مال سے وظیفہ تنخواہ دے؟

فقہاء نے اس بارے میں جو تصریحات کی ہیں ان سے دو امر ظاہر ہوتا ہے، اول یہ کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے اور اس کے لئے عمال مقرر کرنے کا اختیار اصلاً اسی امیر کو حاصل ہے جو شرعی طریقہ پر امیر بنا ہو، لیکن اس امام عادل کی کمزوری کی بنا پر اگر کوئی دوسرا فرد نظام حکومت پر غلبہ پالیتا ہے اور وہ زکوٰۃ وصول کرتا ہے تو پھر یہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور زکوٰۃ وصول کرنا

درست ہوگا (البدائع ۸۸۵)۔

اس لئے اس زمانہ میں جہاں جہاں مسلم سلطنتیں ہیں اگر وہاں کی حکومت کا سربراہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا نظام قائم کرتا ہے تو اسے اس کا شرعاً حق ہوگا اور وہاں کی رعایا (تمام مسلمین) پر زکوٰۃ اسی کو ادا کرنا واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کو اس کی مد میں خرچ کرتا ہو، اسی طرح اس کے مقرر کردہ عمال زکوٰۃ کی مد سے وظیفہ پائیں گے۔

لیکن اگر ایسے ان تمام ممالک میں جہاں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا نظام شرعی نہیں ہے اور وہاں کے پرائیویٹ ادارے اور تنظیمیں یا مدرسے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو اس طرح سے زکوٰۃ وصول کرنا جائز ہوگا اور زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس اتفاق کے باوجود فقہاء متاخرین (عصر حاضر) کا رجحان اس طرف ہے کہ ایسی تنظیموں اور اداروں کے مقرر کردہ عمال شرعاً ”عاملین علیہا“ میں داخل نہیں ہوں گے، اس لئے کہ وہ امام کے مقرر کردہ نہیں ہوتے ہیں، لہذا ان پر زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جائے گی۔

علماء ہند میں حضرت مولانا عبداللہ فرنگی مہلی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی وغیرہ کا یہی فتویٰ ہے اور یہی قول دیگر فقہاء متقدمین کا ہے، اس لئے کہ تمام ہی فقہاء ”عاملین“ کے لئے امام کی شرط لگاتے ہیں اور یہ شرط نص قرآنی سے مستنبط ہوئی ہے، نص اسی کی طرف مشیر ہے اور اسی پر آج سے پچاس برس پہلے تک امت کا عمل تھا۔

لیکن اواخر نصف صدی سے مختلف دینی اداروں میں یہ سلسلہ شروع ہوا ہے کہ ان کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے جو افراد متعین ہوتے ہیں انہیں زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دی جاتی ہے۔

اس لئے موجودہ صورت حال پر غور کرتے وقت یہ نکتہ نگاہ کے سامنے رہنا چاہئے کہ اگر یہ ادارے ایسے ملک میں ہیں جہاں مسلمانوں کا امیر ہے تو فقہاء کے قول کے مطابق ایسے ممالک

میں امیر کو زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا شرعی حق ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہے، اگر کوئی وصول کرتا ہے تو وہ ناجائز ہے، بلکہ صحیح قول کے مطابق ارباب اموال کو بھی اپنی زکوٰۃ کی رقم کو انفرادی طور پر تقسیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ اگر کوئی امیر ایسی تنظیموں کو زکوٰۃ وصول کرنے اور خرچ کرنے کا اختیار دیتا ہے تو اس حقیر کی رائے میں ایسے اداروں اور تنظیموں کو زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کے لئے عمل مقرر کرنے کا شرعی حق ہوتا ہے اور ارباب اموال کو بھی اپنی زکوٰۃ دینے کا اختیار و حق ہوگا۔

اسی طرح ایسے علاقہ میں جہاں امیر المسلمین نہیں ہے، اگر وہاں کے ارباب حل و عقد زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لئے کوئی ادارہ قائم کرتے ہیں یا مدارس اسلامیہ کی طرف سے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا نظام چلتا ہے تو میری رائے میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم وغیرہ پر مامور افراد، عاملین زکوٰۃ میں شمار ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ بھی ارباب حل و عقد کی نگرانی میں چلتے ہیں اور ان کی مجلس شوری ہوتی ہے اور اصولاً امیر کے نقد ان کی صورت میں ارباب حل و عقد ہی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کو چلائیں، جہاں قاضی نہ ہوں وہاں قاضی کا تقرر کریں، جیسا کہ باب قضاء میں یہ مسئلہ معروف ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

”أما في بلاد عليها ولاية الكفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمعة والأعياد وبصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم طلب وال مسلم“۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے وہ زکوٰۃ و عشر کی تحصیل کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”زکوٰۃ و عشر وغیرہ فرائض مالیہ کا وجوب جن حکم شرعیہ و مصالح بشریہ پر مبنی ہے ان کا تقاضہ یہ ہے کہ اداء زکوٰۃ و عشر اور مستحقین پر ان کی تقسیم میں تنظیم کامل کا لحاظ رکھا جائے اور ظاہر ہے

کہ انفرادی تصرفات میں تنظیم مفقود ہوتی ہے، اس غلامی کے دور میں جو تفرق و تشتت کا دور ہے، امکانی صورت یہی نظر آتی ہے کہ ارباب حل و عقد کی کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔  
 ”لیکن جس مقام (صوبہ) میں امارت شرعیہ قائم ہو اور اس کے ماتحت جمع و تقسیم صدقات کا کام باقاعدہ اور منظم طریق پر ہو رہا ہو وہاں کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ امارت شرعیہ کے بیت المال میں ہی یہ رقم جمع کریں، اس جگہ کوئی دوسری کمیٹی بنانا قائم شدہ تنظیم کو خراب کرنے کے معنی میں ہوگا، جو قطعاً ناجائز و مذموم ہے، جہاں امارت قائم نہ ہو وہاں کے مسلمان اگر کوئی ایسی کمیٹی بنالیں تو ”قیام امارت شرعیہ“ تک وہ ایسا کر سکتے ہیں۔“

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہوا کہ امیر کی عدم موجودگی میں ارباب حل و عقد کو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ادارہ قائم کرنے کا اختیار ہے اور چونکہ مدارس اسلامیہ کے چلانے والے ارباب حل و عقد ہی ہوتے ہیں، اس لئے ایسے مدارس کے ”مدرسین“ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا کام کرتے ہیں تو ان کو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کی مدت میں زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دی جاسکتی ہے، البتہ انہیں دینی کام، یعنی درس و تدریس کرنے کی بنا پر ”عالمین“ میں اس وجہ سے شمار کرنا کہ وہ غریب و مستحق زکوٰۃ طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں، اصلاً درست نہیں ہوگا، ہاں تعلیم دینے پر اگر فیس متعین ہو اور زکوٰۃ کی رقم طلبہ کو دے دی جائے پھر وہ اس رقم سے مدرسہ میں تعلیمی فیس جمع کر دیں تو درست ہوگا، لیکن اس میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ روپے کی حیثیت کرنسی کی ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، جب کہ چیک میں یہ بات نہیں ہے، لہذا طلبہ کو کرنسی دی جائے چیک دے کر وصول نہ کیا جائے۔

اور چونکہ ”بیت المال“ کی طرف سے امیر کے مقرر کردہ عالمین کو زکوٰۃ کی مد سے دی جانے والی رقم کی دو جہتیں ہیں، ایک یہ کہ ”عالم“ کو اس کے عمل کی ”اجرت“ دی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ عالم جو کچھ لیتا ہے وہ زکوٰۃ کی حیثیت سے لیتا ہے، اس لئے یہ دونوں جہتیں مذکورہ

بالاقسم کے مدارس اسلامیہ کے سفراء و مخلصین میں بھی ہوں گی۔

امام نووی نے اس مسئلہ پر بحث کے ذیل میں کہ کیا کسی ہاشمی کو صدقات کی تحصیل پر مقرر کیا جاسکتا ہے اور کیا ایسے ہاشمی عامل کو زکوٰۃ کی مد سے رقم دی جائے گی، وہ اصحاب ثانی سے دقoul نقل کرتے ہیں، جواز کا قول بھی اور عدم جواز بھی، اور اس کی دلیل میں وہ لکھتے ہیں:

”قال أصحابنا الخراسانيون: هذا الوجهان مبنيان على أن ما يأخذ العامل أجره أو صدقة وفيه وجهان، إن قلنا أجره جاز وإلا فلا وهو يشبه الإجارة من حيث التقدير بأجرة المثل ويشبه الصدقة من حيث أنه لا يشترط عقد الإجارة ولا مئة معلومة ولا عمل معلوم“

امام نووی نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ امام و امیر صدقات کی وصولی کے لئے جن عمل کو مقرر کرے گا تو کیا وہ متعین اجرت پر ان کو رکھے گا یا ان کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے کام کرنے کے بعد ان کو اجرت مثل دے گا، وہ لکھتے ہیں:

”الإمام بالخيار إن شاء بعث العامل من غير شرط وأعطاه بعد مجيئه أجره المثل من الزكوة وإن شاء استأجره بأجرة معلومة من الزكوة وكلاهما جائز باتفاق الأصحاب۔“

أما الأول فلأحاديث الصحيحة في ذلك، ولأن الحاجة تدعو إليه لجهالة العمل فيوخر الأجرة حتى يعرف عمله فيعطى بقدره۔

وأما الثاني فهو القياس والأصل ولا شك في جوازه“ (المجموع شرح

المهذب ۱/ ۱۶۸)۔

امام نووی کی اس تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ عامل کو اجرت پر متعین کیا جائے، مگر احادیث میں صدقات وصول کرنے اور اجرت دینے کا جو طریقہ آیا ہے وہ یہ

ہے کہ زکوٰۃ وصول کر کے آنے کے بعد عمل کے حساب سے عامل کو اجرت دی جاتی تھی، اسی لئے یہ طریقہ بھی درست ہے۔

فقہ حنبلی میں بھی عاملین زکوٰۃ کو اجرت پر مقرر کرنے اور بغیر مقرر کئے ان کو عمل کے بعد اجرت دینے کی بات آئی ہے اور یہ دونوں طریقہ جائز ہے۔

علامہ سلیمان مرداوی لکھتے ہیں:

”بخیر الإمام إن شاء أرسل العاملين من غير عقد ولا تسمية شيئاً وإن

شاء عقد له إجارة“ (الانصاف ۳/۲۲۷)

اسی طرح فقہ حنفی کے محقق علامہ ابن نجیم مصری البحر الرائق میں لکھتے ہیں:

”والتحقيق أن فيه شبهة بالأجرة وشبهة بالصدقة، فلأول يحل للغني

ولا يعطى لو هلك المال أو أداها صاحب المال إلى الإمام وللثاني لا يحل

للهاشمي ويسقط الواجب عن أرباب الأموال لو هلك المال في يده؛ لأن يده

كيد الإمام وهو نائب عن الفقراء“ (البحر الرائق ۳/۲۵۹)

اس عبارت سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عامل کو جو رقم دی جائے گی اس کی

حیثیت اجرت کی بھی ہے اور صدقہ کی بھی، اور عامل کو یہ رقم اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ وہ زکوٰۃ کی

تختصیل و تقسیم کی مدت میں اسی کام میں مشغول رہتا ہے، اس لئے اس مدت میں عامل کو زکوٰۃ کی مدد

سے بہ قدر کفایت (یعنی جو اس کے لئے اور اس کے اہل و عیال کے لئے کافی ہو سکے) اجرت دی

جائے گی (البحر الرائق ۳/۲۵۹)۔

اور دیگر فقہاء کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عاملین زکوٰۃ کو جو اجرت زکوٰۃ

کی مدد سے دی جائے گی وہ ان کے کام کی مدت کے حساب سے دی جائے گی اور اس قدر دی

جائے گی جو ان کے لئے اور ان کے اہل و عیال کے لئے اس مدت میں کافی ہو سکے، نہ یہ کہ اگر وہ

ایک ماہ کام کرتے ہیں تو اتنی رقم دی جائے کہ سال بھر کے لئے کافی ہو سکے، اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہیں تو اتنا زیادہ دینا جائز نہ ہوگا۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے جو سفراء و مخلصین مقرر ہوتے ہیں، عموماً ان کو ماہ رمضان میں زکوٰۃ وصول کرنے پر اجرت بہ طور کمیشن دی جاتی ہے، وہ ان کی اس مدت عمل کی ضرورت سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے جو فقہاء کی تصریحات کی رو سے درست نہیں ہے، اس لئے اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ کمیشن پر عاملین زیادہ کام کرتے ہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ کمیشن کا مروجہ طریقہ ایسا ہے جس میں فقراء کی حق تلفی ہوتی ہے، اس لئے اگرچہ میرے نزدیک زکوٰۃ کی تحصیل کے معاملہ میں عاملین کی تقرری اجرت مقرر کر کے اور بغیر اجرت مقرر کئے دونوں طرح سے جائز ہے، اور اس معاملہ میں عمل کی جہالت اور اجرت کی جہالت نیز مدت کی جہالت قابل انگیز بھی ہے، اور بہ وقت ضرورت امام و امیر کمیشن کے طریقہ کو اختیار بھی کر سکتا ہے، مگر موجودہ حالت میں کمیشن کے جواز کا فتویٰ دینا غلط نظام کو تقویت دینا اور مفسدہ کو بڑھانا ہوگا، اس لئے کمیشن کے مروجہ طریقہ کو نا درست قرار دیا جانا ہی احوط ہے اور باب اجارہ پر قیاس تقاضہ بھی یہی ہے۔

”نظام زکوٰۃ“ کی اہتری اور تحصیل و تقسیم کے معاملہ میں شریعت کے منشاء کی خلاف ورزی و لامرکزیت اور فقہاء کی تصریحات کے خلاف عمل کو ختم کرنے کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ فقہ اکیڈمی کے پانچویں سمینار میں اس پر خصوصی تجویز منظور کی جائے اور ارباب مدارس و خیراتی اداروں کے منتظمین سے گزارش کی جائے کہ وہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم میں مرکزیت کو اختیار کریں اور اس بارے میں ہونے والی خامیوں کو ناکاہیوں کو دور کریں۔

## ادائیگی زکوٰۃ کے شرائط و ارکان

مولانا احمد یولوی ☆

زکوٰۃ کے موضوع پر ”اعظم گڈھ“ میں ۱۹۹۲ء مطابق ۱۳۱۳ھ کو منعقد کئے جانے والے مجوزہ سمینار کی طرف سے جاری کردہ سوالات کے جوابات:

القرآن مجید کا ارشاد ہے:

”خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً“ (سورہ توبہ: ۱۰۳)۔

اس قرآنی نص اور اس معنی کے دوسرے نصوص میں علی العموم علی الاطلاق اموال میں زکوٰۃ دینے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس لئے شرعاً جن چیزوں پر اموال ہونے کا اطلاق ہوتا ہو ان سب میں مطلقاً علی العموم زکوٰۃ واجب ہے، اس حکم کلی اور حکم عام و حکم مطلق سے صرف وہی اموال مستثنیٰ ہیں جن کا مستثنیٰ ہونا نص شرعی سے ثابت ہو، مثلاً نصوص شرعیہ میں آدمی کے ذاتی استعمال کی سواری، سکونت والے مکان، ذاتی خدمت کے لئے رکھے گئے غلام و لونڈی اور متعدد چیزوں کی زکوٰۃ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، اس طرح کا استثناء جن اموال کے لئے ثابت نہیں ان میں زکوٰۃ واجب ہے، ان اموال میں مقدار زکوٰۃ و نصاب اور وقت کی جو تحدید شریعت میں کی گئی ہے اسے ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

محل زکوٰۃ، یعنی اموال میں وجوب زکوٰۃ کے لئے جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان



میں سے پہلے نمبر پر ذکر کردہ شرط ”ملک تام“ کی تعریف میں پائے جانے والے اہل علم کے مختلف اقوال میں سے ہمارے نزدیک یہ تعریف سب سے زیادہ جامع اور قابل قبول ہے کہ:

”کسی آدمی کو کسی چیز اور مال کے اوپر اور اس سے منفعت حاصل کرنے پر ایسی ملکیت شرعاً و قانوناً حاصل ہو جس کی وجہ سے اسے اس چیز و مال میں کسی مانع کے بغیر ہر طرح کے شرعی تصرف کا حق و اختیار ہو“ (المدخل الفقہی العام لآستاذ مصلحی احمد البرقانی مطبوع دار الفکر ۱۹۶۸ء دمشق ۱/۲۳۱-۲۵۸ نیز ملاحظہ ہو، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۲/۲۹۷-۲۹۸-۱۷۹)

### شرط مذکور کے تحت کئے گئے سوالات کے جوابات

۱- بائع کے پاس موجود جس مال تجارت کی پیشگی قیمت مشتری (خریدار) کی طرف سے ادا کر دی گئی ہو وہ مال تجارت اگرچہ مشتری کو موصول نہ ہوا ہو اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہے، جب کہ مشتری کے لئے اس پر پورا حق تصرف حاصل ہو، اس کے لئے اس مال تجارت میں تصرف سے کوئی مانع نہ ہو اور اس خطرہ کا غالب گمان نہ ہو کہ خریدار کے تصرف سے پہلے وہ کسی بھی وجہ سے، مثلاً غصب، ناجائز خرید و نقد رتی یا غیر قدرتی آفت و بلا کی وجہ سے ضائع ہو کر مشتری تک پہنچنے نہیں پائے گا، ایسا مال تجارت چونکہ شرعاً و قانوناً بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں آ گیا ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہے، البتہ اس مال تجارت کی جو قیمت مشتری سے بائع کو ملی ہے اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے، دونوں ہی آدمیوں پر زکوٰۃ اسی صورت میں واجب ہوگی، کہ مال نصاب کو پہنچ گیا ہو اور اس پر حوالان حول ہو گیا ہو۔

۲- کرایہ کے مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ فسخ ہونے یا تکمیل مدت اجارہ کی صورت میں کرایہ دار کو واپس ملتی ہے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہے مالک مکان پر نہیں، کیونکہ وہ شرعاً کرایہ دار کی ملکیت ہے، مالک مکان کی نہیں، وہ مالک مکان کے پاس معنوی

طور پر امانت محفوظ ہے، اس محفوظ میں مالک مکان کو شرعاً حق تصرف نہیں مگر کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوگی، جس وقت اسے وہ رقم واپس مل جائے، کیونکہ واپسی سے پہلے اس رقم پر کرایہ دار کو ملک تام نہیں حاصل ہے، رقم مذکور جتنی مدت مالک مکان کے پاس رہی اس پوری مدت کی زکوٰۃ اس رقم کی واپسی پر کرایہ دار کو نکلانا لازم ہوگا، لیکن بطور کرایہ مکان کے مالک کو جو رقم پیشگی ملی ہوئی ہو، اور اسے جو کرایہ دار کو واپس نہیں ملی ہو، اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہے جب کہ وہ نصاب کو پہنچے اور حوالان حول ہو۔

۳- مدارس اور اس قسم کے دوسرے اداروں میں مختلف لوگوں کی طرف سے دی ہوئی رقوم میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وہ رقوم بذات خود اموال زکوٰۃ، صدقات مافلہ، اوقاف سے حاصل شدہ چیزوں اور تبرعات و عطیات پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کا کوئی معین مالک نہیں ہوتا۔

۴- ہمارے نزدیک طاعت سمجھے بغیر اموال حرام کی زکوٰۃ بلا امید ثواب محض بعض مصالح کی بناء پر (جس کی تفصیل پیش کرنے سے ہم مصلحتہ انماض کر رہے ہیں) دی جائے اور وصول کی جائے، یہ ان ممالک و مقامات میں لیا جائے جہاں اسلامی نظام حکومت رائج نہیں، زکوٰۃ کے نام پر اس طرح کے اموال حرام سے حاصل شدہ مال کے مصارف اہل علم کی صوابدید سے متعین کئے جائیں، لیکن جہاں اسلامی نظام حکومت رائج ہو وہاں ہمارے خیال میں اسلامی حکومت کو چاہئے کہ سزا و تعزیر کے طور پر اس قسم کے جملہ اموال کو بحق شرکاء ضبط کر لے، اور غلط ذرائع سے اموال حرام حاصل کرنے والوں کو مناسب سزا دے اور اس طرح کے ذرائع کا سدباب کرے۔

اگر اموال حرام اموال حلال میں اس طرح مخلوط ہو گئے ہوں کہ دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہو تو بھی ان کی زکوٰۃ دی جائے اور وصول کی جائے، محتاط ترین تخمینہ لگا کر حلال اموال والی زکوٰۃ میں امید ثواب رکھنی چاہئے اور حرام اموال والی زکوٰۃ میں نہیں، حلال اموال والی زکوٰۃ کے مصارف تو خود قرآن مجید نے بیان کر دیئے ہیں۔ حرام اموال والی زکوٰۃ کے مصارف اہل علم

کی صوابدید سے متعین کئے جائیں۔

۵- دین (قرض) کی زکوٰۃ مدیون (مقرض) پر واجب ہے، جب کہ قرض والی رقم مدیون کے پاس کم از کم سال بھر رہ جائے، سال بھر یا اس سے زیادہ جتنی مدت تک دین مدیون کے پاس رہے گا، تب تک کی زکوٰۃ مدیون پر ہی واجب رہے گی، بشرطیکہ حاصل شدہ قرض نصاب زکوٰۃ تک پہنچے، اور اس کے پاس موجود رہے، کسی معقول وجہ سے تلف نہ ہو جائے، تلف و ضائع ہونے کی صورت میں قرض حاصل شدہ رقم میں مقرض پر زکوٰۃ واجب نہیں، سال بھر کے اندر اگر قرض دہندہ (دائن) کو واپس مل جائے تو اس کی زکوٰۃ قرض دہندہ پر واجب ہوگی، سال بھر کے بعد قرض واپس ہونے پر ان کی زکوٰۃ قرض دہندہ پر اس وقت واجب ہوگی، جبکہ واپسی کے بعد حوالان حول ہو جائے، خلیفہ راشد عمر بن خطاب اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی شدہ فتاویٰ و فرامین اور اقوال سے اسی طرح کا حکم مستفاد ہوتا ہے، جس کی تفصیل ”المجلد للمحافظ ابن حزم“ (جلد ۶ ص ۹۹ اور ص ۱۰۵ مسئلہ نمبر ۶۹۳/۶۹۵/۶۹۶) میں موجود ہے، کیونکہ قرض پر دیا جانے والا مال درحقیقت دائن (قرض دہندہ) کے قبضہ، حق تصرف اور انتفاع سے نکل کر مقرض (مدیون) کے قبضہ میں چلا جاتا ہے، اور اس پر تصرف و انتفاع کا حق و اختیار بھی مدیون ہی کو رہتا ہے، اور عملی طور پر اس پر ملکیت بھی مدیون ہی کی رہتی ہے، صرف حکمی ملکیت دائن (قرض دہندہ) کو رہ جاتی ہے، ہمارے نزدیک ہمارے اختیار کردہ موقف کے درست ہونے کے لئے اتنی ہی بات بہت کافی ہے، جبکہ اس کی موافقت میں خلیفہ راشد عمر بن خطابؓ اور متعدد صحابہؓ کے آثار منقول ہیں، بلکہ درحقیقت انہیں آثار صحابہ کی روشنی میں ہی ہم نے موقف مذکور اختیار کیا ہے۔

ہمارے اختیار کردہ موقف کی صورت میں قرض کی وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے وجوب زکوٰۃ کے معاملہ میں کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۶- سرکاری ملازم کو ریٹائرڈ ہونے پر اس طرح کی جو رقم ملیں، ان رقم کی وصولیابی کے بعد ان میں حسب ذیل تفصیل کے مطابق ہمارے نزدیک اس طرح کے سرکاری ملازم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ملازمت جو انٹ کر کے بعد سرکاری ملازم کی مقررہ تنخواہ سے ماہ بہ ماہ وضع ہونے والی رقم اور اس پر سرکاری اضافہ کردہ رقم مجموعی طور پر جب نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے تو اس پر جولان حول ہونے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اور جوں جوں ماہ بہ ماہ جمع ہوتے رہنے والی رقم میں اضافہ ہوتا جائے گا، سال بسال علی الحساب مقدار زکوٰۃ میں اضافہ ہوتا جائے گا، مگر اس طرح کے سرکاری ملازم کے اوپر واجب ہونے والی زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جس وقت اسے سرکار سے رقم وصول ہو جائے، وصول ہونے کے پہلے ملازم پر اس کی ادائیگی واجب نہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک رقم مذکورہ سرکار کے پاس ملازم کی رضامندی سے بطور امانت اس طرح محفوظ ہیں جن پر تصرف کا اختیار وصول ہونے سے پہلے ملازم کو حاصل نہیں، اگر ملازم کو اس پر اس طرح کا حق تصرف حاصل ہو کہ جب چاہے سرکار سے وصول کر کے تصرف کر سکتا ہے، تو سال بسال اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی ملازم پر واجب ہوگی۔

مذکورہ بالا دونوں قسم کی رقم (یعنی ملازم کی تنخواہ سے وضع شدہ رقم اور اس پر سرکاری اضافہ کردہ رقم) پر سرکاری کمپنی انٹرسٹ کے نام پر جو اضافہ جوڑ کر ریٹائرمنٹ کے بعد ملازم کو دیتی ہے اس بابت وضاحت کی جائے کہ سرکاری کمپنی وہ اضافہ کس بنیاد پر اور کیوں کرتی ہے؟ اس وضاحت کے بعد ہی ہم اس کے جواب پر غور کر سکیں گے۔

### دوسری شرط نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

کسی مال میں وجوب زکوٰۃ کے لئے نما کا پایا جانا شرط ہے ”نما“ کے لفظی و لغوی معنی بڑھوتری، بڑھنا ہیں، اس لئے غیر نامی اموال (جن اموال میں بڑھوتری نہ ہو) میں زکوٰۃ فرض

نہیں، شریعت میں اموال نامیہ کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ ان اموال میں ”نما“ بالفعل پایا جائے جیسے پالتو چوپائے، جانور بذات خود چھوٹے سے بڑے ہوتے اور کم وزن سے زیادہ وزن والے ہوتے اور دودھ اور بچے دیتے ہیں، اور زرعی زمین و باغات کی پیداوار زرعی زمین و باغات سے فصل حاصل ہوا کرتی ہے، ان دونوں چیزوں میں پایا جانے والا بالفعل نامیہ اور قدرتی ہوا کرتا ہے، اموال تجارت بھی اموال نامیہ ہیں، ان میں پایا جانے والا ”نما“ بھی بالفعل ہوا کرتا ہے، مگر وہ بالفعل نامیہ قدرتی و طبعی نہیں ہوتا بلکہ کسی ہوتا ہے، اموال تجارت والے بالفعل نما کو خوقر آن مجید نے کسی کہا ہے، چنانچہ فرمایا:

”یا ایہا الذین آمنوا أنفقوا من طیبات ما کسبتم و مما أخرجنا لکم من الأرض“ (الآیۃ سورۃ البقرۃ: ۲۶۷)۔

نما کی دوسری قسم تقدیری کہلاتی ہے جن کو آدمی چاہے تو بڑھا سکتا ہے اور نہ چاہے تو وہ بڑھ نہیں سکتے، جیسے سونا چاندی کی وصات یا ان کی مصنوعات اموال نامیہ کی نما میں قدرتی یا غیر قدرتی قسم کی ایسی رکاوٹ ہو سکتی ہے جن کی بنا پر زکوٰۃ کا وجوب ساقط ہو سکتا ہے، اس کی تفصیل مطولات میں ہے (فقہ الزکاۃ وملتزم ضاوی ۹۷/۹۰)۔

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ سے زیادہ ہونا ہے

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول اور شرعی دائرہ وحدود میں رہتے ہوئے ہر آدمی کے معیار زندگی کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط مال کا دین سے محفوظ ہونا

ہمارے نزدیک مدیون پر دین کی زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ مال دین نصاب زکوٰۃ کو پہنچ رہا ہو اور اس پر حولان حول ہو جائے، جب تک دین مدیون پر برقرار رہے تب تک سال بسال اس

کی زکوٰۃ مدیون پر واجب ہوگی، دین ہی سے جتنا حصہ معاہدہ کے مطابق تسطواریا بلا معاہدہ کے ادا کرنا جائے اتنے حصہ کی زکوٰۃ مدیون کے ذمہ سے ساقط ہوتی جائے گی قرض دینے کے بعد قرض و ہندہ پر قرض میں دیئے گئے مال کی زکوٰۃ اس تفصیل کے مطابق نہیں واجب ہوگی جس کا ذکر و جوہ زکوٰۃ کی پہلی شرط سے متعلق سوالات کے جوابات میں سول نمبر ۵ کے تحت گزشتہ تحریر میں آچکا ہے۔

اسلام میں کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے؟ چند اور سوالات

کمپنیز پر زکوٰۃ: کسی کمپنی میں متعدد شرکاء ہیں اور ان میں ہر شریک نے اپنے اپنے حصے کا مال جمع کر رکھا ہے اور اس مال پر اس شریک کا ملک تام صادق آتا ہے اور وہ مال اتنا ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اس شریک پر اپنے حصہ والے مال میں زکوٰۃ واجب ہے، اگر اس مال پر شریک کا ملک تام صادق نہ آتا ہو تو اس مال میں شریک پر زکوٰۃ نہیں واجب ہے اور جس شریک کا مال اتنا نہیں ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اس شریک پر زکوٰۃ نہیں واجب ہے خواہ اس پر ملک تام صادق آئے، اور کمپنی کے اوپر مختلف حصہ داروں کے جمع شدہ مال میں زکوٰۃ قطعاً واجب نہیں، بشرطیکہ کمپنی کی حیثیت مدیون و مقروض کی طرح نہ ہو، اگر کمپنی ایسی ہے جو مختلف حصہ داروں کے جمع کردہ مال کی معنوی طور پر مقروض مدیون ہو تو نصاب زکوٰۃ پورا ہونے کی صورت میں حوالان حول پر کمپنی کے اوپر زکوٰۃ اس وقت تک واجب رہے گی، جب تک اس سے قرض دار ہونے کا وصف ختم نہیں ہوتا۔

ہیرے اور جواہرات

جن ہیروں اور جواہرات کی تجارت ہو رہی ہو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو لوگ انکم ٹیکس اور سرکاری قوانین نیز شرعی زکوٰۃ سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں لاکھوں، کروڑوں روپے کی مالیت پر مشتمل سرمایہ محفوظ کرنے کی بجائے ہیرے جواہرات خرید

کر محفوظ کر دیتے ہیں شرعاً و قانوناً وہ بہت بڑے مجرم ہیں، ہمز او تعزیر کے طور پر ان سے وہ ہیرے جوہرات چھین کر بحق سرکار ضبط کر لئے جائیں، اگر کسی بھی وجہ سے ان مجرموں سے یہ ہیرے و جوہرات چھینے نہ جاسکیں تو وہ بہر حال عند اللہ بہت بڑے مجرم اور حقوق اللہ اور حقوق العباد نہ ادا کرنے کے مرتکب ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ سمجھے گا، ہو سکتا ہے کہ دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ انہیں ان کے جرم کی کوئی سزا دیدے اور آخرت کی سزا تو متعین ہے بشرطیکہ وہ توبہ اور رجوع الی اللہ کے بغیر فوت ہوئے ہوں، اس طرح کے شرعی مجرموں کو سزا کی طرح اس طرح چھوڑ دیا جائے جس طرح بہت سارے زنا کار، شراب خوار، چور و قاتل بغیر کسی مواخذہ کے دند ماتے پھر رہے ہیں، اس کے علاوہ آخر ہمارے لئے چارہ کار کیا ہے، ہم شرعی مانع کی وجہ سے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں قرار دے سکتے۔

محض زیب و زینت کے طور پر حد اعتدال کے اندر ہیرے اور جوہرات و زمرود کے استعمال کے لئے یا کبھی کبھار حسب مواقع استعمال کے لئے خواتین یا مرد کرتے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں اور حد اعتدال سے زیادہ کسی بھی مقصد سے خواتین یا مردوں کا اپنے ملک میں رکھنا بھاری جرم ہے، ایسی صورت میں وہی طریق عمل اختیار کیا جائے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اعتدال کا معیار، احوال و ظروف کو ملحوظ رکھتے ہوئے عادل اہل نظر و اصحاب بصیرت مقرر کریں گے۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ و تصرف میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے لئے اس کی مالیت کا حساب ادائیگی زکوٰۃ کے وقت کے نرخ سے کیا جائے گا، اس کا تاجر اگر اسے تھوک بھاؤ سے فروخت کرنے کے اصول پر عمل پیرا ہے تو تھوک بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اور اگر پھٹکر بھاؤ سے فروخت کرتا ہے تو پھٹکر بھاؤ کا اعتبار ہوگا اور اگر دونوں سے فروخت کرتا ہے تو دونوں کا علی الحساب

اعتبار ہوگا۔

کمپنی سے خرید کر لئے گئے شیئرز میں زکوٰۃ شیئرز خریدنے والے پر واجب ہے کیونکہ معنوی طور پر شیئرز مال ہیں، نصاب زکوٰۃ تک پہنچنے اور حوالان حول ہونے کی صورت میں ان کی زکوٰۃ ان کے خریدار پر واجب ہے۔

جس مال کے ذریعہ کمپنی سے شیئرز خریدنے والا شیئرز خریدتا ہے وہ مال معنوی طور پر خریدار کمپنی کو مضاربت یا شرکت تجارت کے لئے دیتا ہے جس کی نفع میں شیئرز کا خریدار حصہ دار ہوتا ہے یعنی کہ اس نے اپنا یہ مال مضاربت والی تجارت میں لگا دیا ہے، دریں صورت مال مذکور کے عوض اسے جو شیئرز ملا ہے اور وہ اس شیئرز کو موقع ملنے پر فروخت کر دیا کرتا ہے تو اس طرح کا کاروبار شرعاً ناجائز و ممنوع ہے کہ آدمی جس مال کے عوض شیئرز خریدے وہ مال معنوی طور پر خریدار کی طرف سے مضاربت میں لگا رہے، اس کے باوصف اسی مضاربت والے مال کے عوض اسے جو شیئرز ملا ہوا ہے اسے بھی وہ فروخت کا حقدار بنا رہے، خریدی ہوئی چیز خریدار کے ملک میں اس طرح آجاتی ہے کہ جس چیز کے عوض اس نے وہ چیز خریدی ہے اس عوض پر اس کی کسی طرح کی ملکیت باقی نہیں رہ جاتی اور شیئرز والا معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لئے یہ کاروبار فی نفسه ناجائز و ممنوع ہے، دریں صورت ہم یہ عرض کرنے سے قاصر ہیں کہ شیئرز میں کس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جب ہم اس معاملہ میں کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں تو اس کے بعد والے دوسرے سوال کے جواب سے اور بھی زیادہ قاصر ہیں آخر شیئرز زکوٰۃ کس کی ملکیت قرار دیا جائے اور جس مال کے عوض شیئرز خریدے جائیں اسے کس کی ملکیت مانا جائے۔

بونڈس سے متعلق سوال کے سلسلہ میں عرض ہے کہ بونڈس والی رقم جب قرض دہندہ کو واپس ملے گی تو اس میں قرض دہندہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جب کہ واپسی کے بعد اس رقم پر حوالان حول ہو جائے جتنی مدت تک وہ رقم سرکار یا کمپنی کے پاس رہے اس کی زکوٰۃ قرض دہندہ پر نہیں



واجب ہوگی۔

### مخبر ثانی - نصاب زکوٰۃ

ہمارے نزدیک چاندی اور سونے کی وصالتوں کے علاوہ دوسرے اموال میں زکوٰۃ دینے کے لئے چاندی والا نصاب سونے والے نصاب کے بالمقابل اصل قدر دینیے جانے میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے، عہد نبوی و عہد صحابہ میں بھی چاندی و سونے کے نرخ میں اچھا خاصا فرق رہا کرتا تھا اگرچہ آج دونوں کے نرخ میں عہد نبوی اور عہد صحابہ والے فرق سے زیادہ فرق پیدا ہو گیا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں اللہ و رسول کے احکام پر مشتمل زکوٰۃ سے متعلق جو تحریری فرمان عمل کے نام دربار خلافت سے جاری کیا تھا اس میں صراحت ہے کہ جس آدمی پر بنت مخاض یا ابن مخاض (اونٹنی کا جو بچہ سال بھر کا ہو کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو) زکوٰۃ میں فرض ہو اور اس کے پاس بنت مخاض یا ابن مخاض نہ ہو، بلکہ اس کے پاس بنت لبون یا ابن لبون ہو (اونٹنی کا جو بچہ دو سال کا پورا ہو کر تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو) تو اس سے ابن لبون یا بنت لبون لے کر ہم (چاندی کا سکہ یا اس کے مساوی چاندی) اسے واپس کر دیا جائے (عام کتب حدیث)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حدیث اور اس معنی کی دوسری احادیث سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ نقدین کے علاوہ دوسرے اموال میں زکوٰۃ دینے کے لئے اولیت کا مقام چاندی والے نصاب کو حاصل ہے، نیز حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی شدہ ایک حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال موجود ہو جس کی بنا پر وہ غنی قرار پاتا ہو، اس کے لئے دوسروں سے مانگنا قابل مواخذہ جرم ہے، اس پر آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آدمی کو کتنا مال غنی بنا دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پچاس درہم (چاندی کے سکے یا اس کے مساوی چاندی والا وصالت) یا اتنا سونا جو پچاس درہم کے مساوی ہو (رواہ ابوداؤد و الترمذی و النسائی و ابن ماجہ و الدارمی)۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اصل قراردینے میں آپ نے چاندی کو سونے کے بالمقابل اولیت کا درجہ دیا ہے، بنا بریں ہمارے نزدیک چاندی اور سونے کی وصاتوں کے علاوہ دوسرے اموال میں چاندی والے نصاب کو اصل قراردینا چاہئے، ایسا کرنے میں مستحقین زکوٰۃ کا زیادہ فائدہ ہوگا، اور ایجاب زکوٰۃ میں شریعت نے مستحقین زکوٰۃ کا فائدہ ملحوظ رکھا ہے، ان باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ چاندی اور سونے کی وصاتوں کے علاوہ دوسرے اموال میں زکوٰۃ دینے کے لئے چاندی والے نصاب کو سونے والے نصاب کے بالمقابل اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

اس سوال کی دوسری شق (یعنی کہ نصاب حرمت زکوٰۃ اور نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے یا سونے کے نصاب سے؟) کا جواب ہماری مذکورہ بالا تحریر سے ظاہر ہے، یعنی نصاب موجب زکوٰۃ کی کم از کم مقدار سونے اور چاندی کی وصاتوں کے علاوہ دوسرے اموال میں چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے اور نصاب حرمت زکوٰۃ کا بھی وہی معاملہ ہوگا، یعنی کہ پچاس درہم چاندی یا اس کے مساوی مال جس کے پاس ہو وہ غنی ہے، اس کے لئے زکوٰۃ لیما جائز نہیں، مگر یہ عام حکم ہے، اس عموم سے احوال و ظروف کے پیش نظر استثناء و تخصیص کی گنجائش ہے، مثلاً ایک فرمان نبوی یہ صادر ہوا ہے کہ: "ولا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی" (رواہ الترمذی و ابوداؤد و الدارمی و احمد و النسائی و ابن ماجہ)۔

اس فرمان میں کہا گیا ہے کہ غنی کے لئے صدقہ لیما حائل نہیں، مگر عالمین زکوٰۃ و مجاہدین اگر غنی بھی ہوں تو دوسرے نصوص کی بنیاد پر زکوٰۃ لے سکتے ہیں، اور اسی فرمان میں جو یہ مذکور ہے کہ "مرة سوی" نہٹے کئے صحت مند آدمی کے لئے زکوٰۃ حائل نہیں، اس کا مقتضی ہے کہ ایسا آدمی خواہ پچاس درہم چاندی یا اس کے مساوی مال سے کم رکھتا ہو تو اس کے لئے زکوٰۃ لیما حائل نہیں، جب خرچ چلانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

## محور ثالث - مصارف زکوٰۃ

۱- اس سوال میں مذکورہ دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ذمہ داران مدارس اپنی صوابدید سے نظم و نسق چلانے کے لئے موزوں و مناسب سمجھیں، ہمارے نزدیک اختیار کر سکتے ہیں اور دونوں میں سے ہر صورت مختلف مدارس اسلامیہ میں رائج بھی ہے، ہمارے نزدیک مہتمم مدرسہ بعض اعتبار سے زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے اور بعض اعتبار سے مستحقین زکوٰۃ کا۔

۲- زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے حساب و کتاب پر مقرر کئے گئے لوگوں کو تنخواہ و معاوضہ کا شرعی ثبوت تو ملتا ہے مگر کمیشن پر یہ کام کرنے کی کوئی مثال عہد نبوی اور عہد صحابہ قرون اولیٰ میں نہیں ملتی، اس لئے ہمارے نزدیک یہ طریق طریق اسلاف کے خلاف ہونے کے سبب تاہل اجتناب ہے، اگر طے شدہ کمیشن پر ہی کام نہ کرانے کی سبب مدارس کی آمدنی بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے تو اس کے اسباب و عوامل معلوم کر کے انہیں ختم کرنے کی عملی طور پر مخلصانہ کوشش کی جائے نہ کہ مدارس کی آمدنی کو زیادہ متاثر ہونے سے بچانے یا اسے بڑھانے کی غرض سے طریق اسلاف کے خلاف دوسرا راستہ اختیار کیا جائے۔

ہمارے نزدیک دینی اداروں کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کردہ افراد ”عاملین علیہا“ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

زکوٰۃ وصول کرنے کرانے کے لئے کمیشن کی صورت اختیار کرنی ہمارے نزدیک طریق اسلاف کے خلاف ہونے کے سبب نامناسب ہے، دریں صورت کمیشن کی شرح فیصد مقرر کرنے کے لئے کسی خاص حد کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

زکوٰۃ کے حساب و کتاب کے لئے مقررہ عملہ ہمارے نزدیک عاملین زکوٰۃ کے مفہوم میں داخل ہیں، اس کی کارکردگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جامعین کی رضامندی سے طے کیا جاسکتا ہے۔

## چند جدید مسائل زکوٰۃ سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا نعمت اللہ تاشمی ☆

### ملک تام

- ۱- ملک تام سے مراد جو رقبۃً ویداً مملوک ہو۔ (عالمگیری ۱۷۳)
- ۲- جس مال تجارت کی قیمت ادا کر دی گئی ہے، مگر اب تک قبضہ نہیں ہوا، قبل قبضہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

”ولا فیما اشتراہ لتجارة قبل قبضہ“۔

قبضہ کرنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے (عالمگیری ۱۷۲)۔

صاحب ”بحر“ نے بھی لکھا ہے کہ سنین ماضیہ کی بعد قبضہ زکوٰۃ ادا کرے گا (بحر ۲۰۸)۔

مگر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قاضی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (شامی ۷۲)۔

۳- بائع نے ثمن پر قبضہ کیا ہے وہ مالک ہو گیا، لہذا اس کی زکوٰۃ بائع پر ہے نہ کہ مشتری پر (بحر ۳۰۲)۔

۴- کرایہ پر دی گئی پیشگی رقم، اس رقم کا مالک، مالک مکان ہو گیا، لہذا اس کے ذمہ ہی زکوٰۃ واجب ہوگی (۱۶/۵)۔

### ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ

اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی، اس لئے کہ وہ بہ طور قرض کے دئے ہوئے ہے (۳۵/۲)۔

۵- مدارس میں جمع رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے ”فلا زکوٰۃ فی سوانم الوقف و الخیل المسبلة لعدم الملك“۔

۶- مال مخلوط میں مال حرام کی مقدار نکالنے پر بقدر نصاب بچتا ہے تو اس باقی مقدار میں زکوٰۃ واجب ہے (۳۵/۲)۔

### دین کی زکوٰۃ کس پر؟

دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، مدیون پر کسی حال میں بھی نہ ہوگی۔

وصولیابی اور عدم وصولیابی کے اعتبار سے دین کے اقسام:

۱- جس کا مدیون اقرار کرتا ہو۔

۲- جس کا مدیون انکار کرتا ہو، مگر دائن کے پاس شہادت موجود ہے۔

۳- مدیون انکار کرتا ہے اور دائن کے پاس شہادت موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں میں مدیون کے اندر دین کی ادائیگی کی استطاعت ہے یا استطاعت نہیں ہے اور معسر ہے، ابتدا علماء احناف صرف اس دین کو جس کا مدیون انکار کرتا ہے اور کوئی شہادت بھی دائن کے پاس نہیں ہے اس کو مال ضمار کے حکم میں کہتے تھے، مگر حالات کی تبدیلی سے اس کو بھی مال ضمار کے حکم میں کہنے لگے جس پر شہادت موجود ہو، اس لئے کہ عدالت کے ذریعہ

قرضہ وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اس کے بعد حالات میں اور زیادہ تبدیلی آئی کہ آدمی قمار بھی کرتا ہے اور دین کی ادائیگی پر تیار بھی ہے پھر بھی نال منول کرتا ہے اور ادا نہیں کرتا ہے اور دائن کے لئے وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے جس کی بناء پر بعض فقہاء احناف نے دین کی صرف دو قسمیں قرار دیں:

۱۔ جس دین کی وصولیابی کی بالکل امید نہیں یا امید ضعیف ہے۔

۲۔ جس دین کی وصولیابی کی امید قوی ہے۔

جس دین کی وصولیابی کی امید قوی ہے اگر وہ دین قوی ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر دین متوسط ہے یا ضعیف ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور دین کے ملنے کی امید بھی نہیں یا ضعیف امید تھی اگر وہ مل جائے تو وہ مال مستفاد کے حکم میں ہوگا۔

### پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

ملازمت کی وجہ سے اجرت کا استحقاق ہے، مگر جب تک قبضہ نہ کرے ملک تام حاصل نہیں ہے، بلکہ عند الاحناف یہ دین متوسط ہے، لہذا دین متوسط میں صحیح روایت کی بنا پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہے۔

### نامی کی حقیقت

نمو، بمعنی بڑھوتری، نمو حقیقی تو والد و تناسل یا تجارت کی شکل میں نمو تقدیری نمو اور اضافہ کرنے پر قدرت کا ہونا، بایں طور کہ وہ مال خود اس کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو (نمای ۷۴)۔

حقیقتہً نمو و اضافہ مراد نہیں ہے (بدائع ۱۱/۲)۔

## حوائجِ اصلیہ کی تعریف

جس کے بغیر زندگی بسر کرنا دشوار ہو (دیکھئے مٹا ۶/۲)۔

انسان کی بہت سی ضرورتیں ہیں اور موجودہ دور میں بہت سی غیر ضروری چیزوں کو لوگوں نے اپنے طور پر ضروری کر لیا ہے، مگر زکوٰۃ کے سلسلہ میں حوائجِ اصلیہ سے مراد وہی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو، حوائجِ اصلیہ میں حالات کے اعتبار سے اور اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے والے کی حیثیت کے اعتبار سے کمی بیشی ہو سکتی ہے۔  
چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا۔

## کون سا دین مانعِ زکوٰۃ ہے

ہر اس دین سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ آدمی کی طرف سے ہو وہ دین حقوق اللہ کے قبیل سے ہو، جیسے زکوٰۃ، یا حقوق العباد کے قبیل سے ہو، پھر دین منجمل ہو یا دین مؤجل ہو، چونکہ دین کی ادائیگی حوائجِ اصلیہ میں داخل ہے، زکوٰۃ کے وجوب کے لئے حوائجِ اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے، اس لئے مدیون ہوتے ہوئے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔  
یہی قول امام مالک اور احمد کا بھی ہے، مگر امام شافعی کے یہاں زکوٰۃ کے وجوب کے لئے دین سے محفوظ ہونا شرط نہیں ہے۔

## طویل الاجل قرضوں کا حکم

موجودہ دور میں زراعتی یا کارخانہ قائم کرنے کے لئے بڑی رقمیں حکومت سے لی جاتی ہیں اور اس سے خوب نفع بھی کمایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہ کے قول پر ہر طرح کے دیون کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس بقدر نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔  
مگر جب اس طرح کے قرضوں کا عام رواج ہو جائے اور ان دیون کو مانعِ زکوٰۃ قرار دیا

جائے تو زکوٰۃ کی وصولیابی بہت زیادہ متاثر ہوگی، شرعاً یہ بات مشروعیت زکوٰۃ کی حکمت کے منافی ہے، اس لئے تجارتی دین کو حوائجِ اصلیہ میں شمار کرنا مشکل ہے، اگر امام شافعی کا قول لیا جائے تو اس سے مالک کا ضرر و نقصان ہے، اس لئے اگر درمیانی شکل نکالی جائے، جیسے بعض فقہاء نے دین مہر میں مغل اور مؤجل کی تفریق کی ہے تو مناسب ہوگا، لیکن اس میں اجتماعی فیصلہ معتبر ہوگا، انفرادی رائے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں یا تو ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے یا پھر امام شافعی کے قول پر حالات کی بنا پر فتویٰ دیا جائے۔

### کمپنی پر زکوٰۃ

اقتصادی تجارتی ترقی کے ساتھ شرکت کی ایک قسم وجود میں آئی ہے، جس میں خود کمپنی کو ایک شخص حکمی قرار دیا جاتا ہے اور کمپنی کے لئے ذمہ ثابت کیا جاتا ہے اور کمپنی کا یہ ذمہ شرکاء کے ذمہ سے الگ ہوتا ہے، فقہاء نے اگرچہ اس لفظ کو استعمال نہیں کیا ہے، مگر بہت سے ایسے احکامات بیان کئے ہیں جو شخص حکمی کے نظریہ پر منطبق ہیں۔

مثلاً مسجد اور اسی طرح دیگر ادارے کے لئے وصیت کرنا راجح قول کے مطابق بلا تفصیل صحیح ہے، ہشامی میں ہے: ”ینبغی أن یفتی لصحة الوصية للأزهر ویصرف لطلبته كما یقضى به العرف“۔

اوتاف کے لئے حقوق ثابت ہوتے ہیں اس طرح اوتاف پر دوسروں کے حقوق ثابت ہوتے ہیں اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے اور وقف کی ضروریات کے لئے متولی سامان خریدتا ہے اور وقف سے اس کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور ضرورت کے وقت وقف کا متولی تاضی کی اجازت سے وقف کے لئے قرض لیتا ہے تو خود وقف مقروض ہوتا ہے، اسی طرح خود حکومت کو شخص حکمی قرار دے کر اس پر احکامات متفرع کئے جاتے ہیں۔



چونکہ اموال زکوٰۃ میں احناف کے یہاں ”خلطۃ اشیوع“ اور ”خلطۃ الجوار“ کسی کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا، دیگر ائمہ موسیٰ کی زکوٰۃ میں خلطۃ اشیوع جس کو وہ حضرات خلطۃ الاعیان سے اور خلطۃ الجوار جس کو وہ حضرات خلطۃ الاوصاف سے تعبیر کرتے ہیں، دونوں طرح کی خلطۃ کا کچھ شرائط کے ساتھ اعتبار کرتے ہوئے اس کو شخص حکمی قرار دیتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ کو واجب کہتے ہیں۔

موسیٰ کی زکوٰۃ کے علاوہ اموال تجارت وغیرہ میں خلطۃ اشیوع یا خلطۃ الجوار کا اعتبار کرنے میں اختلاف ہے (دیکھئے: معنی لابن قدامہ ۶۱۹/۲)۔

حضرت امام شافعی کے یہاں صحیح قول کے مطابق موسیٰ کے علاوہ دیگر اموال میں خلطۃ کا اعتبار ہے (دیکھئے: شرح المہذب ۲۵/۵)۔

مگر خلطہ کے تحقق کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سب شرکاء مسلمان ہوں (معنی ۶۰۹/۲، شرح المہذب ۲۳۳/۵)۔

اس بنا پر اگر کمپنی کے تمام شرکاء مسلمان ہوں تو شوائع کے قاعدہ کے مطابق کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ بعض شرکاء کا حصہ انفرادی طور پر مقدمہ انساب نہ ہو اور جب کمپنی زکوٰۃ ادا کر دے تو اس کے شرکاء کو الگ سے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالنی ہوگی، اگر کمپنی کے تمام شرکاء مسلمان ہوں تو سہولت کے پیش نظر امام شافعی کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اگر تمام شرکاء مسلمان نہیں ہیں، بلکہ کچھ غیر مسلم ہیں تو سب ائمہ کے نزدیک ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی الگ الگ زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔

### ہیرے جو اہرات پر زکوٰۃ

ہیرے اور جو اہرات کو زینت کے لئے اور کسی غیر تجارتی مقصد کے لئے خرید رکھا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال نامی ہونا شرط ہے، چاہے حقیقتہ نامی ہو یا تقدیراً، اور یہ مال نامی نہیں ہیں اور حوائج اصلیہ میں بھی داخل نہیں ہیں، مگر زکوٰۃ کے

وجوب کے لئے حوائجِ اصلیہ سے زائد کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا نامی ہونا بھی شرط ہے، حوائجِ اصلیہ سے زائد ہونے کا اثر زکوٰۃ لینے پر پڑے گا (نمای ۸/۲)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ نرخ کا تعین

سامان تجارت میں نرخ کے تعین میں اپنی لاگت کا اعتبار نہیں، بلکہ بازار بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اس لئے اگر نرخ کم ہو گیا اور لاگت کا اعتبار کیا جائے تو مالک کا ضرر و نقصان ہے اور اگر نرخ بڑھ گیا تو لاگت کا اعتبار کرنے میں لازم آتا ہے کہ صرف اس المال کی زکوٰۃ ادا کرے، جبکہ رأس المال اور نفع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے تو کس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا؟۔

امام صاحب کے بیان کے مطابق حوالان حول کے وقت کا اور صاحبین کے بیان کے مطابق جس دن زکوٰۃ ادا کرے گا اس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

### نرخ میں تھوک کا اعتبار ہوگا، یا پھٹکر کا؟

انفع للمفقراء کا اعتبار کیا جائے، جیسا کہ نصاب کے سلسلے میں فقہاء نے اعتبار کیا ہے یا جس طرح کی تجارت کرتا ہے، اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کا اعتبار کرے اور اگر پھٹکر فروش ہے تو پھٹکر کا اعتبار کرے، نقد قیمت کا اعتبار ہوگا اور حصار قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔  
بوئذ زوین قوی کے قبیل سے ہے، اس لئے سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیرز کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ تجارتی کمپنیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، بعض میں پورا حصہ مال نامی ہوتا ہے، بعض میں کچھ غیر نامی کی شکل میں ہوتا ہے اور کچھ نامی شکل میں، جو نامی ہے اسی پر زکوٰۃ ہے، اور غیر نامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، حصص بنفسہ نامی نہیں ہیں، ہاں اگر حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدتا ہے تو خود حصص مال تجارت ہوں گے، ورنہ مال تجارت کے قبیل سے نہیں ہوں گے۔

### پورے حصص یا حصص کے کچھ حصہ پر زکوٰۃ

حنفیہ کے اصول کے مطابق اس کے حصہ میں جتنا حصہ کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں صرف ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جتنا حصہ نقد رقم یا مال تجارت کی شکل میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس نے حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدا ہے تو کل حصہ مال تجارت ہو گیا ایسی صورت میں کل حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### نصاب زکوٰۃ

زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال نامی اور حوائجِ اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ مقدارِ نصاب کا مالک ہونا بھی ہے، تاکہ زکوٰۃ نکالنے پر مالک کو کسی طرح کا ضرر و نقصان نہ ہو جو قابلِ اعتبار ہو، سونے چاندی دونوں کو جب شریعت نے معیار قرار دیا ہے تو خواہ مخواہ کسی ایک کو قرار دینا بے دلیل ہوگا، تفاوت کی صورت میں اموال زکوٰۃ کی قیمت میں چاندی کے نرخ کا اعتبار کیا جائے یا سونے کا یہ مسئلہ روح شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بہت پہلے طے کر دیا ہے (معنی ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶)۔

### مہتمم مدرسہ کی حیثیت

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا بھی وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ کا بھی جس کی وجہ سے زکوٰۃ دینے والوں نے سفراء کو زکوٰۃ دی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، جیسے حکومت اسلامی کے صدق و ساعی کو زکوٰۃ دیتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اس لئے کہ امیر المؤمنین اور اس کے واسطے سے عالمین مستحقین زکوٰۃ کے وکیل ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے حضرت مولانا تھانوی کو اسی طرح کا جواب لکھا تھا جس پر وہ بھی مطمئن ہو گئے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے بھی اس طرح لکھا ہے کہ مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ ہوتے ہیں، جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم

کا ہوتا ہے، پس جو شیء مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ طلبہ کا قبضہ ہے اسی کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکالا اور ملک طلبہ کی ہوگئی، اگرچہ وہ مجہول الکفایت والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے۔

### طلبہ پر فیس مقرر کرنا اور اس کو مد زکوٰۃ سے ادا کرنا

طلبہ پر کمرہ کرایہ، تعلیمی فیس، بجلی کی اجرت اور طعام کی قیمت مقرر کر کے ان کے ذمہ اس کو لازم کرنا درست ہے اور جب طلبہ مدیون ہو جائیں تو ان کے دین کو مد زکوٰۃ سے ادا کرنا بایں طور کہ ان کو مد زکوٰۃ سے مقررہ روپیہ دیا جائے اور وہ مدرسہ میں داخل کریں، صحیح اور درست ہے اور بہت سے مدارس میں اس طرح کا نظم پایا جاتا ہے، البتہ مہتمم مدرسہ اور خود بدون طلبہ کے وکیل بنائے ہوئے ادا کرے گا تو وہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، بلکہ طلبہ باقاعدہ مہتمم مدرسہ کو وکیل بنائیں کہ آپ ہماری طرف سے ہمارا مقررہ وظیفہ وصول کر کے ہمارے دین میں محسوب کر لیں تو صحیح ہوگا۔

نوٹ: ابتداء میں مہتمم مدرسہ کو مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کیا گیا ہے، مگر اس میں کسی طالب علم کا تعین نہیں ہے، اس لئے اس وکالت کی بنا پر طلبہ پر مدرسہ کا کوئی متعین حق ثابت نہیں ہوتا ہے، ہاں جب مدرسہ باقاعدہ طلبہ کا وظیفہ مقرر کرے اس وقت لڑکوں کو استحقاق حاصل ہوگا، اس لئے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لئے طلبہ باقاعدہ وکیل بنائیں، اس لئے اس وکالت کی بنیاد پر طلبہ کا وظیفہ بہ مد زکوٰۃ مقرر کرے تو اس وقت میں زکوٰۃ کا استحقاق ہوگا، اس لئے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لئے باقاعدہ وکیل بنانا ضروری ہوگا۔

### سفراء مدرسہ کو مد زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

جب مہتمم مدرسہ کو مثل امیر مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کر لیا گیا تو محصلین و سفراء و عاملین میں داخل ہوں گے اور ان کو ان کی کارکردگی کے مطابق مد زکوٰۃ سے بہ طور عمالہ دیا جاسکتا ہے، مگر

---

ان کی وصول کردہ زکوٰۃ میں سے نصف سے زائد دینا جائز نہ ہوگا اور جب یہ بطور اجارہ نہیں ہے،  
بطور عمالہ ہے تو کمیشن بھی صحیح ہوگا۔

حساب لکھنے والوں کو ان کی کارکردگی کے بقدر مدد زکوٰۃ سے دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ  
وہ بھی عاملین کے حکم میں ہیں۔

## زکوٰۃ کے شرعی احکام

مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی ☆

زکوٰۃ کے احکام سے متعلق سولہ سوالات پر مشتمل سوالنامہ کے جو ابواب اختصار کے ساتھ بالترتیب ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

۱- شریعت اسلامی میں ملک تام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مالک کا قبضہ بھی ہو، لہذا اموال زکوٰۃ میں اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو اور مال اب تک مشتری کے قبضہ میں نہ آیا ہو تو چونکہ قیمت کی ادائیگی کے بعد بائع اس قیمت کا مالک بن گیا اور اس پر قابض بھی ہو گیا، اس لئے بائع کے ذمہ اس قیمت پر (نصاب و حولان حول کے بعد) زکوٰۃ واجب ہوگی اور مال چونکہ مشتری کے قبضہ میں نہیں آیا، کو مشتری اس کا مالک ہے، مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۲- کرایہ کی جو رقم پیشگی دی جاتی ہے اور فسخ یا مدت پوری ہونے کے بعد واپس کی جاتی ہے وہ رقم بطور وثیقہ کے رکھی جاتی ہے جس طرح شیء مرہون بطور وثیقہ رکھی جاتی ہے اور چونکہ

اس رقم پر ملک تام کسی کی نہیں ہے، کرایہ پر لینے والا اس رقم کا مالک تو ہے، مگر اس کا اس پر قبضہ نہیں ہے اور کرایہ پر دینے والا اس رقم کا مالک نہیں، البتہ قبضہ ضرور ہے، اس لئے اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (۲۶۳/۲)۔

۳- مدارس اور اداروں میں جو رقم آتی ہے ارباب مدارس مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے دکلاء ہیں، مالک نہیں ہیں، لہذا مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم میں ملکیت نہ پائے جانے کی وجہ سے ان رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں، نہ معطین کی طرف سے نہ آخذین کی طرف سے۔

۴- خالص مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ اس کا مالک معلوم ہونے کی صورت میں وہ مال روائی صاحب المال کے اصول کے پیش نظر واجب الرد ہے، اور اگر مالک معلوم نہیں تو کل مال واجب التصدق ہے، اور مال حرام جب مال حلال کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے تو وہ مستہلک ہو جاتا ہے اور استہلاک سے مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے، اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ اگر مال مخلوط میں سے بقدر مال حرام نکال کر نصاب تک پہنچتا ہے تو باقی مال پر، یعنی نصاب تک پہنچنے والے اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہیں پہنچتا ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں (دیکھئے: ۲۹۲/۲)۔

۵- دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر دین کی وصولیابی کی امید ہو تو پھر دین کے تین درجے ہوں گے (۱) دین قوی، (۲) دین متوسط، (۳) دین ضعیف:

دین قوی وہ دین کہلاتا ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے بدلہ میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو، اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلہ میں واجب ہوا ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو، بلکہ ان کے علاوہ کوئی اور سامان ہو، اور دین ضعیف وہ دین کہلاتا ہے جو کسی

مال کے بدلہ میں مدیون کے ذمہ واجب نہ ہوا ہو، جیسے دین مہر، بدل خلع، میراث، وصیت وغیرہ۔

ان تینوں دیون کا حکم یہ ہے کہ دین قوی اگر بقدر نصاب ہے اور چالیس درہم پر دائن کا قبضہ ہو جائے تو اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، اور دین ضعیف پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ قبضہ ہونے کے بعد حسب ضابطہ زکوٰۃ واجب ہوگی، رہا دین متوسط کا حکم تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین متوسط میں صحیح روایت کے مطابق ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ وہ بقدر نصاب ہو۔

اگر مدیون کے ذمہ ایسا دین ہے جس کا طالب بندہ ہے جیسے قرض، زکوٰۃ، مال خراج، دین مہر وغیرہ تو مدیون کے اتنے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، جتنا مال اس کے ذمہ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر اس سے زائد مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس پر حسب ضابطہ شرعیہ زکوٰۃ واجب ہوگی، مدیون قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود اگر قرض ادا نہ کرے تو وہ مال مدیون کے ذمہ دین ہی میں مشغول سمجھا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر اس مشغول فی اداء الدین مال کو تجارت میں لگائے اور اتنا نفع ہو کہ دین کی ادائیگی کے بعد بقدر نصاب مال، مدیون کے پاس بچتا ہو تو اس پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۶- پرائیویٹ فنڈ جو حکومت کے ذمہ واجب الادا ہے، ملازم اس رقم کا صرف استحقاق رکھتا ہے، اس رقم پر مالک و قابض نہیں ہوا ہے، اس رقم کو نہ تو دین قوی بنایا جاسکتا ہے، نہ دین متوسط، بلکہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ قبضہ میں آنے کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہذا پرائیویٹ فنڈ کی رقم کا بھی یہی حکم ہوگا۔



## ۷۔ حقیقت نما اور اس کی قسمیں

”نما“ کی حقیقت یہ ہے کہ مال ایسی حیثیت میں ہو کہ اس میں بڑھوتری اور زیادتی ہو سکے، خواہ وہ حقیقی ہو، جیسے توالد و تناسل و تجارت، یا تقدیری ہو، جیسے مالک کو اس مال کے بڑھانے کی قدرت ہو، خواہ وہ مالک کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نائب کے قبضہ میں رہ کر ہو، یا نمو خلقی ہو، جیسے سونا چاندی، اس میں چاہے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نمو فعلی ہو، یعنی سونا چاندی کے علاوہ دیگر سامان، اگر اس میں تجارت و اسامت اور عملاً ان چیزوں میں تجارت کی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ ان چیزوں میں تجارت کی نیت صراحتاً یا دلالتاً ہو (دیکھئے مانگیری ۱/۱۷۳)۔

## ۸۔ حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنی جان کو بلاکت اور بے عزتی سے محفوظ رکھ سکے، مان و نفقہ، رہائش کے لئے مکان، جنگ کے سامان، سردی، گرمی سے حفاظت کے لئے کپڑے، یہ حاجت اصلیہ حقیقی ہے، اس کے علاوہ دین حاجت تقدیری میں داخل ہے، کیونکہ مدیون اپنی جان دامن کے ہاتھ سے بچانے کے لئے اس کی ادائیگی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح آلات حرفت، متاع بیت، سواری کا جانور، علماء کے لئے کتابیں یہ چیزیں بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، لہذا اگر صاحب مال کے پاس اپنی حاجت اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد اتنا مال بچتا ہو جو بہ قدر نصاب ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی (دیکھئے: ۲۶۲/۲)۔

جب حاجت اصلیہ میں یہ بات اصل قرار پائی کہ انسان جس سے باسانی اپنی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کر سکے تو ہر دور اور ہر ماحول میں اپنی جان و عزت کی حفاظت کے لئے

جتنی مالیت کی حاجت ہو وہ حاجت اصلیت میں داخل ہوگی۔

۹- حکومت کی طرف سے جو قرض ملتا ہے، جس کی ادائیگی کے لئے کئی سال کی لمبی مہلت ملتی ہے، اور سالانہ ایک متعین مقدار قرض کی ادائیگی اس کے ذمہ رہتی ہے تو ان صورتوں میں اس کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے مدیون کے ذمہ پورا قرض منہا کرنے کے بعد اگر بقدر نصاب مال بچتا ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، سالانہ واجب الادا عسقط وضع کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، فقہی عبارت سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

۱۰- اگر کمپنی کی مجموعی مالیت بقدر نصاب ہو جائے اور شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے بعد کسی شریک کے حصہ میں بقدر نصاب مال نہ ہو تو اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر تقسیم کے بعد ہر شریک کے حصہ میں یا بعض شریک کے حصہ میں اتنا مال آتا ہو جو بقدر نصاب ہو تو ان شرکاء کے ذمہ اپنے اپنے حصوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، غرض کہ زکوٰۃ کے وجوب میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر شریک کے انفرادی حصے کا اعتبار ہوگا (دیکھئے: در مختار و ثامی ۳/۳۳۲)۔

۱۱- جو حضرات سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جوہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کرتے ہیں اگر خریدتے وقت دل میں یہ نیت ہو کہ آئندہ کبھی اس کو بیچ کر روپے حاصل کر لیں گے تو وہ مال تجارت میں شمار ہو کر اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ بنانے کی نیت سے ہیرے جوہرات جو شخص خریدتا ہے لازمی نیت اس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ فروخت کرے گا، صرف ہیرے جوہرات جمع کرنے کی نیت سے نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر کوئی محض جمع کرنے کی نیت سے خریدے، آئندہ انہیں فروخت کرنے کی کہیں دور تک بھی نیت نہ ہو یا یہ نیت ہو کہ آئندہ اگر کوئی مصلحت یا نفع سمجھوں تو فروخت کر دوں گا، ورنہ اسے گھر میں جمع رکھیں گے، خواہ وہ کتنی بھی مالیت کے ہوں، اس پر زکوٰۃ

واجب نہ ہوگی، اور خواتین تزئین کے لئے جو ہیرے جوہرات استعمال کرتی ہیں اس میں نہ حقیقتہً  
نمو ہے نہ دلالت، اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ”ولا زکوٰۃ فی الجواهر واللاالی إلا أن  
یتملکھا بنیۃ التجارۃ کسائر العروض“ (دیکھئے: مطاوی علی مرتا الخلاح، ۳۹۱)۔

۱۲- جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے سالانہ زکوٰۃ نکالتے وقت اس کی مالیت کا  
تعیین اس نرخ سے ہوگا جو زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں ہوگا، یعنی جس قدر نفع یا نقصان کے  
ساتھ بازار میں وہ سامان بکتا ہو اسی نفع یا نقصان کے ساتھ نرخ کا تعین کیا جائے گا، بازار کا بھاء  
خرید کی قیمت سے زیادہ ہو یا کم ”وعندہ تعتبر قیمتہ یوم الوجوب، قالاً: یوم الأداء  
الخ، ویوم فی البلد الذی المال فیہ“ (دیکھئے: درمنا روٹا، ۳۰۲)۔

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں چونکہ  
خریدتے وقت ان کی نیت تجارت کی ہوتی ہے، اس لئے وہ اراضی بھی اموال تجارت میں داخل  
ہوں گی اور ان کا حکم بھی یہی ہوگا، یعنی ان اراضی پر بازاری قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ان کی  
مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۱۳- اگر شیئرز کی قیمت نصاب کے بقدر، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت  
کے برابر پہنچ جائے، یا شیئرز کے علاوہ دیگر نقد روپے یا مال تجارت مل کر شیئرز ہولڈر نصاب کا مالک  
بن جائے تو اس کے ذمہ شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے، جس طرح اس کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہے،  
البتہ شیئرز کی قیمت میں چونکہ کمپنیوں کی مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ کی لاگت بھی شامل ہوتی  
ہے (اور درحقیقت ان چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں) اس لئے شیئرز کی زکوٰۃ نکالتے وقت کمپنی  
سے دریافت کر لیا جائے، جس قدر رقم شیئرز کی مشینری، مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے،  
شیئرز ہولڈر اتنی قیمت شیئرز کی کم کر کے زکوٰۃ نکالے، زکوٰۃ دیتے وقت شیئرز کی جو قیمت ہوگی وہی  
نکالی جائے گی ”کالمراہم والدنانیر یعینہما للتجارۃ بأصل الخلقۃ فتلزم الزکاۃ

کیف ما أمسکھما“ (۱۳/۲)۔

۱۴- فقہاء کرام نے چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، لہذا ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر کسی کے پاس مال ہو تو اس کو فنی قرار دیا جائے گا، اس کو زکوٰۃ پلیما جائز نہ ہوگا اور اس مال پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہاء کی تصریح کے پیش نظر اگر سونے چاندی کا نرخ برابر ہو تو کسی ایک کے نرخ کو اصلی قرار دیا جائے گا، اگر دونوں میں سے کسی ایک کے نرخ سے مال نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کا اعتبار ہوگا، غرض جس میں فقراء کا نفع ہو اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا ”فی عروض التجارة قیمته نصاب من ذهب أو ورق ای فضة مضروبة، فأفاد أن التقويم إنما يكون بالمسلوك عملاً بالعرف مقوماً بأحدهما، إن استویا فلو أحدهما أروج تعین التقويم به، ولو بلغ بأحدهما نصاباً دون الآخر تعین ما بلغ به ولو بلغ بأحدهما نصاباً وخمساً بالآخر أقل قومه بالأضع للفقير“ (۲۹۹/۲)۔

۱۵- اگر مدرسہ والے ہر طالب علم کو ماہانہ جو خرچہ بیٹھتا ہے، مثلاً ۲۵۰ روپے، وہ مذکوٰۃ سے مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو دے دیں اور ان کو یہ سمجھادیں کہ تم پر ماہانہ ۲۵۰ روپے خرچ بیٹھتا ہے، تم کو نقد کی شکل میں دیا جاتا ہے تم اس رقم کے مالک ہو، تم اپنے اختیار سے مدرسہ کے مطبخ میں جا کر اپنے کھانے کا وظیفہ جمع کر دو یا کسی اور دفتر میں جمع کر دو، طلبہ اس رقم کے مالک بننے کے بعد مدرسہ میں جا کر وہ رقم جمع کر دیں تو یہ صورت جائز رہے گی، زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور اس رقم کو تنخواہ و تعمیرات میں لگانا بھی درست ہوگا، لیکن یہ واضح رہے کہ محض ہیرا پھیری نہ ہو، بلکہ واقعی تملیک ہو جانی چاہئے۔

۱۶- مدارس کے جو چندہ کی رقم مدرسہ میں جمع کرتے ہیں، ان رقم میں سے فی صد کے حساب سے سفر اکو کمیشن دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ اجرت مجہول ہے، ماہانہ یا روزانہ، کوئی مقدار

---

اجرت کی مقررہ متعین نہیں، سفراء کو ”العاملین علیہا“ میں داخل کرنا درست نہیں، کیونکہ عاملین وہ لوگ کہلاتے ہیں جو اسلامی ملک میں اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات وغیرہ کے وصول کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے شرط یہ ہے کہ بلا کسی عوض فقراء کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور تنخواہ ایک عوض ہے، عاملین کے علاوہ کسی اور کو تنخواہوں کا بعد زکوٰۃ ادا کرنا صحیح نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی ”ولا تصح (أى الإجارة) حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة“ (ہدایہ ۲/۲۳۳، ۲۷۷)، ”وفى الدر المختار: وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين، وفى ردالمحتار: أما الأول فكقوله بكذا درهم أو دنانير“ (۳/۵)۔

## دیون کی زکوٰۃ کی تفصیل اور ان کے احکام

مولانا عبدالجلیل قاسمی \*

زکوٰۃ، سونا، چاندی، سامان تجارت اور سائزہ جانوروں میں واجب ہوتی ہے، ملک تام سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور اس سے انتفاع بھی ممکن ہو، علامہ کاسانی نے اس کو ملک مطلق سے تعبیر کیا ہے:

”وہو ان یکون مملوکا له رقبۃ ویدا“ (بدائع ۹/۲، ۵۹۷، ۲، لہنتی علی مجمع الانہر ۲/۱۹۳)۔

۱۔ مال تجارت جس کی قیمت پختگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے، اس میں زکوٰۃ تو واجب ہوگی، لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے ادائیگی واجب نہیں ہوگی، قبضہ میں آنے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، علامہ شامی نے ملک تام کے ضمن میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وخرج به أيضا كما في البحر، المشتري للتجارة قبل القبض“ (۲۶۰/۲)۔

پھر آگے درمختار کی عبارت:

”ولا فيما اشتراه للتجارة قبل قبضه“ (۲۶۰/۲)۔

پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”أما بعدہ فیزکیہ عما مضی“ (درمختار ۲/۲۶۳)۔

۲- کرایہ دار نے جو پیشگی رقم مالک مکان کو دیا ہے وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے اول یہ کہ وہ پیشگی کرایہ ہو، دوم یہ کہ وہ زر ضمانت ہو جو عقد اجارہ کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جائے گا، پہلی صورت میں اس کا مالک، مالک مکان ہوگا، اور اس کو ملک تام حاصل ہے، اس لئے اس قسم کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، گرچہ صاحب ”بدائع“ نے ایک قول کرایہ دار پر بھی وجوب کا نقل کیا ہے: ”ذکر الشیخ الإمام أبو بکر محمد بن الفضل البخاری فی الإجارة الطويلة التي تعارفها أهل بخاری أن الزکوٰۃ فی الأجرة المعجلة علی الأجر، لأنه ملکہ قبل الفسخ، وإن كان یلحقه دین بعد الحول بالفسخ، وقال بعض مشائخنا: إنه یجب علی المستاجر أيضاً، لأنه یعد مالاً موضوعاً عند الأجر“ (دیکھئے بدائع ۶/۲) مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

دوسری صورت میں چونکہ اس کا مالک کرایہ دار ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی، قبضہ پانے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، جس طرح دوسرے تمام دیون میں ہوگا۔ علامہ کاسانی نے بیع الوفاء کے ثمن پر بحث کرتے ہوئے بائع اور مشتری دونوں پر وجوب زکوٰۃ کو نقل کیا ہے، علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے اپنا رجحان صرف مشتری پر وجوب کی طرف ظاہر کیا ہے: ”قلت: ینبغی لزومها علی مشتری فقط علی القول الذی علیہ العمل الآن من أن بیع الوفاء منزل منزلة الرهن فیکون الثمن دیناً علی البائع“ (دیکھئے مٹا ۲/۲۶۱)۔

پہلی صورت کی تائید اس بحث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ شامی نے کیا ہے کہ اگر کسی عورت کا نکاح ایک ہزار درہم پر ہوا اور عورت نے اس پر قبضہ پالیا، اور اس پر سال گزر گیا تو اس

صورت میں عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگئی، اب اگر شوہر نے قبل الدخول طلاق دیدیا تو عورت نصف مہر شوہر کو واپس کرے گی، لیکن اس نصف کی زکوٰۃ اس سے ساقط نہیں ہوگی (دیکھئے: ۳۰۷/۳)۔

۳۔ جس مال کا کوئی مالک مہین نہ ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے:

”وہذا؛ لأن فی الزکات تملیکاً و التملیک فی غیر الملک لا

یتصور“ (بدائع الصنائع ۹/۳)۔

۴۔ جو مال کسی کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، وہ کل واجب التصدق ہے، تمام کا صدقہ کرنا واجب ہوگا نہ کہ ایک جزء (زکوٰۃ) کا، یعنی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ”فی القنیۃ: لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمہ الزکوٰۃ، لأن الكل واجب التصدق علیہ، فلا یفید إيجاب التصدق ببعضہ“ (دیکھئے: ۲۹۱/۳)۔

اگر یہ حرام مال اس کے حائل مال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ تمیز ممکن نہیں ہے تو حرام مال کے بقدر وضع کرنے کے بعد اگر باقی ماندہ مال نصاب کے برابر ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں ”من ملک أموالاً غیر طیبۃ أو غصب أموالاً و خلطها ملکھا بالخلط و یصیر ضامناً، وإن لم یکن له سواھا نصاب فلا زکوٰۃ علیہ فیھا، وإن بلغت نصاباً؛ لأنه مدیون و مال المدیون لا ینعقد سبباً لوجوب الزکوٰۃ عندنا، فأفاد بقولہ - وإن لم یکن له سواھا نصاباً الخ - أن وجوب الزکوٰۃ مقید بہا إذا کان له نصاب سواھا“ (۲۹۱/۳)۔

۵۔ دین کی زکوٰۃ بہر حال دائن پر ہوگی نہ کہ مدیون پر، مدیون کے مال منول کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کی جاسکتی، نہ دائن وجوب سے بری قرار دیا جاسکتا ہے، فقہاء نے دین کی جو تقسیم کی ہے، اس میں سے دین قوی اور متوسط کا اگر وصول پانا آج کل کے حالات کے اعتبار سے ممکن ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، جب وصول پائے گا تو گذشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا



کرے گا، اور اگر دین ضعیف ہو تو اس میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ پائے گا اس وقت اگر اس کے پاس نصاب ہوگا تو اس میں ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر اس کے علاوہ نصاب نہیں ہوگا، تو جب نصاب کے برابر وصول پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا، تو زکوٰۃ ادا کرے گا، اگر آج کل کے حالات کے اعتبار سے دین کا وصول پالینا ممکن نہ ہو، تو قبضہ سے پہلے کسی قسم کے دین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (۱۵ ی ۲۶۶/۲، ۳۳۲/۳)۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا مالک ملازم ہوتا تو ہے، لیکن وہ رقم اس کے لئے ممکن الاشفاق نہیں ہے اور اگر وہ چاہے تو اس رقم کو استعمال میں نہیں لاسکتا، البتہ اس رقم کی بنیاد پر اس کو قرض تو مل سکتا ہے جو پھر اس کی تنخواہ سے وضع ہو جائے گا، اگر وہی رقم اس کو ملتی جس طرح تنخواہ کا باقی حصہ ملتا ہے، تو پھر اس کے وضع کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لئے اس پر قبضہ پانے سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جس وقت قبضہ پائے گا اگر اس کے پاس اس کے علاوہ نصاب ہوگا، تو اس میں ضم ہو جائے گا، ورنہ جب نصاب کے برابر پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اس رقم کے سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحب نے ”بدائع“ کی لمبی عبارت نقل کرنے کے بعد پوری تفصیلی بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ دین ضعیف میں داخل ہے، قبضہ پانے کے بعد ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، حضرت تھانوی نے بھی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے، مفتی عزیز الرحمن صاحب بھی عدم وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں (امداد الفتاویٰ ۲/۳۳-۳۵، فتاویٰ دار العلوم ۳۳۱/۶-۳۳۲)۔

### دوسری شرط نما

”نما“ کا معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے، یہاں جانوروں میں تو والد و تناسل کے ذریعہ ہوتا ہے اور دوسری اموال میں تجارت کے ذریعہ، اسامہ، دودھ، گھی اور نسل کے حاصل ہونے کا

ذریعہ ہے، اور تجارت نفع کا سبب ہے تو سبب کو مسبب کی جگہ دی گئی ہے، جیسا کہ سفر، نکاح اور نوم کو مشقت و طی اور حدیث کے قائم مقام کر کے ان پر احکامات جاری کئے گئے ہیں، البتہ سونا، چاندی میں مطلقاً زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں تجارت کی نیت شرط نہیں ہے، اگر زیور کی کسی شکل میں ہو تو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی (دیکھئے: بدائع ۱۱/۲)۔

نصاب کے لئے نما حقیقی جو اسامہ یا تجارت کے ذریعہ ہے ضروری نہیں ہے، بلکہ نما تقدیری بھی نصاب کی تکمیل کے لئے کافی ہے (دیکھئے: مٹا ۲/۲۶۳، مجمع الانہر ۱/۱۹۳)۔

### تیسری شرط حاجت اصلیہ

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے جتنی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب حوائج اصلیہ میں داخل ہیں، مثلاً رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے، سواری کے جانور وغیرہ، آج کل سواری کے لئے جیپ کار اور موٹر سائیکل بھی حوائج اصلیہ میں داخل ہیں، ملک العلماء کی پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ نقدین کے علاوہ جو سامان بھی تجارت کے لئے بنے ہیں وہ حوائج اصلیہ میں داخل ہیں اور ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، میرے خیال میں ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے حوائج اصلیہ کا اعتبار کیا جائے گا (مٹا ۲/۲۶۲)۔

آج کے دور کے طویل المیعاد قرضے بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں گے۔

### کمپنی پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر شخص کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے نصاب کا مالک ہونا ضروری ہے جو نصاب کا مالک ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو مالک نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (دیکھئے: بدائع ۱۶/۲، مٹا ۲/۲۱۶)۔

پھر امام شافعی کا اختلاف اور دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”كل جواب عرفته في السوائم المشتركة فهو الجواب في الذهب والفضة وأموال التجارة“ (بدائع ۳۰/۲، ۳۰/۲، ۳۰/۲)۔

ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات کو اگر سرمایہ محفوظ کرنے کے لئے خریدا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو بیچ کر ضرورت پوری کی جائے گی، یعنی خریداری فخر و خشگی کی نیت کے ساتھ ہے تو یہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر استعمال کے لئے خریدا ہے تو سونے، چاندی کے علاوہ زیورات حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں یا نہیں؟، مختلف فیہ ہے، مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو حوائجِ اصلیہ میں داخل ہونا چاہئے۔

صاحب ”در مختار“ نے وضاحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات میں، اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

”لا زکوٰۃ فی اللالی والجوهر، وإن سارت الفأ اتفاقاً إلا أن تكون للتجارة“ (۲۷۳/۲)۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین اس دن کی قیمت سے کیا جائے گا، میرے خیال میں تھوک بھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا۔

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں اگر وہ زمین شہر میں ہے، عشری یا خراجی نہیں ہے تو وہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور قیمت کا تعین زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن کی قیمت سے کیا جائے گا اور علامہ کاسانی نے اس زمین کو اس

جانور پر قیاس کیا ہے، جو تجارت کے لئے ہوں، اگرچہ وہ سائمر ہوں، ”ولو سمیت للبیع والتجارة ففيها زكوة مال التجارة لا زكوة السائمة“ (بدائع ۳۰۴/۲)۔

### نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں وجوب اور ادائیگی دونوں میں ان کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا، یعنی اگر صرف سونا ہے تو جب تک ساڑھے سات تولہ نہیں ہوگا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً اگر صرف سات تولہ ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے اس کی قیمت سات سو تولہ چاندی کے برابر کیوں نہ ہو جائے، ایسے ہی اگر صرف چاندی ہے تو ساڑھے باون تولہ ہوگی تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع ۱۶۲/۲، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳)۔

اگر تجارت کا مال ہے تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر چاندی سے خریدی ہے تو چاندی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر سونا سے خریدی ہے تو سونا سے دام لگایا جائے گا، ورنہ جو سکہ شہر میں زیادہ رائج ہوگا، اس سے دام لگایا جائے گا، امام محمد فرماتے ہیں کہ بہر دو صورت شہر میں غالب رائج سکہ سے دام لگایا جائے گا، لیکن آج کے دور میں جب کہ چاندی اور سونے کا سکہ معدوم ہے۔ صاحبین کا قول تاہل عمل نہیں ہے، اس لئے امام ابو حنیفہ کے قول پر عمل ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ نفع للفقراء کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر سونا کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر چاندی کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا (دیکھئے بدائع ۲۱/۲، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰)۔

### شیئرز اور بانڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر وہ نصاب کے برابر ہو، لیکن شیئرز کا جو حصہ عمارات و آلات میں لگا ہوگا، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور

جو حصہ تجارت میں لگے گا اس پر اور اس کے نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر وہ شیئرز زیادہ میں فروخت ہوتا ہے تو اس حصہ کے بقدر جو تجارت میں لگا ہے اور نفع ہوا ہے اس میں تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور باقی حصہ عمارات و آلات کے مقابلہ اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً ایک شیئرز سو روپے کا تھا، اس میں سے بیس روپے عمارات و آلات میں لگے، اور باقی اسی روپے تجارت میں لگے اور پندرہ روپے نفع ہوا تو اب تجارت والی پونجی ۹۵ روپے ہوگئی اور اسی میں زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، اب اگر وہ شیئرز مثلاً دو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو ۹۵ روپے تو ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ایک سو پانچ روپے عمارات و آلات کے مقابلہ میں ہوگا اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ شیئرز ایک سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو بھی ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ۹۵ روپے ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور پانچ روپے عمارات و آلات کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بونڈس کی رقم دین قوی ہے، اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ قبضہ سے پہلے ادائیگی ضروری نہیں ہوگی، کیش کرانے کے بعد گذشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی۔

### مصارف زکوٰۃ

۱- زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک شرط ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ رقم طالب علم کے حوالہ کر دی جائے، پھر وہ کھانے کی قیمت، مکان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات ادا کرے گا، جس طرح مستطیع طلباء ادا کرتے ہیں، از خود مکان کے کرایہ اور اساتذہ کی تنخواہ میں خرچ کر دینا صحیح نہیں ہوگا، مدرسہ کا مہتمم زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے نہ کہ طلباء کا۔

۲- مدرسہ کے مصلحین کو زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور مدارس میں کمیشن پر وصولی کرانا جائز ہے یا نہیں یہ دوسری بحث ہے۔

---

جو لوگ اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہ، لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں وہی عامل ہیں اور ان کو زکوٰۃ کی مد سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے، اسلامی مدارس اور انجمنوں کے سفراء ان میں داخل نہیں ہیں اور ان کو زکوٰۃ سے تنخواہ دینا جائز نہیں ہے (سحارف القرآن مفتی محمد شفیع ۲/۳۹۹)۔

کمیشن پر وصولی کو فقہاء نے اجرت کے مچھول ہونے کی وجہ سے حرام کہا ہے، جواز کے لئے یہ وجہ دکھانا کہ تنخواہ پر وصولی کم ہوتی ہے اور کمیشن پر زیادہ یہ عذر لنگ ہے، وصولی میں کمی ذمہ داران مدرسہ کی آپسی چپقلش کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ خرابی کمیشن کا طریقہ اختیار کئے بغیر بھی دور کی جاسکتی ہے، مثلاً تنخواہ مقرر کئے جانے کے ساتھ وصولی کی ایک حد بھی مقرر کی جائے اور اس میں معمولی کمی زیادتی کو نظر انداز کر دیا جائے، غیر معمولی کمی کی صورت میں تنخواہ کم کر دی جائے یا ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے، کمیشن میں بھی خرابیاں ہیں، اگر کوئی یکمشت ایک بڑی رقم مثلاً دس ہزار روپے کسی محصل کو حوالہ کر دے تو ذمہ داران مدرسہ اس میں کمیشن دینا نہیں چاہتے ہیں، اور آپس میں بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔

## مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر

مفتی حبیب اللہ القاسمی ☆

زیر نظر مقالہ مسئلہ زکوٰۃ کے محور اول پر مشتمل ہے، اختصار کے ساتھ زیر بحث عنوان پر روشنی ڈالی جائے گی۔

زکوٰۃ جن اموال پر واجب ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم سوائم اور دوسری قسم مال تجارت۔

چونکہ زکوٰۃ کی شرائط میں سے مال کا نامی ہونا ہے اور نما بڑھوتری من حیث العین اسامت سے ہوتی ہے اور من حیث المعنی تجارت سے ہوتی ہے، پھر مال تجارت کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم: ائمان مطلقہ جسے ثمن خلقی بھی کہا جاتا ہے، جیسے سونا چاندی، دوسری قسم سلع۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ سونا چاندی کی تخلیق ہی دراصل تجارت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے اس میں تجارت کی نیت و وجوب زکوٰۃ کے لئے ضروری نہیں، لہذا خواہ تجارت کے لئے کوئی شخص رکھے ہوئے ہو یا خرچ کے لئے بہر حال اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بخلاف سونے چاندی کے علاوہ دوسرے سامان، کہ اس میں جس طرح تجارت کی صلاحیت ہے، اسی طرح اس کے عین سے بھی نفع اٹھایا جاسکتا ہے، بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد اصلی اس کے عین سے انتفاع ہے،

☆ بانی و مہتمم دارالعلوم مہذب پور، اعظم گڑھ۔

اس لئے اس پر وجوب زکوٰۃ کے لئے نیت تجارت ضروری ہے تاکہ یہ مال تجارت ہو جائے (تختہ الفقہاء ۱/۲۶۳، ۲۶۴)۔

سونا چاندی خواہ جس شکل میں ہوں، مضروب ہوں یا غیر مضروب، زیورات ہوں یا تمبر، استعمال جائز ہو یا نہ ہو، تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو (تختہ الفقہاء ۱/۲۶۳)۔

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے ان کا بقدر نصاب ہونا بھی ضروری ہے اور نصاب مختلف ہیں، مثلاً چاندی میں دو سو درہم، سونے میں بیس مثقال اور اگر مال از قبیل عروض ہے تو وہ سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر ہو اور اگر مال از قبیل حیوانات ہے تو ان کا متعینہ مقدار کے مطابق ہونا ضروری ہے (تختہ الفقہاء ۱/۲۶۶)۔

مال بقدر نصاب ہونے کے بعد اس میں اوصاف اربعہ کا ہونا ضروری ہے۔

۱- حولان حول ہونا۔

۲- نصاب کا دین اور حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا۔

۳- نصاب کا نامی ہونا، خواہ نما حقیقتہ ہو یا تقدیراً۔

۴- نصاب پر ملک تام کا حاصل ہونا (ملکی البحر ۱/۱۹۳)۔

اوصاف اربعہ میں سے ایک وصف ملک تام ہے، کسی بھی نصاب پر ملک تام کا تحقق اس وقت ہوگا، جب ملک اورید (قبضہ) کا تحقق ہو، اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو ملک تام نہیں کہلائے گا، مثلاً مہر قبضہ سے پہلے ملک تو موجود ہے، لیکن یہ مفقود ہے اور مال مکاتب و مدیون میں یہ تو ثابت ہے، لیکن ملک مفقود ہے، لہذا مہر قبل قبض اور مال مدیون میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (فتاویٰ ہندیہ ۱/۷۲، مجمع الزہراء ۱/۲۹۳)۔

۱- صاحب اسراج الوہاج کی تشریح کے مطابق وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا

کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہ ہو سکی ہو اس کی زکوٰۃ مشتری (خریدار) پر واجب نہ



ہوگی، اس لئے کہ ملک تو ثابت ہے، لیکن قبضہ میں ابھی نہیں آیا، اس لئے یہ کا تحقق نہیں ہوا اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک اور بیرونوں کا تحقق ضروری ہے، چنانچہ علامہ شامی نے بھی بحوالہ بحر اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

”وخرج به أيضاً كما في البحر المشتري للتجارة قبل القبض“ (رد المحتار

۲/۲۶۰)

لیکن علامہ سرحسی کی عبارت محل غور ہے جو بحوالہ محیط فتاویٰ ہند یہ میں موجود ہے:

”وأما المبيع قبل القبض فقیل: لا يكون نصاباً، والصحيح أنه يكون

نصاباً“ (فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۷۲)۔

اس جزئیہ سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خریدار پر صحیح قول کے مطابق زکوٰۃ

واجب ہوگی۔

۲- کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم (ڈپوزٹ) پر کرایہ دار و مالک مکان میں سے کسی

پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے، مالک مکان پر تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو صرف یہ حاصل

ہے، ملک نہیں، چونکہ یہ رقم عقد اجارہ کے فسخ یا تکمیل مدت کے بعد واجب الراء ہوتی ہے، اور کرایہ

دار پر زکوٰۃ اس وجہ سے نہیں کہ اس کو ملک تو حاصل ہے یہ نہیں، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال پر

ملک و بیرونوں کا جمع ہونا ضروری ہے، چنانچہ مسئلہ رہن کے تحت بیان کردہ تعلیلات فقہاء سے

اس کی تائید ہوتی ہے۔

”ولا في مرهون أى لا على المرتهن لعدم الملك الرقبة ولا على

الراهن لعدم اليد“ (فتاویٰ: ۲/۲۶۳)۔

ابن نجیم صاحب البحر الرائق فرماتے ہیں:

”ومن الموانع الوجوب الرهن“ (ایضاً)۔

البتہ اس رقم کی واپسی کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ زیر غور ہے، اگر ڈپوزٹ کا مسئلہ رہن پر قیاس کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ راہن پر استرداد کے بعد واجب نہیں ہوگی اور اگر مسئلہ رہن پر قیاس نہ کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”وإذا استردده الراهن لا يزكى عن السنين الماضية“ (رد المحتار ۲/۲۶۳)۔

۳- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ جب تک وہ رقم مستحقین پر صرف نہیں ہوئی، وہ حکماً ملک معطیٰ میں ہے تو یہ نظر انتہاء انظار دقیقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لاینحل ہے، اس لئے اہل و اہل یہی ہے کہ اس کو ملک معطیٰ سے خارج قرار دے کر ملک مدرسہ قرار دیا جائے اور اس کی تائید کتاب الوقف کی بعض جزئیات سے بھی ہوتی ہے (ہندیہ ۲/۶۰، کتاب الوقف باب ۱۱، فصل ۲، باب ۵ ص ۳۱۸)۔

لہذا معطیٰ پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح مدرسہ کے مہتمم پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، چونکہ یہ رقوم غلۃ الوقف کے درجہ میں ہے اور جس طرح غلۃ الوقف پر زکوٰۃ واجب نہیں، مدارس و اداروں کی رقوم پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں (الکلام البدیع فی احکام الخزیج)۔

البتہ فقہی سمینار اہل مدارس سے سفارش کرے کہ بقدر ضرورت ہی مال کی فراہمی کریں، تاکہ مال زکوٰۃ اس طرح محبوس نہ ہو اور مستحق مدارس محروم نہ ہوں، لیکن اگر اہل مدارس کے پاس زکوٰۃ کی رقم پسماندہ ہو تو احوط یہ ہے کہ اس کو بذریعہ تملیک رقومات غیر واجبہ میں شامل کر لیا جائے اور اس کی احسن صورت یہ ہے کہ کوئی فقیر مہتمم مدرسہ کی ضمانت پر قرض لے کر مدرسہ کو عطیہ دے اور مہتمم مدرسہ مد زکوٰۃ سے فقیر لکھ قرض کی ادائیگی کے لئے دیدے۔

۴- اگر پورا نصاب مال حرام ہو تو اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چونکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ضروری ہے اور مال حرام جو اس کے پاس ہے اس کا وہ مالک نہیں، چونکہ مال حرام

واجب الروی ہے، لہذا مالک کا پتہ لگا کر وہ یہ مال واپس کرے اور اگر مالک معلوم نہ ہو سکے تو وہ مال واجب التصدق ہے، بلا نیت ثواب فقراء مسلمین کو دیدے ”کما لو کان الكل خبيثاً كما فى النهر فى القنبة لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة؛ لأن الكل واجب التصلق عليه“ (درمختار ۲/۲۹۱)۔

اگر حرام حلال مخلوط ہو گئے ہوں تو مال حرام نکالنے کے بعد باقی مال اگر بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (درمختار ۲/۲۹۱)۔

لیکن اگر مال حرام مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ تمیز مشکل ہو تو تحری کر کے ظن غالب پر عمل کرے اور ظن غالب کے بہت سے نظائر کتب فقہ میں موجود ہیں، نیز اس انداز کے مواقع التباس میں تحری کے نظائر بھی کتب فقہ میں ہیں، کو اعلیٰ و افضل یہ ہے کہ اس طرح کا پورا مال صدقہ کر دے جیسا کہ ہمارے اکابر کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

۵- حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی، (۲) دین وسط، (۳) دین ضعیف۔

۱- دین قوی: وہ دین ہے جو مال زکوٰۃ (درہم و دنانیر) یا مال تجارت یا مال تجارت سے حاصل شدہ آمدنی و نفع کے عوض میں واجب ہو ہو۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ: (۱) بقدر نصاب ہو، (۲) سال مکمل گزر چکا ہو، لیکن ادائیگی اسی وقت واجب ہوگی جب دین سے کم از کم چالیس درہم وصول ہو جائے، تب چالیس درہم سے ایک درہم بعد زکوٰۃ نکالے اور اگر چالیس درہم سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی، لیکن بقدر نصاب حولان حول، چالیس درہم کی شرط اسی وقت ہے جب دین کے علاوہ کوئی دوسرا مال زکوٰۃ نہ ہو اور اگر اس کے پاس اموال زکوٰۃ میں سے کوئی مال ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کے پاس موجود مال زکوٰۃ بقدر نصاب ہے تو

دین سے جتنی رقم بھی حاصل ہوگی خواہ قلیل ہو یا کثیر وہ نصاب سابق میں ضم کر دی جائے گی اور نصاب سابق کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی، اور اگر مال بقدر نصاب نہ ہو، مگر دین قوی سے حاصل شدہ رقم کو شامل کرنے کے بعد نصاب کامل ہو جائے تو دین قوی سے چالیس درہم یا اس کے بقدر وصول ہونے کے بعد ایک درہم بعد زکوٰۃ واجب الاداء ہوگا، اور جب سے نصاب کامل ہوا ہے اس وقت سے سال کی ابتداء ہوگی (رد المحتار ۲/۳۰۷)۔

قرض جو اصطلاح شریعت میں دین ہے اور عرف عام میں قرض ہے، اگر مقرض وسعت کے باوجود ادا نہ کر رہا ہو تو ”مطل الغنی ظلم“ کے تحت گنہگار ہوگا، لیکن اس کی زکوٰۃ مقرض پر واجب نہیں بلکہ قرض خواہ پر واجب ہے، بشرطیکہ اس کے ملنے کا یقین ہو اور اس کی ادائیگی کا وہی طریقہ ہے جو دین قوی کا ہے جس کی تفصیلات ابھی آچکی ہیں، چونکہ یہ دین قوی میں داخل ہے اور اگر نہ ملنے کا یقین ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے وہ مال جو سمندر میں گر کر ضائع ہو جائے، اور اگر یک مشت وصول ہو تو سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

”لو كان الدين على مقر ملئى الى ان قال فوصل الى ملكه لزمه زكوة ما مضى“ (در مختار ۲/۳۶۶)۔

۲- دین وسطہ: وہ دین ہے جو اسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو، اگر مالک کے پاس سال بھر رہ جائے تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے خدمت کے غلام، ثياب بذلہ، مال خدمت کا نلہ۔

دین وسطہ کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے، لیکن ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب دین سے دو سو درہم وصول ہو جائے، اگر اس سے کم وصول ہو تو زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، لیکن دو سو درہم وصول ہو جانے کی صورت میں سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی دو روایتوں میں سے روایت اصل ہے۔

دوسری روایت جو ابن سماع عن ابی حنیفہ ہے، وہ یہ ہے کہ قبضہ کے بعد حولانِ حول شرط ہے یعنی دو سو درہم وصول ہونے کے بعد جب تک اس پر سال نہ گزر جائے اس میں زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، دین وسط میں بھی وہی تفصیلات ہیں جو دین قوی کے تحت گزر چکی ہیں۔

امام ابو حنیفہ کی دونوں روایتوں میں صحیح اور مفتی بہ ابن سماع کی روایت ہے (تختہ الفقہاء ۱/۲۹۳، رد المحتار ۲/۳۰۶)۔

۳- دین ضعیف: وہ دین ہے جو کسی چیز کے عوض میں واجب نہ ہوا ہو، اس کے دین ہونے میں اس کے کسی فعل کا دخل نہ ہو جیسے میراث یا اس کے فعل کو دخل ہو، جیسے وصیت یا ایسی چیز کے عوض میں واجب ہوا ہو جو مال نہ ہو جیسے دیت علی العاقلہ، مہر، بدل خلع، صلح عن دم العمد اور بدل کتابت۔

دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ:

۱- دین سے حاصل شدہ رقم بقدر نصاب (دو سو درہم) ہو۔

۲- قبضہ کے بعد اس پر سال گزر جائے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ

واجب الاداء نہیں، یہ ساری تفصیلات حضرت امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق ہیں۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دیون کی صرف دو قسمیں ہیں:

(۱) دین مطلق، (۲) دین ناقص۔

دین ناقص: جیسے بدل کتابت، دیت علی العاقلہ، ان دونوں دیون کے علاوہ باقی

دیون دین مطلق میں داخل ہیں۔

دین مطلق کا حکم ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک دین وصول نہ ہو جائے

اس کی زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، خواہ وصولیابی قلیل ہو یا کثیر، جتنی وصول ہوگی، اتنے کی زکوٰۃ

واجب الاداء ہوگی۔

اور دین ناقص میں وجوب زکوٰۃ کے لئے دو شرطیں ہیں:

(۱) حاصل شدہ رقم بقدر نصاب ہو۔ (۲) اس پر سال گزر جائے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دین ناقص میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، دین کے سلسلہ کی ساری تفصیلات ”تختہ الفقہاء لعلاء الدین السمرقندی“ اور ”در مختار و رد المحتار“ سے ماخوذ ہیں (تختہ الفقہاء ۲/۲۹۳، ۲۹۴، رد المحتار ۲/۳۰۵)۔

۶۔ پرائیویٹ فنڈ و طرح کے ہیں:

(۱) سرکاری، (۲) پرائیویٹ۔

۱۔ سرکاری پرائیویٹ فنڈ دین ضعیف کے حکم میں ہے، لہذا جو حکم دین ضعیف کا ہے وہی سرکاری پرائیویٹ فنڈ کا ہے، یعنی سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، البتہ وصولی کے بعد اگر وہ بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تو اس رقم کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

۲۔ پرائیویٹ کمپنیوں کا پرائیویٹ فنڈ چونکہ مستقل ایک ایسی کمپنی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جس میں ملازمین کا بھی ایک نمائندہ ہوتا ہے اور یہ کمپنی ملازمین کی وکیل ہوتی ہے، اس لئے کمپنی کا قبضہ ملازم کے قبضہ کے درجہ میں ہے، اس طرح فنڈ کی رقم کو یا کہ ملازم کی ملک ہوگی، اس لئے یہ دین نہیں کہلائے گا، اور اس پر سال بہ سال زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر ہر سال زکوٰۃ نہیں ادا کی گئی تو وصولی کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اور اگر پرائیویٹ کمپنیوں کا حال بھی سرکاری پرائیویٹ فنڈ کی طرح ہو تب جو حکم سرکاری پرائیویٹ فنڈ کا ہے وہی حکم پرائیویٹ فنڈ کا بھی ہوگا (فتاویٰ محمودیہ احسن الفتاویٰ)۔

نصاب کے اوصاف اربعہ میں سے وصف ثانی نصاب کا نامی ہونا ہے، نما کے لغوی معنی اضافہ و بڑھوتری کے ہیں اور اضافہ کبھی حقیقتہً ہوتا ہے، جیسے حیوانات میں تولد و تناسل کے ذریعہ اور دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ اور کبھی تقدیراً ہوتا ہے، جیسے سونا چاندی اور سکہ رائج الوقت،

وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا نامی ہونا ضروری ہے خواہ حقیقت نامی ہو یا تقدیراً، لہذا ایسا مال جسے اپنے یا اپنے نائب کے پاس رکھ کر استثناء پر قادر نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں (مجمع الانہر ۱/ ۱۹۳)۔

نصاب کے اوصاف اربعہ میں سے وصف ثالث نصاب کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے، حاجتِ اصلیہ کی تفسیر ابن ملک کے حوالہ سے علامہ علاء الدین حصکھی اور صاحب ”مجمع الانہر“ نے یہ کی ہے:

”ایسی چیزیں جو انسان کو بلاکت سے دور کرنے والی ہوں خواہ تحقیقاً، جیسے اس کا اور اس کی بیوی اور بال بچوں کا نفقہ، یعنی کھانا، خوراک، گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے کپڑے، رہائشی مکان، گھریلو سازوسامان، سواری کا جانور، خدمت کے لئے غلام، جنگی سازوسامان، آلاتِ صنعت و حرفت اور اہل علم کے لئے کتابیں، چونکہ اہل علم کے نزدیک جہالت باعثِ بلاکت ہے یا تقدیراً جیسے دین، کہ مدیون نے اگر موجود مال سے دین ادا نہیں کیا تو یہ دین اس کو جیل میں ڈلواسکتا ہے جو بلاکت کے درجہ میں ہے، لہذا اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہے، لیکن وہ مذکورہ بالا حوائج کی تکمیل میں مشغول ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ وہ حاجتِ اصلیہ سے فارغ نہیں اور اگر بقدر نصاب یا اس سے زائد مال مذکورہ بالا اشیاء کی شکل میں موجود ہو تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ یہ چیزیں نامی نہیں ہیں، حتیٰ کہ وہ برتن جو گھر کی زینت کے لئے رکھے جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ سونے چاندی کے نہ ہوں اور ایسے ہی وہ آلات جن کی ذات سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور اس کا اثر معمول میں باقی نہ رہتا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں جیسے صابن اور اگر اس کا اثر معمول میں باقی رہے، جیسے کپڑا رنگنے کے لئے رنگ، کھال میں لگانے کے لئے تیل، نمک وغیرہ تو اگر یہ بقدر نصاب ہوں اور سال گزر جائے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ تفصیلات ”مجمع الانہر، ہندیہ، شامی، درمختار“ سے ماخوذ ہیں“ (مجمع الانہر ۱/ ۱۹۳، رد المحتار ۲/ ۲۶۳، الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۱۷۲)۔

فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ حاجت اصلیہ کی کوئی ایسی تحدید نہیں جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہ ہو، بلکہ وسعت ہے، البتہ لفظ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرے میں جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، مثلاً کچے مکان کی جگہ پختہ مکان، نل کی جگہ پرٹنکی، سواری کے جانور کی جگہ پر موٹر سائیکل، جیپ کار، تیرکمان کی جگہ پر رائفل، بندوق وغیرہ، آلات صنعت و حرفت میں دست کاری کی جگہ مشینیں، اسی طرح ضروریات زندگی میں بڑے مکانات میں لفٹ، ٹیلیفون، کاروباری لوگوں کے لئے فریج، کولر، موسم کے اعتبار سے ہیٹر یا اے، ہی پنکھا، الغرض اسی طرح کی جدید چیزیں جو روزمرہ کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں، اور جن کی اصل تصریحات فقہاء میں بنیادی حیثیت سے موجود ہیں وہ سب حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی فحش اور ناجائز چیزیں حاجت اصلیہ میں داخل نہیں۔

نساب کے اوصاف اربعہ میں سے وصف رابع نساب کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ دین سے مراد ہر وہ دین ہے جس کا مطالب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں ہی کا ہو، جیسے قرض، ثمن بیع، ضمان، متلفات، زخم کا تاوان، بدل خلع، بدل صلح عن دم اہم، نیز خواہ از قبیل نقد ہو یا مکمل و موزون یا از قبیل ثياب اور حیوانات، نیز خواہ حال ہو، یا مؤجل یعنی بالفعل اس کی ادائیگی ضروری ہو یا بعد زمان کچھ دنوں کی مہلت ہو، لہذا صدقاً زوجہ اگرچہ وہ مؤجل اہل الطلاق یا اہل الموت ہو، وہ بھی دین میں داخل ہے اور مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ یا وہ دین اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسے دین زکوٰۃ اور ہر وہ دین جس کا مطالب بندہ نہ ہو، جیسے دین نذر، کفارات، صدقہ فطر، وجوب حج یہ دین میں داخل نہیں، یعنی مانع وجوب زکوٰۃ نہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے مجمع الاشبہ ۱/۳۳، فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۷۲)۔

دیون مذکورہ بالا میں جو مشغول ہو وہ معدوم کے درجہ میں ہے، اس لئے اس میں زکوٰۃ

واجب نہیں۔



”لأن المشغول بها كما لمعلوم“ (مجمع الأنهر ۱/۱۹۳)۔

دیگر حضرات فقہاء کے نزدیک عدم وجوب زکوٰۃ کی علت اس مال کا حوائجِ اصلیہ کی تکمیل میں مشغول ہونا ہے اور جو مال حوائجِ اصلیہ میں مشغول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، (دیکھئے رد المحتار ۲/۲۶۱)۔

لیکن وہی دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے جو وجوب زکوٰۃ سے پہلے کا ہو، اگر مال بقدر نصاب ہو اور حولان حول ہو گیا اس کے بعد یہ مقروض ہو گیا تو یہ قرض مانع نہیں، بلکہ زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، (دیکھئے جوہر، رد المحتار ۲/۲۶۰)۔

چونکہ دین عبد لاحق ہے اور دین زکوٰۃ سابق ہے اور لاحق سابق کو ساقط نہیں کر سکتا، فقہاء کرام کی تصریحات میں یہ بات بھی آچکی ہے کہ دین بالفعل واجب الادا ہو یا بعد زمان، یعنی دین طویل المدت ہو، دونوں طرح کے دیون مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، لہذا مروج طویل الاجل دیون خواہ زراعتی ہوں یا تعمیراتی جن کی ادائیگی کے لئے پانچ سال سے لے کر چالیس سال تک کی مدت مقرر کی جاتی ہے وہ بھی دین میں داخل ہیں اور مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، پورے دین کو بھی اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاسکتا ہے اور اس کی نظیر مہر ہے جو مؤجل الی الاطلاق یا الی الموت ہو، نیز تصریح ہے بالفعل یا بعد زمان، البتہ احوط یہ ہے کہ صرف سالانہ واجب الادا عتق وضع کر کے باقی اموال زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، یہ خیال کر کے گویا کہ اس سال واجب الادا دین صرف یہی ہے اور باقی مال میرا ہے، لیکن یہ تقویٰ ہے، اگر کسی نے عمل کر لیا تو انشاء اللہ ماجور ہوگا۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شرکاء نے اگر کمپنی کو اداء زکوٰۃ کا وکیل بنا دیا ہو تو کمپنی پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، البتہ اگر اثاثے از قبیل آلات (مشینری) ہیں تو وہ مال زکوٰۃ میں شمار نہ ہوں گے، چونکہ

آلات صنعت کا استثناء حضرات فقہاء نے کیا ہے اور اٹاٹے از قبیل آلات نہ ہوئے تو مال زکوٰۃ میں اس کو بھی شمار کیا جائے گا، اور اگر شرکاء نے کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا وکیل نہ بنایا ہو تو ہر حصہ دار اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے، جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب ہو یا دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر وہ بقدر نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی، اور جس حصہ دار کا حصہ بہ قدر نصاب نہ ہو اور نہ ہی دوسرے اموال زکوٰۃ اس کے پاس ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی (فتاویٰ محمودیہ ۷۰۳)۔

### ہیرے جوہرات

ہیرے جوہرات اگر تجارت کے لئے نہیں ہیں تو بالاتفاق اس میں زکوٰۃ نہیں، چاہے جوہرات کی قیمت جتنی بھی ہو، لہذا جو لوگ اکم نیکس یا دیگر قوانین سے بچنے کے لئے اپنے سرمائے کو ہیرے و جوہرات کی شکل میں محفوظ کر دیتے ہیں اگر ان کے پاس ہیرے و جوہرات کے علاوہ دیگر اموال زکوٰۃ نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں، اسی طرح خواتین کے پاس اگر ہیرے جوہرات ہوں، خواہ تزیین کے لئے ہوں یا تمول کے لئے، بشرطیکہ تجارت کے لئے نہ ہوں ان پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں، چونکہ ہیرے جوہرات از قبیل اجار ہیں اور اجار میں حجرین (ذہب و فضہ) کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں، چونکہ ذہب و فضہ کو شمن خلقتی (شمن مطلق) کی حیثیت حاصل ہے اور ان کے علاوہ باقی از قبیل عروض و سلع ہیں، ہیرے جوہرات بھی از قبیل عروض ہیں اور عروض میں زکوٰۃ نیت تجارت ہی سے واجب ہوتی ہے، اس لئے جب تک نیت تجارت نہ ہو ہیرے جوہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (دیکھئے درمختار ۲/۲۷۳، ۲/۲۷۳، فتاویٰ ہندیہ ۱۸۰)۔

لیکن اگر کوئی ہیرے جوہرات کی بھی زکوٰۃ ادا کر دے تو یہ تقویٰ ہے، وہ ماجور ہوگا، البتہ شرعاً واجب نہیں۔

## اراضی کی زکوٰۃ

سونا چاندی کے علاوہ باقی چیزیں عروض میں داخل ہیں اور عروض کے مال زکوٰۃ بننے کے لئے نیت تجارت شرط ہے، لہذا اگر کوئی شخص زمین بہ نیت تجارت خریدے تو اس کا بھی شمار اموال زکوٰۃ میں ہوگا اور حولان حول کے وقت اس کی جو قیمت مارکیٹ میں ہوگی اسی میں زکوٰۃ فرض ہوگی، قیمت خرید کا اعتبار نہیں۔

”وتعتبر القيمة عند حولان الحول“ (ہندیہ ۱۷۹/۱)۔

لیکن اگر کسی نے زمین رہائش کے لئے خریدی پھر تجارت کی نیت ہوگئی یا تجارت کے لئے خریدی پھر رہائش کی نیت ہوگئی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کی تفصیل درمختار میں موجود ہے (۲۷۲/۲)۔

## اموال زکوٰۃ میں کون سی قیمت معتبر ہے؟

اموال زکوٰۃ میں فقہاء ”انفع للفقراء“ کی رعایت کرتے ہیں، چنانچہ بہ کثرت ایسی جزئیات ہیں جن میں اس کی تصریح ہے۔ ”تقویم بالدرہم والدنانیر“ میں بھی اسی کلیہ کی رعایت کی گئی ہے۔

”انظر ہما للفقراء، ومشائخنا حملوا رواية كتاب الزكوة على ما إذا كان لا يتفاوت النفع في حق الفقراء بالتقويم بأيهما كان“ (تختہ المہم ۱۷۱/۲۷۳)۔

”ثم إن المعبر عند محمد الأنفع للفقير من القدر والقيمة وعندہما القدر“ (رد المحتار ۲۸۵/۲)۔

اس لئے مال کی قیمت لگاتے وقت اس پہلو کی رعایت تا جہ حضرات کے ذہنوں میں رہنی چاہیے، ان کو دیکھنا چاہیے کہ تھوک میں فقراء کا زیادہ نفع ہے یا پھنکر کی قیمت لگانے میں، جس

میں فقراء کا زیادہ نفع ہو وہ قیمت لگائیں، لیکن بعض دکانیں تھوک ہی کی ہوتی ہیں، وہاں پھنکر سامان نہیں ملتا، اس صوت میں پھنکر دکان دار پھنکر کی قیمت لگائیں اور قیمت کی تعیین لاگت سے نہیں بلکہ حولان حول کے وقت اس کی جو قیمت ہوگی وہی معتبر ہوگی، (فتاویٰ ہندیہ ۱۷۹/۱)۔

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم الوجوب کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا یا یوم الاداء کی قیمت کا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یوم الوجوب کی قیمت معتبر ہے اور صاحبین کے نزدیک یوم الاداء کی قیمت معتبر ہے، نیز اس شہر کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا جس شہر میں مال ہے، ہیڈ آفس کا اعتبار نہیں۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالوا: يوم الأداء.... ويقوم في البلد الذي المال فيه“ (در مختار ۲/۲۸۶، مائتیری ۱۸۰۱)۔

### شیئرز

شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وہ خود بقدر نصاب ہوں یا دیگر اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر بقدر نصاب ہو جائیں اور اصل پونجی میں زکوٰۃ اس وقت فرض ہوگی، جب کمپنی نے اس کو کسی عین میں لگا رکھا ہو، مثلاً لوہا، سیمنٹ، سامان الیکٹریک، ریشم وغیرہ، اور اگر کمپنی نے اس کو آلات میں لگا رکھا ہے، مثلاً نقل و حمل کے لئے ٹرک یا بس وغیرہ، تب اصل پونجی میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، چونکہ آلات صنعت کو فقہاء نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، کیونکہ سکہ رائج الوقت ثمن خلقی کے حکم میں ہے اور ثمن مطلق میں تقدیر اقولت نموکی وجہ سے مطلقاً زکوٰۃ فرض ہے، خواہ تجارت میں وہ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے اور صورت مسؤلہ میں یہ ثمن مطلق تجارت میں مشغول ہے، اس لئے اس میں زکوٰۃ ہے۔

حولان حول کے وقت شیئرز کی جو قیمت ہوگی اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

---

”وتعتبر القيمة عند حولان الحول“ (مائگیری ۱۷۹۱)۔

بونڈز

پرائز بونڈز ہو یا بونڈس ٹریفیکٹ، فکسڈ ڈپوزٹ ہو یا انشورنس یہ سب سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں، اس طرح رقم کو محفوظ کر دینا روح شریعت کے خلاف ہے۔  
فقہی سمینار عوام کو اس پر متنبہ کرے، بونڈز پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے اصل رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ منافع حرام ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہیں، بونڈ جب کیش ہوگا اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

”لو كان المدين على مقر ملنى أو على معسر أو مفلس إلى أن قال

فوصل إلى ملكه لزم زكوة ما مضى“ (درمختار ۲۶۶/۲)۔

## زکوٰۃ کے چند اہم مسائل

مولانا محمد طیب الرحمن صاحب ☆

### محو راول

زکوٰۃ تین قسم کے اموال میں واجب ہوتی ہے:

- (۱) نقود، (۲) سوائم، (۳) اموال تجارت (عمدة المرعایہ ۲۱۸/۱، شرح وقایہ ۲۱۸/۱)۔  
 وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق اموال سے ہے ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔  
 ملک تام سے مراد مملوک بہ اعتبار ملک اور قبض ہے۔  
 ”لأن الملك التام ما اجتمع فيه الملك واليد“ (الجمہورۃ امیرۃ ۱۱۳/۱، رد  
 المحتار ۵/۳، بدائع المنابع ۹/۳)۔

۱- کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملک تام، یعنی ملک اور قبضہ شرط ہے، بناءً علیہ  
 مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو وہ  
 قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس پر مشتری کا ملک بھی نہیں  
 ہے اور قبضہ بھی نہیں ہے، البتہ وہ مال جو مشتری کے ملک میں آچکا ہے، لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس  
 پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اس  
 پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بسبب ملک ناقص، اور صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ وجوب ادا

☆ امیر شریعت شمال شرقی ہند۔

قبضہ کے بعد ہوگا، دین قوی کی طرح۔ وصول کے بعد ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی (دیکھئے: فتاویٰ ہندیہ ۱/۸۸، البحر المرائق ۲/۲۵۵، شرح المتعاریہ ۱/۱۳۶)۔

۲- کرایہ دار مالک مکان کو کرایہ کی مد میں جو پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دیتا ہے جس کو عقد اجارہ کے فتح ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کرنا پڑتا ہے ایسی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دینا ضرورت کی طرف نظر کرتے ہوئے بیع بالوفاء پر قیاس کر کے جائز قرار دیا گیا ہے اور بیع بالوفاء میں مشتری بائع کو جو قیمت ادا کرتا ہے اس قیمت میں بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا مشتری پر اس میں ائمہ احناف کا اختلاف ہے، قول راجح یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی، نہ کہ بائع پر اور مسئلہ مسئول عنہا میں کرایہ دار بہ منزلہ مشتری ہے اور مالک مکان بہ منزلہ بائع، بناء علیہ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ کی زکوٰۃ بھی قول راجح کی بنا پر کرایہ دار پر واجب ہوگی نہ کہ مالک مکان پر، دیکھئے: (رد المحتار ۵/۲۲)۔

۳- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقوم جس کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملک تام شرط ہے اور مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم اموال موقوفہ کی طرح اس کا کوئی مالک معین نہیں ہے اور اموال موقوفہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

”لما فی الفقہ علی المذاهب الأربعة: ولا زکوٰۃ فی المال الموقوف“

(فقہ علی المذاهب الاربعہ ۵۹۳)۔

۴- مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط نہ ہو، بلکہ وہ خالص مال حرام ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ اس پر اس کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ مال حرام کا مالک اگر معلوم ہے تو سارا مال مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو مال مخلوط سے مال حرام

کی مقدار نکال کر اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو باقی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہیں بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ حرام خلط سے مستہلک ہو جاتا ہے اور مقدار مال حرام مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے، (رد المحتار ۴/۳۳، فتح القدیر ۱/۳۸۲)۔

۵- دین کی زکوٰۃ فی الحال ادا کرنا دائن یا مدیون دونوں میں سے کسی پر واجب نہیں ہوتی۔ دائن پر اس لئے واجب نہیں ہوتی کہ اس کی ملک ہونے کے باوجود قبضہ نہیں ہے، لہذا قبضہ سے قبل دائن کی ملک تام نہیں ہے اور مدیون پر اس لئے واجب نہیں ہوتی کہ مال اس کے قبضہ اور تصرف میں ہونے کے باوجود بھی اس پر اس کی ملک نہیں ہے، اگر مدیون ادائیگی کی قدرت کے باوجود مال منول کرے اور اس کو تجارت میں لگا کر استفادہ کرتے رہے تو بھی مدیون پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس پر مدیون کی ملک نہیں ہے اور زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملک تام یعنی ملک اور قبضہ دونوں شرط ہے۔

وصولیابی کے اعتبار سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) قوی، (۲) متوسط، (۳) ضعیف

- ۱- دین قوی وہ دین ہے جو قرض یا مال تجارت کے بدلے بذمہ مدیون عائد ہوا ہو۔
- ۲- دین متوسط وہ دین ہے جو نقد یا مال تجارت کے علاوہ دوسری کسی قسم کے مال کے بدلے بذمہ مدیون عائد ہوا ہو، جیسے لباس بذلہ خدمت کے عہد، رہنے کے گھر وغیرہ کی قیمت۔
- ۳- دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی قسم کے مال کے بدلے میں بذمہ مدیون عائد نہیں ہوا ہو، جیسے دین ہر، وصیت وغیرہ۔

دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے، لیکن وجوب ادا اسی وقت ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کے مقدار روپیہ وصول ہو جائے، اس کے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا، لیکن وصول کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، دین ضعیف پر



قبضہ ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دین متوسط کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے بقول ہیں: ایک قول کے مطابق دین متوسط کا حکم دین قوی کی طرح ہے، مگر وجوب ادا چالیس درہم کی وصولیابی پر نہیں، بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم کے وصول ہونے پر ہوگا اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دوسرے قول کے مطابق دین متوسط دین ضعیف کے حکم ہے، یعنی وصولیابی کے بعد جب سال بھر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دونوں قول کی جانب تصحیح بھی موجود ہے، اہل تصحیح نے ”بدائع الصنائع“ نے دین متوسط کو دین ضعیف کے حکم میں اعتبار کرتے ہوئے اسی کو صحیح قرار دیا ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۱/ ۳۹۱، الفہم علی المذہب الاربعہ ۱/ ۶۰۳، السوسطی ۱/ ۱۹۵)۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کی جو رقم جمع کی جاتی ہیں خواہ وہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم ہو یا سرکاری کمپنی کی طرف سے اضافہ کی ہوئی رقم ہو یا رقم انٹرسٹ ہو وہ بہ ذمہ سرکاری کمپنی قرض ہے، لہذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں، اس کے بارے میں حکم لگانے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دین کے اقسام ثلاثہ میں سے کس قسم کا دین ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے، اب دیکھنا چاہئے کہ خدمت کا معاوضہ یعنی اجرت مال ہے یا نہیں، پھر اگر مال ہو تو وہ مال تجارت کی منزل میں ہے یا مال غیر تجارت کی منزل میں، امام ابوحنیفہ سے اجرت کے بارے میں تین روایات مذکور ہیں، ایک روایت میں اجرت کو مہر کی مانند قرار دیا گیا، کیونکہ وہ حقیقتہً مال کا بدل نہیں ہے، بلکہ وہ منفعت کا بدل ہے اور منفعت حقیقتہً مال نہیں ہے، اس روایت کی بنا پر وہ دین ضعیف ہوگا، دوسری روایت میں منافع کو من وجہ مال اعتبار کرتے ہوئے اجرت کو ثمن ثیاب بذلہ کے مانند قرار دیا، اس

روایت کی بنا پر وہ دین متوسط ہوگا، تیسری روایت میں بدل منفعت کو بدل عین کی جگہ میں اعتبار کرتے ہوئے اجرت اور عبد تجارت کو ثمن متاع تجارت کی جگہ میں اعتبار کیا گیا، اس روایت کی بنا پر اجرت عبد تجارت دین قوی کے قبیل سے ہوگا۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اجرت عبد تجارت نہیں ہے بلکہ وہ اجرت حر ہے، لہذا یہ دین قوی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ دین ضعیف ہو گا یا دین متوسط ہوگا۔ دین متوسط ہونے کی تقدیر پر منافع کو مال کے قبیل سے شمار کرنا پڑتا ہے، لہذا اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ کتاب البیوع میں ائمہ احناف کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافع مال کے قبیل شمار کیا جائے تو ائمہ احناف کے قول میں باہم تعارض پیدا ہوتا ہے، لہذا اس کو دین ضعیف قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے، علاوہ بریں اصح روایت کی بنا پر دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے جس کے متعلق ما قبل میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ دین قبضہ ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوتی ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بناءً علیہ پر اویڈنٹ فنڈ کی رقم پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔

### تیسری شرط حاجتِ اصلیہ

حاجت اصلیہ ایسی حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی بلاکت کو دفع کرتا ہے، تحقیقاً ہو، جیسے کپڑا وغیرہ یا تقدیراً ہو، جیسے قرض وغیرہ اور حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

”ويعتبر في الراحلة ما يليق بالشخص عادة و عرفا و يختلف ذلك باختلاف أحوال الناس“ (لفقہ علی الحداہب الاربعہ ۲/۶۲۳)۔

## چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟— دین کی قسمیں اور ان کے احکام:

مانع وجوب زکوٰۃ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں:

۱- وہ دین جو خالص بندہ کے لئے ہے اور بندوں کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا موجود ہے، جیسے قرض، ثمن، بیع وغیرہ۔

۲- وہ دین جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن بندہ کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا ہے، جیسے زکوٰۃ، خراج وغیرہ، اس کے لئے بندہ کی طرف سے طلب کرنے والا امام یا نائب امام ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: (الموسط، ۱۹۶۱، البحر الرائق، ۲/۲۳۳، صحیح الخلق، ۲/۲۳۳)۔

## دوسری شرط نماء

نماء کے لغوی معنی زیادہ ہونے کے ہیں، اس کی دو صورتیں ہیں، نماء حقیقی اور نماء تقدیری۔ تو امد اور وہ اس طرح ہے کہ شروع اسلام سے حضرت عثمان غنیؓ کے وقت تک زکوٰۃ امام المسلمین وصول کرتے تھے، ان کے بعد کے دور سے ارباب اموال، اموال باطنہ کی طرف سے وکلاء کے طور پر ہیں۔

۳- وہ دین جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور اس کا طلب کرنے والا بندہ کی طرف سے کوئی نہیں ہے، اگرچہ قیامت میں ان کا مطالبہ ہوگا، جیسے نذر، کفارات، حج وغیرہ۔ پہلے دو قسم کے دین مانع وجوب زکوٰۃ ہیں اور تیسری قسم کی دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں۔

اکثر ائمہ احناف کے نزدیک دین خالص للعباد و مجل ہو یا مؤجل دونوں صورتوں میں مانع وجوب زکوٰۃ ہے، بعض کے نزدیک دین خالص للعباد اگر مؤجل ہو جائے تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ عورت کا مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے،

کیونکہ عادتاً اس کے لئے بندہ کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے اور بعض نے یہ بھی بتایا کہ زوج کے ہاتھ میں جو نقد موجود ہے اسے اگر دین مہر ادا کرنا مقصود ہو تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا، ورنہ نہیں، صاحب ”روا المختار“ نے صاحب ”معراج“ سے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، اور تہستانی نے جوہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، خلاصہ یہ نکالا کہ دین خالص للعباد کے بارے میں تین اقوال ہیں:

۱- مجل اور مؤجل دونوں مانع زکوٰۃ ہے۔

۲- مجل مانع ہے، مؤجل مانع نہیں ہے۔

۳- اگر عزم ادا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

تہستانی نے جوہر سے ثانی قول کی ترجیح و تصحیح نقل کی ہے، نیز وجوب زکوٰۃ میں جو صورت نفع للمفقر ہے اس کی رعایت کرنے کے لئے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے، اس لئے قول ثانی کو ترجیح دینا ہی ارجح ہے۔

سرکار اپنے شہریوں کو موجودہ دور میں طویل الاجل جو دین بہ صورت ذرائعی قرض، صناعتی قرض، تعمیر مکان کے لئے قرض وغیرہ دیتی ہے اور قسط وار ان کو ادا کرنا پڑتا ہے، وہ بھی دین خالص للعباد ہے اور اس میں بھی مطالبہ صرف سالانہ واجب الاداء قسط کا ہے اور مدیون کے ہاتھ میں جو نقد ہے اس سے سالانہ واجب الاداء قسط کے علاوہ باقی رقم ادا کرنے کا عزم بھی نہیں ہوتا، بناء علیہ ایسے طویل الاجل قرضوں میں اموال زکوٰۃ سے سالانہ واجب الاداء قسط وضع کر کے باقی اموال مقدار نصاب ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دیکھئے: (نفعہ علی المراد اب الاربعہ ۱/ ۵۹۳، بدائع الصنائع ۶/ ۶۲، درمختار ۲/ ۷۷، فتح القدر ۱/ ۸۸)۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

کوئی بھی کمپنی متعدد شرکاء سے سرمایہ حاصل کرتے ہوئے جو کاروبار کرتے ہیں اس

کاروبار کو چلانے کے لئے کمپنی عام طور پر سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت چلانے کے لئے ضروری اسباب مثلاً تعمیر مکان، آلات حرفت، بیع اراضی وغیرہ مختلف ایسی چیزوں کو خریدنے میں لگاتی ہیں جن کی عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، شرکاء اپنے اپنے حصہ کے مطابق تجارت کے اموال آمدنی آلات حرفت وغیرہ کے مالک ہوتے ہیں، ایسی صورت میں نصاب وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ مجموعی مالیت پر کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس پر شرکاء میں سے ہر کوئی شریک ہے اور ہر فرد کی ملکیت اپنے انفرادی حصہ پر ہے، لہذا کمپنی اپنے سرمایہ سے کسی حصہ کو آلات حرفت، تعمیر مکان وغیرہ اسباب جن کی عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، ایسے اسباب خریدنے میں اگر صرف کریں تو سرمایہ کے اسی حصہ کو علیحدہ کرتے ہوئے باقی سرمایہ میں شرکاء سے جس فرد کا جو حصہ رہے گا وہ اگر مقدار نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں، کیونکہ حالت انفرادی میں جس شئی کا اعتبار کیا جاتا ہے حالت شرکت میں بھی اسی کا اعتبار کیا جاتا ہے، (دیکھئے رد المحتار ۱۱/۲، بدائع الصنائع ۱۶/۲، درمختار ۲۶/۲، فتاویٰ ہندیہ ۱۸۱/۱)۔

### ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی نیت سے کسی کی ملکیت میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لہذا اگر اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کی غرض سے ہیرے اور جواہرات خرید کر کے بدون نیت تجارت کے محفوظ رکھے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسا کہ مراقی الفلاح میں ہے:

”ولا زکوٰۃ فی الجواهر واللالی إلا أن یتملکھا بنیۃ التجارۃ کسائر

العروض“ (مراقی الفلاح ۳۹۱، نیز دیکھئے المجموعہ ۱۱۲/۲، درمختار ۱۸۱/۲)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے تاجر اگر اس مال کی زکوٰۃ نقد روپیہ سے ادا کرنا چاہے تو اس کی قیمت متعین کرنے کے وقت اگر تاجر کی لاگت کے حساب سے یا تھوک کے بھاؤ سے متعین کیا جائے تو اس میں فقراء کی رعایت نہ ہوگی، حالانکہ عند اشرف وہ مطلوب ہے، لہذا اس کی وہ قیمت معتبر ہوگی جو وہ عام طور سے رائج و معروف ہو اور اس میں پھٹکر فر و خٹگی کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا، نیز اموال اگر سامانہ میں سے ہو تو یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہوگا، جیسا کہ الجوهرة المیرۃ میں ہے:

”ثم المعتبر فی القيمة عند ابي حنيفة يوم الوجوب ولا يلتفت بعد ذلك إلى زيادة القيمة ونقصانها وعندهما يوم الأداء إلى الفقراء“ (الجوهرة المیرۃ ۱/۱۲۳، جامع الرموز ۱/۱۳۹، در مختار ۲/۳۰۷)۔

کوئی اراضی کی خرید و فروخت کو اگر تجارتی کاروبار کے طور پر کرے تو بھی وہ اراضی اموال زکوٰۃ میں شمار نہیں کی جائے گی، کیونکہ اراضی پر عشر یا خراج واجب ہوتا ہے، اس لئے اگر اراضی پر زکوٰۃ بھی واجب ہو جائے تو ایک ہی سبب پر دو حق لازم کرنا پڑتا ہے، حالانکہ وہ عند اشرف جائز نہیں ہے۔

”ولو اشترى أرض عشر أو خراج للتجارة لا يجب فيها الزکوٰۃ“ (فاضل خان ۱/۸۱۸، الکفا علی الہدایہ ۱/۲۶۰، در مختار ۲/۱۸۷، ۱۸۷، ۱۸۷)۔

### شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی کے شیر خرید کرنے کے معنی اس کمپنی کی تجارت میں شریک ہونا ہے۔ اگر شیر ہولڈر کو معلوم ہو کہ شیر کی رقم کس صورت میں ہے تو ماقبل میں کمپنی کے زیر بحث و جواب

زکوٰۃ کے بارے میں جو حکم بتایا گیا ہے شیئر کے بارے میں بھی وہی حکم ہوگا، شیئر کی رقم کے بارے میں اگر یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس صورت میں ہے تو اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نفع معلوم ہو تو اصل اور نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض دینے والا جو سرمایہ بونڈز پر لگاتا ہے وہ بہ ذمہ حکومت یا کمپنی قرض ہے اور وہ دین قوی کے قبیل سے ہے، بناء علیہ بونڈز کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہے گی، لیکن سال بہ سال ادا کرنا واجب نہ ہوگا، بلکہ وصولی کے بعد ادا کرنا ہوگا، اس لئے بونڈز کے کیش کرانے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ ماقبل میں دین کی قسمیں اور دین کی زکوٰۃ کے حکم کے تحت دلائل ذکر کئے جا چکے ہیں۔

### محور ثانی - نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کسی ایک کے نصاب کو اصل اور دوسرے کو فرع اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر ایک اپنے اپنے نصاب کے اعتبار سے مستقل ہے، لہذا سونے اور چاندی دونوں اگر علی الافراد بقدر نصاب ہوئے تو دونوں کو ایک ساتھ نہ ملایا جائے گا، بلکہ چاندی اور سونا ہر ایک کی زکوٰۃ علیحدہ علیحدہ ادا کریں، اگر چاندی اور سونا دونوں میں سے کوئی قدر نصاب نہ ہو یا دونوں میں سے ایک قدر نصاب ہو اور دوسرا قدر نصاب نہ ہو تو ضم لازم ہے، یعنی ایک کے اصل کے ساتھ دوسرے کی قیمت کو ملایا جائے گا، سونا اور چاندی دونوں میں سے جس کی قیمت دوسرے کے ساتھ ملانے میں فقراء کے لئے نفع ہے ضم کے وقت اس کی رعایت کرنا واجب ہے، نیز دونوں میں سے اگر ایک کو دوسرے کی قیمت کے ساتھ ملانے سے مقدار نصاب نہ ہو اور اس کے عکس پر مقدار نصاب ہو تو جس کی قیمت کو دوسرے کے ساتھ ملانے سے نصاب پورا ہوتا ہے اس کی رعایت کرنا بھی واجب ہے، جیسا کہ رد المحتار میں ہے (دیکھئے رد المحتار ۲/۵۳، بدائع الصنائع ۲/۲۱۲)۔

## مصارف زکوٰۃ

۱- مدرسہ اگر طالب علم کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرے اور یہ نظام مقرر کرے کہ فی کس طالب علم پر ان سہولتوں کی فراہمی میں جو خرچ عائد ہوتا ہے طالب علم کے لئے لازم ہے کہ اپنے پاس سے اس رقم کو ادا کرے، مدرسہ فی کس طالب علم پر خرچ کا جو حصہ آتا ہے اگر حساب کرتے ہوئے اس کو بہ طور ماہانہ فیس مقرر کر لے تو ایسی صورت میں جو طالب علم مصرف زکوٰۃ ہے اس کی طرف سے مقررہ فیس ادا کرنے کے لئے مدرسہ اگر مد زکوٰۃ سے اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دے دے اور طالب علم وہ چیک وصول کرے تو یہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ مہتمم مدرسہ کے پاس زکوٰۃ کی جو رقم ہے وہ عین ہے اور دین عین نہیں ہے اور عین کی زکوٰۃ غیر عین سے ادا نہیں ہوتی، نیز عین کی تملیک ہر کسی کو کی جاسکتی ہے، لیکن دین کی تملیک من علیہ الدین کے علاوہ دوسرے کسی کو نہیں کی جاسکتی۔

مہتمم مدرسہ یا ان کے نائبین کے پاس جو لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں وہ معلوم اور معین ہیں اور وہ لوگ اس نیت سے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دیتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کو مستحقین کے پاس پہنچا دیں گے، لہذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ مستحقین زکوٰۃ اگر کسی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ان کی طرف سے وکیل مقرر کریں تو وہ ان کا وکیل ہو سکتا ہے، لیکن مستحقین کے عدم تقرر کی حالت میں کوئی شخص ان کا وکیل نہیں ہو سکتا، مدرسہ کے مستحقین طلبہ عادیہ مہتمم مدرسہ کو اپنی طرف سے وکیل نہیں بناتے، نیز طلباء بھی ایک آتے ہیں تو دوسرے جاتے ہیں، ایسی صورت میں مہتمم مدرسہ مستحقین طلبہ کی طرف سے وکیل نہیں ہو سکتا (دیکھئے: ۲۲/۲، ۲۳، فتاویٰ ہندیہ ۱/۹۷، فتاویٰ قاضی خان ۱/۲۵۱، فتح القدیر ۲/۲۰۱، ۲۷، طحاوی ۲۳)۔

۲- قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کے تحت ”والعاملین علیہا“ کو



بھی ذکر کیا ہے، حسب تصریح فقہاء و مفسرین ”والعاملین علیہا“ سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو امام المسلمین زکوٰۃ و عشر وصول کرنے کے لئے مقرر کرتے ہیں، ائمہ احناف نے بھی تصریح کی ہے کہ عاملین کو ان کے عمل سے قدر کفایت نفقہ دیا جائے گا، لیکن ان کے عمل کے نصف سے زائد دینا جائز نہیں ہے اور یہ اجرت کے طور پر نہیں ہے، بلکہ بطور عملہ ہے، مدرسہ کے لئے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر ہوتے ہیں ان کا تقرر چونکہ امام کی طرف سے نہیں، بلکہ مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے، اس لئے وہ ”والعاملین علیہا“ کے تحت داخل نہیں ہوں گے، لہذا ان کو ان کے عمل کے عوض میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ بہ طریق اجرت ہے اور عامل کے عمل کی اجرت معلوم ہونا ضروری ہے، کیونکہ اجرت اگر مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ عامل کی اجرت اگر اس کے عمل کے ایک جزء کو مقرر کیا جائے تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بناء علیہ مدارس کی طرف سے محصلین زکوٰۃ وغیرہ کو اگر متعین شرح فی صد کمیشن دینے کی شرط پر مقرر کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ زکوٰۃ ادا ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ ایسے شخص کو مالک بنا دیا جائے جو مصرف زکوٰۃ ہو اور مالک بنانا بھی بلا کسی معاوضہ کے ہو، بناء علیہ زکوٰۃ کے آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے لئے مدرسہ کی طرف سے جو عملہ مقرر ہوتا ہے ان کی تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہ ہوگا (دیکھئے بدائع ۳/۳۲۲، روح المعانی ۱۰/۱۳۱، احکام القرآن للجصاص ۲/۱۳۳، البحر الرائق ۳/۲۱۶، در مختار ۵/۵۵، العنایۃ علی الہدایہ ۲/۲۰۰)۔

## زکوٰۃ کے چند مسائل اور ان کا شرعی حل

محمدی الدین بڑودوی ☆

### محو راول

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے وہ تین قسموں پر مشتمل ہیں:

اول: اثمان مطلقہ، سونا اور چاندی جو طبعی طور پر اموال تجارت ہیں۔

دوم: اموال تجارت، یعنی وہ سامان و اسباب جو تجارت کی غرض سے تیار کیا گیا یا خریدا گیا ہے۔

سوم: سوائم وہ جانور جو سائم ہوں (بدایع ۱۶/۲)۔

مذکورہ اموال پر زکوٰۃ کے وجوب کے لئے پانچ شرائط ہیں: (۱) مطلق ملک، (۲)

ملک مطلق یعنی ملک تام، (۳) نماء خواہ حقیقتہً ہو جیسے اموال تجارت اور سوائم، خواہ نما حکماً ہو جیسے

سونا اور چاندی، (۴) مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا جس کی وجہ سے غناء کا تحقق ہوتا ہے،

(۵) حولان حول، اس لئے کہ مال میں نماء کے حصول کی خاطر مدت درکار ہے اور استثناء کے

لئے کم از کم ایک سال چاہئے۔

## ملک تام کی تعریف

”وہو أن يكون مملوكا له رقبة ويملأ وهذا قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر: اليد ليست بشرط وهو قول الشافعي“

(ملک تام یہ ہے کہ مال کی ذات پر ملک ہو اور وہ مال قبضہ مالک میں بھی ہو، امام زفرؒ و امام شافعیؒ کے یہاں ملک تام میں قبضہ شرط نہیں ہے)۔

”والمراد بالملك التام القدرة على التصرف من غير أن يلزم بهذا التصرف تبعه في الدنيا ولا في العقبى“ (حامیہ رد المحتار ۲/۲۶۰)۔

(ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو تصرف پر اس طرح قدرت حاصل ہو کہ تصرف سے اس پر کوئی مواخذہ دنیوی یا اخروی عائد نہ ہوتا ہو)۔

ملک تام کی روشنی میں سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

جواب: ۱- بیع کے قبضہ مشتری میں نہ آنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱- بیع سلم میں قیمت کی ادائیگی کے بعد بیع سپرد کرنے کا وقت آنے تک بیع مشتری کے قبضہ میں نہیں ہے۔

۲- خیاب شرط کی بنا پر بائع کے قبضہ میں ہو۔

۳- بلا کسی شرط کے بیع بائع کے قبضہ میں ہو۔

۴- بیع بائع کے پاس سے روانہ ہو چکی ابھی راہ میں ہے۔

۵- بیع بائع کے پاس سے روانہ ہو کر گم ہو گئی ابھی مشتری تک نہیں پہنچی، البتہ ریلوے یا

ٹرانسپورٹ وغیرہ کا وثیقہ (رسید) موجود ہے۔

۶- راہ میں گم ہوئی، لیکن کوئی وثیقہ موجود نہیں، جیسے آنگڑیا کی معرفت۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں ملک تام کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر بائع کو جو قیمت

پہنچ چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اگر قیمت مستفاد فی المصاب ہے تو حولان حول کے بغیر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی قیمت سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ بائع رقبۃ وید ا قیمت میں متصرف ہے۔

مذکورہ بالا جملہ صورتوں میں مشتری پر قبضہ مبیع سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ مشتری متصرف نہیں، قبضہ سے پہلے مشتری کے لئے مبیع کافر وخت کرنا جائز نہیں ہے، لہذا اگر چہ قبضہ سے پہلے پورا سال گزر جائے تب بھی مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مبیع خواہ ریلوے سے بائع نے روانہ کی ہو یا ٹرانسپورٹ سے، خواہ راہ میں گم ہو کر وثیقہ موجود ہو یا نہ ہو، یہ بائع کی طرف سے روانگی ترسیل ہے اور ترسیل بائع کی صورت میں مبیع جب تک مشتری کے پاس پہنچ نہ جائے تسلیم مبیع ثابت نہیں ہوتی۔

ریلوے ٹرانسپورٹ کے ذریعہ بائع مال بھیجتا ہے تو یہ ترسیل ہے، ترسیل میں تسلیم نہیں ہوتی، ہاں توکیل میں تسلیم ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر مشتری نے ایک شخص کو معین کر دیا کہ مال اس کو دیدینا اور اس معین شخص نے ذمہ داری لے لی تو یہ شخص مشتری کا وکیل ہو گیا، جب اس نے مال پر قبضہ کر لیا تو اصل کا قبضہ شمار ہوگا، اس لئے اس صورت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

”مشتری نے بائع سے کہا کہ تم اس کو تول لیں اور اپنے یا میرے غلام کے ساتھ اس کو بھیج دینا بائع نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں برتن ٹوٹ گیا، تو بائع کا نقصان شمار ہوگا مگر یہ کہ مشتری نے بائع سے اس طرح کہا کہ اس غلام کو مال دیدینا (اور غلام نے ذمہ داری لے لی) تو یہ غلام کو وکیل بنانے کی صورت ہوگی اور غلام کو دیدینا مشتری کو دیدینے کے حکم میں ہوگا“ (رد المحتار ۴/۵۶۳)۔

پہلی صورت ترسیل کی ہے دوسری صورت توکیل ہے: ”هذا توکیل والأول

توسیل“ (تقریرات رافعی ۱۱۹/۳)۔

اسی طرح فرماتے ہیں:

”شہر میں لکڑیاں خریدیں پھر مشتری کے گھر پہنچاتے وقت کسی غاصب نے لکڑیاں غصب کر لیں تو بائع کی لکڑی گئی، اس لئے کہ بائع پر مشتری کے گھر پہنچا کر سپرد کرنا ضروری ہے، عرف کی بناء پر“ (رد المحتار ۴/۵۶۳)۔

علامہ رافعی فرماتے ہیں:

”لا دخل لهذه العلة في الحكم بل العلة هي تحقق الهلاك قبل التسليم ولا فرق بين كون المبيع حطباً أو غيره“ (تقریرات رافعی)۔  
(عرف کو اس میں دخل نہیں ہے بلکہ اصل علت تسلیم سے پہلے ہلاکت کا تحقق ہے، اسی طرح بیع لکڑی ہو یا دوسری چیز حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر مشتری نے کسی کو وکیل بنا دیا ہے تو وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ شمار ہوگا، اور تسلیم کامل ہو جائے گی، اور اگر مشتری نے کسی کو وکیل بنایا تو اس صورت میں اگر چہ مشتری کے امر سے مال بھیجا ہو وہ ترسیل میں داخل ہے، اور ترسیل کی صورت میں تسلیم الی مشتری اس وقت متحقق ہوگی جب مال مشتری کے قبضہ میں پہنچ جائے۔

اس لئے ریلوے ٹرانسپورٹ، آنگریہ وغیرہ ذرائع سے بائع کا مال بھیجنا ترسیل ہے، اس صورت میں قبضہ مشتری سے پہلے تسلیم ثابت نہیں ہوتی اور قبضہ بھی نہیں ہے، اور جو مال مشتری کے قبضہ تصرف میں نہ آیا ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اگر چہ مشتری نے قبضہ کرنے کے بعد مال روانہ کیا مشتری نے ریلوے ٹرانسپورٹ وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے بائع سے مال منگوا لیا ہے تو ریلوے وغیرہ مشتری کے وکیل ہوں گے، ایسی صورت میں مال وصول ہونے پر قبضہ کے وقت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جملہ صورتوں میں بائع پر بیع کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ بیع بائع کی ملک سے نکل گئی ہے۔

جواب: ۲- ڈپوزٹ: ڈپوزٹ میں مالک مکان کو عرفاً حق تصرف حاصل ہوتا ہے اور ڈپوزٹ سے مقصد بھی تصرف و انتفاع ہے، اس لئے ودیعت و رہن سے اس کی حیثیت کچھ مختلف ہے۔ اس لئے مالک پر دین قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے اور خود کرایہ دار (صاحب ڈپوزٹ) کے لئے بھی مالک مکان پر قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے۔

مستقرض قرض کا مالک ہو جاتا ہے، طرفین کے یہاں تو صرف قبضہ سے مالک ہو جاتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرض میں تصرف سے مالک ہو جاتا ہے، اس لئے صاحب مکان پر اس رقم کی زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر یہ رقم مشغول بالدين نہ ہو، یعنی اس کے پاس ڈپوزٹ کے علاوہ رقم ضرورت سے زائد بقدر نصاب موجود ہو، جو ڈپوزٹ کے دین کو ادا کرنے کے لئے کافی ہو، اس صورت میں اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو ڈپوزٹ مال مستفاد میں داخل ہو کر سال رواں کے حساب میں آجائے گی، ورنہ حوالان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر ڈپوزٹ مؤجل ہے، طویل مدت مقررہ تک کرایہ دار کی طرف سے مطالبہ کا اندیشہ نہیں ہے تو دین مؤجل کے حکم میں آجائے گی۔ جس کا بیان دین کے ذکر میں آ رہا ہے۔

کرایہ دار کا مالک مکان پر دین قوی ہے، قرض دین قوی میں داخل ہے، اس لئے واپس ملنے کی صورت میں سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔

حضرت علاء الدین <sup>حصکلی</sup> فرماتے ہیں:

”ویملك المستقرض القرض بنفس القبض عندهما أى الإمام  
ومحمد خلافاً للثانى: القرض لا يتعلق بالجائز من الشروط فالفاسد منهما لا  
يبطله ولكنه يلغور د شئى اخر“ (درمنازع الشای ۵/ ۱۶۳)۔

جواب: ۳- اجارہ کی رقم پیشگی ادا کر دینے کی صورت میں مالک مکان پوری رقم کا مالک فوراً نہیں ہو جاتا، بلکہ اجارہ میں ملک سائے سائے بدلین میں ثابت ہوتی ہے، اس لئے کم از کم ایک دن

گزرنے پر ایک روز کے کرایہ کا مالک بنے گا، بقیہ رقم ودیعت سمجھی جائے، کرایہ دار کی رقم کرایہ دار کی ملک سے نکلی نہیں ہے، فسخ کرایہ پر واپس مل سکتی ہے، اس لئے کرایہ دار پر اپنی رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کرایہ دار کی جس قدر رقم حولان حول سے قبل کرایہ میں مستحق بنے گی، زکوٰۃ سے خارج ہو جائے گی، اور حولان حول کے وقت جو رقم مستحق نہیں بنی ہے حساب زکوٰۃ میں معدود ہوگی۔

مالک مکان پر پوری رقم کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، بلکہ جس قدر کرایہ کا وہ مستحق بن رہا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس قدر رقم کا مستحق بن گیا ہے وہ رقم مال مستفاد میں شمار ہو کر دوسرے مال زکوٰۃ کے ساتھ حساب میں آجائے گی، حولان حول شرط نہیں، اگر وہ پہلے سے صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ مستحق کرایہ سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو زکوٰۃ کی دیگر شرط کے ساتھ حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی (۵۶/۱)۔

جواب: ۴- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم وقف ہے کسی کی ملک میں نہیں ہے، زکوٰۃ کی رقم ہے، تو اس پر دوبارہ زکوٰۃ نہیں، اس کی تملیک کے بعد مالکین پر صاحب نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ آئے گی، وقف کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اس لئے کہ مطلق ملک (شرط) مفقود ہے۔

”وَأَمَّا الشَّرَائِطُ الَّتِي تَرْجَعُ إِلَى الْمَالِ فَمِنْهَا الْمَلِكُ فَلَا تَجِبُ الزَّكَاةُ فِي سِوَانِ الْوَقْفِ وَالْخَيْلِ الْمَسْبُورَةِ لِعَدَمِ الْمَلِكِ وَهَذَا لِأَنَّ فِي الزَّكَاةِ تَمْلِيكَاً وَالتَّمْلِيكَ فِي غَيْرِ الْمَلِكِ لَا يَتَّصِرُ“ (بدائع ۹۲)۔

جواب: ۵- جو مال بطور حرام کسی کے پاس آیا، جیسے رشوت کا مال یا سود کا مال یا مغصوب مال اگر علیحدہ محفوظ ہو تب تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، ہاں اگر اپنے مال کے ساتھ اس طرح محفوظ کر دیا کہ تمیز مشکل ہے تو اب امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اس شخص کے ذمہ میں مال غیر کا ضمان

لازم ہو گیا، کیونکہ مال غیر مستہلک ہو گیا اور جب مال غیر کا ضمان ذمہ میں واجب ہو گیا تو محفوظ مال پورا اس کا مملوک بن گیا، اس لئے اس مال پر زکوٰۃ لازم ہوگی، پورے مال پر زکوٰۃ آئے گی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے مال غیر کے مال سے محفوظ رہتے ہیں، وراثت کی بہ قاعدہ تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے قمار، ربا، رشوت اور غصب کی بناء پر، اس لئے مالکین کے لئے تمیز و حساب دشوار ہے، تو مالکین پر سہولت کی خاطر، نیز فقراء کے لئے بھی نفع ہے، اس لئے زکوٰۃ پورے مال پر لازم ہوگی۔

لیکن مخلوط مال پر زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہے کہ جب مخلوط مال کے علاوہ حلال مال علیحدہ موجود ہو جو بقدر نصاب بھی ہو اور فاضل عن الحاجة والدین بھی ہو، جس میں خود مال حرام کا دین بھی شامل ہے، اسی طرح اگر مخلوط مال میں حلال حصہ نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جاتا ہے اور علیحدہ حلال مال مخلوط مال میں مال حرام کے دیون کو پورا کر دیتا ہو تب زکوٰۃ پورے مال مخلوط پر آئے گی۔ اگر پورا ہی مال خبیث ہو تو واجب التصدق ہی ہے، پھر اس کے بعض حصہ کو زکوٰۃ کی حیثیت سے واجب التصدق کہنے میں کوئی نیا فائدہ نہیں ہے (درمختار رد المحتار ۲/۲۹۱)۔

جواب: ۶- دین کی تین قسمیں ہیں: دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔

دین قوی وہ ہے کہ جو کسی کے ذمہ مال تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہو۔ جیسے مال تجارت کا ثمن، خواہ کپڑے یا غلام کا ثمن ہو، یا مال تجارت کی آمدنی ہو، دین قوی کے اندر وجوب زکوٰۃ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ مدت کی ادائیگی کا مکلف نہیں ہے جب تک کہ چالیس درہم قبضہ میں نہ آجائیں، جب چالیس درہم قبضہ میں آجائیں تب ایک درہم زکوٰۃ لازم ہوگی اور صاحبین کے نزدیک جس قدر مقبوض ہو کم یا زیادہ مقبوض کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

دین ضعیف وہ ہے جو کسی کے ذمہ بلا بدل کے واجب ہوتا ہے، خواہ اس کے وجوب



میں بندہ کے فعل کو دخل ہو، جیسے مال وصیت یا بندہ کا فعل دخل نہ ہو، جیسے میراث، اور دین ضعیف اس حق کو بھی کہتے ہیں جو غیر مال کے بدلہ میں لازم ہوتا ہے، جیسے مہر، بدل خلع اور بدل صلح عن النصاص، نیز بدل کتابت، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے دین میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، جب تک پورا مال قبضہ میں آکر اس پر سال گزر نہ جائے۔

دین وسط وہ دین ہے جو مال غیر تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہے، جیسے خدمت کے غلام کا شمن یا روزانہ استعمال کے کپڑوں کی قیمت، حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اس دین کے حکم کے بارے میں دو روایتیں ہیں، اصل میں مذکور ہے کہ دین وسط میں قبل قبضہ زکوٰۃ تو واجب ہوتی ہے، لیکن ادا کا مکلف نہیں ہے جب تک پورے دو سو درہم مقبوض ہونہ جائیں، جب دو سو درہم مقبوض ہو جائیں گے، تو گزشتہ مدت کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

ابن سنانہ کی روایت عن ابی یوسف عن ابی حنیفہؒ یہ ہے کہ دین وسط میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے یہاں تک کہ دو سو درہم (نصاب کامل) مقبوض ہو کر اس پر قبضہ کے بعد ایک سال گزر جائے، دونوں روایتوں میں صحیح روایت یہی ہے، صاحبین فرماتے ہیں: دین سب برابر اور سب قوی ہیں (فرق درجات نہیں ہے) سب سے زکوٰۃ قبضہ سے قبل ہی واجب ہو جاتی ہے، سوائے دین علی العاقلہ اور مال کتابت کے، اس میں زکوٰۃ بالکل واجب نہیں ہوتی، یہاں تک کہ قبضہ کے بعد سال گزر جائے۔

دین میں اس حیثیت سے کہ ذمہ میں ایک حق ہے (کوئی مال مملوک رقبۃ ویداً نہیں ہے)، اس لئے زکوٰۃ بالکل واجب ہونا ہی نہیں چاہیے جس طرح مال شمار میں قبضہ نہ ہونے کی بناء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اسی طرح تمام دیون میں قبضہ نہ ہونے کی بناء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونا چاہیے، لیکن دین قوی (جس میں قرض بھی شامل ہے، فتح القدر) مال کی تجارت کا بدلہ ہے، اور مال تجارت جو مبادلہ ہے، قبضہ کے قابل ایک عین ہے، جس طرح مبادلہ (بیع) مملوک رقبۃ

وید ہے، بدل (ثمن) بھی مملوک رقبۃ ویداً سمجھ لیا گیا، اس لئے اس میں زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔ اسی طرح دین وسط میں بھی صحیح روایت کی بنا پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے، کیونکہ بدل مال غیر تجارت ہے، چنانچہ مال غیر تجارت، جبکہ حقیقتہً مقبوض ہو تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی تو بدل کے اندر بھی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، مقبوض ہونے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئولہ صورت میں اگر دین سے مراد قرض ہے تو قرض پر مقرض کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے، کیونکہ قرض دین قوی ہے اگرچہ یہ تصرف اس پر حاصل نہیں ہے، اور مستقرض بھی اس قرض کا مالک بن چکا ہے، اگر یہ قرض مشغول بالدين ہے تو مستقرض پر زکوٰۃ واجب نہیں، اور اگر قرض مشغول بالدين نہ ہو اور نصاب تک پہنچ جاتا ہو تو مستقرض پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر قرض نصاب تک نہیں پہنچتا، اور مستقرض پہلے سے صاحب نصاب خالی عن الدين ہے تو قرض مال مستفاد میں شمار ہو جائے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی، مال منول مؤثر نہ ہوگی، قرض مشغول بالدين ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض مؤجل ہو طویل الاجل ہو، مثلاً دس پانچ سال کے بعد ہی ادا کرنا ہے، اس سے پہلے کوئی مطالبہ نہیں ہوگا، تو اس صورت میں، جیسا کہ آگے آرہا ہے، مستقرض پر قرض کی زکوٰۃ آئے گی۔

اگر قرض کے سوا کوئی اور دین قوی ہے، مال تجارت کا بدل ہے تو دائن (باع) پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جب مشتری کے پاس سے ثمن وصول ہوگا، ماضی کی زکوٰۃ لازم ہوگی، جس قدر وصول ہوتا جائے زکوٰۃ ادا کرنا جائے یا کم از کم چالیس درہم وصول ہونے پر زکوٰۃ ادا کرے گا۔

مدیون (مشتری) کے پاس مال تجارت آپکا ہے، اس کا حساب مال تجارت میں ہوگا، مشتری پر بائع کا جو ثمن ذمہ میں باقی ہے، مشتری اس کا مالک نہیں ہے، نہ مشتری کا ثمن پر بحیثیت محسوس کوئی قبضہ ہے، مشتری اس لئے مالک نہیں ہے کہ وہ بیع کا مالک بن چکا، اگر بدل کا مالک ہو تو بدلین کا ایک ملک میں اجتماع ہو جائے گا جو ظاہر الفساد ہے، اس لئے مشتری پر مال منول کرنے

کی صورت میں کوئی زکوٰۃ ثمن پر نہیں آئے گی، مال منول کا گناہ ضرور ہوگا اگر بے وجہ ہو، کیونکہ جو مال تجارت میں مشتری نے لگایا ہے وہ خود مشتری کا ہے۔ ”الدرہم والدنانیر لا تتعین فی العقود“۔

ہاں اگر ثمن عرض غیر معین ہو تو جب تک مشتری کے عرض تجارت میں شامل ہے تو عرض تجارت کی مجموعی زکوٰۃ میں شامل رہے گا، مشتری کے ذمہ زکوٰۃ آئے گی، عرض معین یا منفصل ہو تو مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ وہ مالک نہیں ہے، اور بائع پر دونوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ تسلیم نہیں ہوئی اور یہ تصرف حاصل نہیں ہے۔

جواب: ۷۔ پر اوپنٹ فنڈ دین ضعیف میں داخل ہے، کیوں کہ بدل نما ”لیس بمال“ ہے، اجرت ہے، اس لئے اس میں مجموعی رقم میں گزشتہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، وصول ہونے کے بعد حوالان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو مال مستفاد میں شمار ہوگا، اگر ایسا اخیر ہے جس کو ملازمت میں اپنا کچھ مال لگانا پڑتا ہو، جیسے صباغ (رنگریز) کہ رنگ اپنا استعمال کرتا ہے تو رنگ کی قیمت مستاجر پر دین قوی میں داخل ہو کر اس کی زکوٰۃ وصول ہونے پر ادا کی جائے گی۔

### دوسری شرط نما

نما کا معنی زیادتی و اضافہ ہے، مال نامی میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

نما خواہ حقیقتہً مال میں ہو رہا ہو، جیسے اموال تجارت اور سائزہ جانور، خواہ نما حکماً موجود ہو جیسے سونا چاندی میں۔ لیکن کسی بھی صورت میں نما کا بالفعل ہونا ضروری نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ مال کو طلب زیادت کے لئے تیار رکھنا، خواہ بالفعل زیادتی ہو رہی ہو جیسے دکان کھلی ہے اور بکری جاری ہے، یا تقدیراً نما موجود ہے، جیسے دکان بند ہے آٹھ دس روز کے لئے یا کھلی ہے، مگر گاہک نہیں ہے، تو اگرچہ بالفعل نما نہیں ہے، لیکن تقدیراً اس کو مال نامی کہتے ہیں، اسی طرح سونا چاندی کہ

فطرۃ نما کے لئے ہے، کسی بھی تجارت میں ثمن بننے کی صلاحیت فطری طور پر اس میں موجود ہے، طلب زیادت کی اہلیت رکھتا ہے، اگرچہ مدتہائے دراز سے قفل میں بند ہو، لیکن بالقوۃ نما اس میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ وہ اموال جو برائے استعمال ہیں اس میں نما حاجت اصلیہ سے بڑھ کر نہیں ہوتا، اس میں نما ہو بھی جیسے پالتو جانوروں میں تو زیادت بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہوتی ہے۔

### حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

حاجت اصلیہ جو انسان کو بلاکت تحقیقی یا تقدیری سے محفوظ رکھے، بلاکت تحقیقی سے حفاظت کی صورت نفقہ میں ہے کہ انسان روزمرہ کے خرچ، رہنے کے لئے گھر، آلات جنگ اور سردی و گرمی سے بچنے کی خاطر ضروری کپڑوں کے بغیر بلاک ہو جائے گا، اور تقدیری بلاکت جیسے کہ قرض ہے، مقروض اگرچہ صاحب نصاب ہو، لیکن اس کو اپنا مقبوض نصاب کی ادائیگی کے لئے خرچ کر دینا ضروری ہوتا ہے، اپنی ذات کو قید سے بچانے کے لئے جو بلاکت کی طرح ہے، کسب معیشت کے لئے آدمی کو ضروری ہے آلات حرفت کی، گھر کے ضروری سامان کی، سواری کے لئے جانور کی اور اہل علم کے لئے کتب علم بھی ضروریات میں شامل ہیں، کیونکہ جہالت ان کے نزدیک موت کی طرح ہے (ردالمحتار ۲/۲۶۶)۔

حاجت اصلیہ کی تعریف جامع ہر زمانہ کی حوائج اصلیہ پر حاوی ہے، اس لئے کوئی نئی تعریف کی جستجو کی ضرورت باقی نہیں رہتی، نفقہ ہر زمانہ کے معیار اور ہر شخص کی اپنی حالت کی لحاظ سے معتبر ہوگا، اسی طرح گھر کا معیار بھی ملحوظ رہے گا، ہاں آلات جنگ صرف مدافعت نفس کی حیثیت و ضرورت کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے، کیونکہ اجتماعی مدافعت کی ذمہ داری اس دور میں جنگ کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ حکومت اور خاص فوجوں کی ذمہ داری میں داخل ہے،

عوام کو ایسے آلات جنگ کی ضرورت نہیں ہے، کپڑے بھی زمانہ، ملک اور موسم کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے، اسی طرح آلات حرفت، حرفت کی بدلتی ہوئی شکلوں کے مطابق ملحوظ ہوں گے، اس زمانہ میں بڑی بڑی فیکٹریاں بھی آلات حرفت میں محسوب ہو جائیں گی، عمارت منزل ہر شخص کی اپنی ضرورت، رہن سہن کے تقاضہ کے مطابق مطلوب ہوتی ہے، مثلاً فرنیچر ایک ڈاکٹر کے لئے اس کے معیار کا ہوگا، ایک عالم کے لئے اس کے معیار کا ہونا چاہیے، جس میں مثلاً کتب کی الماریاں اور ملنے والے احباب کے لحاظ سے گھر کے اسباب ہوں گے، تاجر کے لئے فون اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے فرنیچر ہوگا، مطبخ کے اسباب اعلیٰ و ادنیٰ شہر و دیہات کے لحاظ سے جدا ہو سکتے ہیں، لوکر، گیس، بجلی فریج وغیرہ جدید کھانے پکانے کے آلات کا معیار ہر شخص کا جدا ہو سکتا ہے، غرض کہ ملک ملک، موسم موسم، عرف عرف اور معیار معیار کا فرق ملحوظ رہے گا، دکنی گھڑی بھی اور دیواری ٹیمبل گھڑی بھی ضروریات میں داخل ہے، آج کل عالم کا کل نظام گھڑی سے وابستہ ہے، سواری کے لئے ایک اسکوٹر، یا کم از کم سائیکل یا بس رکشہ وغیرہ کا کرایہ ضروریات میں داخل ہو سکتا ہے، سفر میں آدمی کی شان کے لحاظ سے A کلاس اور B کلاس کا فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے، خاص پیشہ والے جن کو کار کی ضرورت ہو ان کے لئے کار بھی ضروریات میں داخل ہو سکتی ہے۔

### چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

اگر حکومت کا دین مؤجل ہے جس کی معیاد طویل الاجل ہو اور عام طور پر حکومت کے قرضہ اجل سے پہلے مطالبہ نہیں ہوتا، اس لئے اس قسم کے طویل المیعاد قرض مؤجل میں مقروض جس قدر ایک سال میں ادا کرتا ہے اس قدر ممال تجارت میں سے منہا کر کے کل مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرے، کیوں کہ اس قرض میں بالفعل مطالبہ من جہت العباد نہیں ہے، نیز جب ہر سال ادا کئے جانے والے قرض کو زکوٰۃ کے ممال میں سے منہا کر دیا گیا تو مثلاً چالیس سال میں مجموعی رقم کو رنمنٹ کو ادا کی ہے، اس مجموعی قرض کی زکوٰۃ منہا ہو جائے گی، اور یہی مطلوب ہے۔

چنانچہ قرض مؤجل کے بارے میں علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:  
 ”أو مؤجلاً: عزاه إلى المعراج إلى شرح الطحاوی: وقال عن أبي  
 حنيفة لا يمنع، وقال الصلبر الشهيد: لا رواية فيه ولكل من المنع وعدمه وجه  
 زاد القهستانی عن الجواهر الصحيح أنه غير مانع“ (ثانی ۲۶۱/۲)۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

اگر تمام یا بعض شرکاء صاحب نصاب ہیں تو ان پر زکوٰۃ لازم ہوگی، ان کے اپنے اپنے  
 اموال کے لحاظ سے خواہ وہ اموال کمپنی میں شامل ہوں یا خارج ہوں، اگر کوئی بھی صاحب نصاب  
 نہیں ہے تو کمپنی پر مجموعی لحاظ سے (احناف کے نزدیک) زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ انفرادی  
 حیثیت سے جو بھی صاحب نصاب ہوں پر زکوٰۃ آئے گی، ایک شخص ایک کمپنی میں اپنے حساب  
 کے لحاظ سے صاحب نصاب نہیں ہے، لیکن اس حصہ کو اپنے گھر میں رکھے اموال زکوٰۃ کے ساتھ  
 یا دوسرے اموال تجارت کے ساتھ حساب میں لایا جائے تو صاحب نصاب بن جاتا ہے، تو اس  
 حیثیت سے دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ اس حصہ کی زکوٰۃ بھی اس شخص پر لازم ہوگی۔

”ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترک من سائمة و مال تجارة  
 وإن تعدد النصاب تجب إجماعاً“ (رد المحتار ۲/۳۰۳)۔

### ہیرے جوہرات کی زکوٰۃ

ہیرے جوہرات اور اموال غیر نامیہ پر بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے، اگرچہ ہزاروں کی  
 قیمت پر پہنچیں، جس طرح غیر نامی زمین و جائداد پر نہیں ہوتی، اگر تجارت کے لئے ہوں تو اموال  
 تجارت کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی طرح عورتوں کے ہیرے جوہرات کے زیور پر  
 زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں زکوٰۃ وقت ادا میں عام بازاری بھاؤ کے حساب سے ادا کی جائے گی، اگر تھوک ہے تو تھوک کا بازاری بھاؤ بچھل کر ہے تو پھٹکر کا بازاری بھاؤ، دونوں طرح تجارت ہو اور تمیز ممکن ہو تو دونوں کے لحاظ سے ورنہ غالب جو بھی ہو اس کا لحاظ کر لیا جائے۔

اگر کوئی شخص گزشتہ کئی سالوں کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ نہ وہ مال اس وقت موجود ہے، نہ وہ بھاؤ ہے، اس لئے اس کو گزشتہ سال کے (اختتام پر جو اس کے لئے یوم ادا کا حکم رکھتا ہے) لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی (سٹائی و ریفرنس ۳۰/۲۲)۔

ارضی تجارت کی زکوٰۃ میں یوم ادا کے بازاری نرخ کا اعتبار کرنا چاہیے، متوقع نرخ نہ اس وقت موجود ہے نہ اس کا حصول ضروری ہے، سود ہی نہ ہو ایک دو سال گزر جائیں یا بھاؤ ہی گھٹ جائے، اس لئے متوقع پر مدار رکھائی نہیں جاسکتا، متوقع مل جائے گا تو نقد میں مال مستفاد کی حیثیت سے شامل ہو جائے گا۔

### شیئرز پر زکوٰۃ

شیئرز کی حقیقت کے لحاظ سے یہ اشتراک فی التجارة ہے، اس لئے تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر کمپنی میں حصہ دار آلات حرفت (فیکٹری) میں ہے تو آلات حرفت پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، اس لئے ایسے شیئرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، ہاں جو آمدنی شیئرز سے حاصل ہوگی، اس پر زکوٰۃ آئے گی، وقت ادا میں شیئرز کا جو بھاؤ مارکیٹ میں ہوگا وہ معتبر ہوگا۔

### بونڈز

مذکورہ صورت میں بونڈز قرض ہے اور دین قوی ہے، اس کی زکوٰۃ جس قدر وصول ہوتی جائے ادا کرنی ہوگی، گزشتہ سالوں کی بھی ادا کرنا ہوگی، اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے

تو حوالان حول کی شرط بھی نہیں اگر سال بہ سال کر دیتا ہے تو جائز ہے، یہ زکوٰۃ مؤجل شمار ہوگی۔

### مخبر ثانی

سونا اور چاندی میں سے جس نصاب کا بھی مالک ہو جائے صاحب نصاب کو خفی قرار دیا جائے گا، اس بارے میں ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوتا ہے، اسی طرح مال تجارت کے نصاب کی تقویم کے لئے ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوگا، اس زمانہ میں چاندی ادنیٰ ہونے کی وجہ سے تقویم کے لئے متعین ہے، نفع للفقراء بھی یہی ہے۔

### مخبر ثالث

#### مصارف زکوٰۃ

غیر مستطیع طالب علم کو اگر زکوٰۃ کا چک دیدیا جائے اور طالب علم اس چک کے وصول کرنے کا مجاز مدرسہ کو بنا دے، مدرسہ چک کی رقم وصول کر لے یا خود طالب علم چک کی رقم وصول کر کے مدرسہ میں دیدے تو تملیک کی صورت ہو جاتی ہے، یہ صورت جائز ہے۔

#### مہتمم کی وکالت

مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہے، اس لئے کہ طلبہ نے اس کو وکیل نہیں بنایا، تو وکیل نام ہے ”إقامة الغير مقام نفسه“ (درختا ۵۰۹/۵۰۹) تو جب تک طلبہ کی طرف سے اپنی خاطر کسی خاص رقم کے وصول کرنے کے لئے مہتمم کو وکیل بنایا نہیں جائے گا، تو وکیل وجود میں نہیں آئے گی، معین طلبہ یا طلبہ کی انجمن مہتمم کو وکیل بنا دے یا ہر طالب علم سے داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں تو وکیل کرائی جائے تو مہتمم وکیل بن جائے گا، وکیل مؤکل کا نائب ہوتا ہے۔



”لیس کل اجر تو کیلا بل لا بد مما یفید کون فعل المامور بطریق  
النیابة عن الآخر فلیحفظ“ (در مختار ۵/۵۰۹)۔

### کیا سفیر ”عاملین علیہا“ میں داخل ہے؟

چندہ وصول کرنے والا سفیر محض سفیر اور رسول ہے، وکیل و نائب نہیں ہے، رسول کے لئے کسی بھی عقد میں عقد کی اضافت مرسل کی طرف ضروری ہوتی ہے، وکیل کے لئے کسی کام میں مؤکل کی طرف نسبت ضروری نہیں ہے، سوائے امور چند کے (نکاح، خلع، بیہ وغیرہ)۔  
سفیر نہ معطیس زکوٰۃ کا نائب ہے، نہ مستحقین کا، اس لئے کہ عمل تو کیل حقیقتاً یا حکماً موجود نہیں ہے، سفیر صرف مدرسہ کا رسول (قاصد) ہے، سفیر مدرسہ کے نام سے چندہ کرتا ہے، مدرسہ کی رسید پیش کرتا ہے، تب ہی اس کو معطیس معتمد سمجھتے ہیں، یہی رسالت کی حقیقت ہے، نام بھی تو اس کا سفیر ہے۔

جب سفیر کسی کا نائب نہیں ہے تو سفیر کو ”العاملین علیہا“ کے حکم میں شمار نہیں کیا جاسکتا، عامل زکوٰۃ سلطان کا نائب ہوتا ہے:

”وَأَمَّا الْعَامِلُونَ عَلَيْهَا فَهُمْ الَّذِينَ نَصَبَهُمُ الْإِمَامُ لَجَبَايَةِ الصَّدَقَاتِ“  
(بدائع)۔

(عاملین وہ ہیں جن کو امام وصول صدقات کے لئے مقرر کرتا ہے)۔

عامل کا پورا وقت تحصیل زکوٰۃ میں صرف ہوتا ہے، عامل کو جو کچھ ملتا ہے وہ بطور اجرت نہیں بلکہ اپنے اور اپنے احوال کی کفایت کی حیثیت سے ملتا ہے، عامل خود مصرف میں شامل ہے، اس کا حق اس مال زکوٰۃ سے متعلق ہوتا ہے جو اس نے وصول کیا ہے، اگر اس کا وصول کردہ مال ہلاک ہو جائے تو عامل کا حق بھی ساقط ہو جاتا ہے، نیز عامل کا یہ حق مال زکوٰۃ میں اس لئے متعلق

---

ہوتا ہے کہ درحقیقت اصحاب مال کے کام میں وہ مصروف ہے، یعنی ان کی زکوٰۃ سلطان یا امیر تک لے جاتا ہے، اس لئے ان کے اموال میں اس کی کفایت متعلق ہوتی ہے، اس کی عمالہ کو اجرت قرار نہیں دے سکتے، اس لئے کہ عمالہ مجہول ہے، کیوں کہ عامل اور اس کے عوان کے لئے کفایت کی مقدار متعین نہیں ہے، امام شافعی کے یہاں بھی اس کو اجرت قرار نہیں دے سکتے، اس لئے کہ عامل کا عمل مجہول ہے، وہ کس قدر صدقات لائے گا معلوم نہیں، اس لئے اجرت نامعلوم ہو جائے گی، اور اجارہ میں بدلین میں سے کسی کی بھی جہالت اجارہ کے جواز کے لئے مانع ہے، تو پھر یہاں تو دونوں بدل مجہول ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ سفیر مدرسہ نہ سلطان کی طرف سے ساعی ہے کہ اس پر ذمہ داری ہے، خود کو تحصیل زکوٰۃ کے لئے فارغ رکھنے کی، نہ مدرسہ تحصیل زکوٰۃ کا حق لازم رکھتا ہے، نہ معطین پر مدرسہ میں دینا واجب ہے، سفیر کی حیثیت محض اجیر کی ہے، عامل کی حیثیت اجیر کی نہیں ہے، اس لئے سفیر عامل کے حکم میں نہیں ہے، ہاشمی کو عمالہ سے ممانعت ہے، عمالہ اگر اجرت ہوتی تو ہاشمی کو ممانعت نہ ہوتی۔

## اسلام کا نظام زکوٰۃ اور موجود معاشی مسائل کا حل

مفتی نسیم احمد قاسمیؒ

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم ترین مالی فریضہ ہے جس کی فرضیت کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے، اسلام کا نظام زکوٰۃ اجتماعی عدل اور تضامن و تکافل کا بہترین آئینہ دار ہے، اس کے اندر معاشرہ کے تمام معاشی اور اقتصادی مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے، اسلام کے نظام زکوٰۃ کے نفاذ اور قیام کے ذریعہ ایک ایسے پاکیزہ اور صاف ستھرے معاشرہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے جس میں امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، صنعت کار اور مزدور ہر طبقہ کے لوگ ایک دوسرے سے سیر شکر ہو کر اعتماد باہمی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں، نہ امیر غریب سے مالاں ہو اور نہ غریب امیر سے شکا کی، اسلام کے نظام زکوٰۃ کے ذریعہ دولت و ثروت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور دولت و ثروت سے ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوتا ہے، اس میں نہ تو فقراء و مساکین کا استحصال ہوتا ہے اور نہ ہی امراء اور اہل ثروت پر ظلم، آج دنیا کا جو معاشی ڈھانچہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نظام میں ہر طبقہ کے حقوق کی یکساں طور پر رعایت نہیں کی گئی ہے، آج کے موجودہ نازک حالات میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کا ”اجتماعی نظام زکوٰۃ“ قائم کیا جائے، زکوٰۃ مالداروں سے اجتماعی طریقے پر وصول کی جائے اور اس کے صحیح مصارف پر خرچ کی جائے، اس کیلئے ایک مضبوط اور منظم نظام قائم کیا جائے تاکہ زکوٰۃ کی

رقم کا استعمال صحیح طریقے سے ہو سکے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی جو ”اسلامک بینکنگ“ پر قابل قدر کام کر چکی ہے، اسے اس طرف بھی پیش قدمی کرنی چاہئے اور اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی راہ میں جو دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں ان کے حل کیلئے علماء، ماہرینِ فقہ و فتاویٰ اور قانون دانوں کی مدد لے کر اس کا ایک عملی خاکہ امت کے سامنے پیش کرنی چاہئے تاکہ امت کو اسکی خوبیوں سے بہرہ ور ہونے کا زریعہ موقع مل سکے۔ اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ میں وہ تمام خوبیاں اور محاسن موجود ہیں جنہیں لوگ انشورنس اور اس طرح کے دیگر نظاموں میں تلاش کرتے ہیں۔

وجوبِ زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محلِ زکوٰۃ (اموال) سے ہے

پہلی شرط - ملک تام

شریعتِ اسلامی نے وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ”ملک تام“ کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور صرف انہیں اموال میں زکوٰۃ واجب کی گئی جن پر انسان کو ”ملک تام“ حاصل ہو، وہ اموال جن پر انسان کو ملک تام حاصل نہیں ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس چیز پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور وہ چیز اس کے قبضہ و تصرف میں بھی ہو، اگر اس پر ملکیت حاصل نہ ہو صرف قبضہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے مالِ مکاتب، کہ اس پر اگرچہ مکاتب کو قبضہ حاصل ہوتا ہے، مگر وہ درحقیقت اس کے مولیٰ کی ملکیت ہے، اس لئے مکاتب پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اور اگر ملکیت حاصل ہو مگر قبضہ نہ ہو تو بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے مہر کی رقم قبضہ سے پہلے کہ عورت اس کی مالک تو ہوتی ہے، مگر اس پر قبضہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوتی، اسی طرح مالِ ضمار پر بھی ملکیت حاصل ہوتی ہے، مگر قبضہ نہیں ہوتا اس لئے اس کی زکوٰۃ قبضہ سے پہلے واجب نہیں ہوتی۔

ملک تام کا وجوبِ زکوٰۃ کے لئے شرط ہونا قرآنِ کریم کی آیت: ”تُخَذُ مِنْ أَمْوَالِهِمْ“

صَدَقَةٌ“ (سورہ توبہ: ۱۰۳) ”وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ“ (سورہ ذاریات: ۱۹) اور حدیث رسول: ”إِنَّ اللَّهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ فِي أَمْوَالِهِمْ“ سے ثابت ہے۔

### ملک تام کے شرط ہونے کی حکمت

ملک تام کے وجوب زکوٰۃ کی شرط ہونے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے یوسف القرضاوی نے لکھا ہے:

”اس شرط کا اعتبار اس لئے کیا گیا ہے کہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ یہ نہ صرف حریت، بلکہ انسانیت کا ثمرہ ہے، حیوان کو کسی چیز پر مالکانہ اختیارات اور حقوق حاصل نہیں ہوتے، یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ مالکانہ حقوق رکھتا ہے، ملکیت تملک کے فطری جذبہ کی تسکین کا سامان کرنے کے علاوہ انسان میں سیادت و قوت کا احساس بھی پیدا کرتی ہے، اور ملکیت تامہ انسان کو یہ اختیار عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے مملوک مال سے فائدہ حاصل کرے اور اس کے اضافہ اور نشوونما کا سامان کرے نیز بذات خود یا اپنے نائب کے ذریعہ اس کو نفع بخش کاموں میں لگائے، ایسی عظیم نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے، اس لئے اگر اسلام نے اس کے مالک سے زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو یہاں باعث تعجب نہیں ہے“ (فقہ کا کاغذ ۱۳۱/۱)۔

### ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام ایک فقہی اصطلاح ہے، فقہاء کرام ملک تام اور ملک مطلق کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں، ملک تام سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز پر انسان کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور اس شے پر اس کا قبضہ بھی ہو، اس کی تعبیر فقہائے کرام ”هُوَ الْمَمْلُوكُ رَقَبَةٌ وَبَدَأُ“ سے کرتے ہیں، یعنی وہ شے رقبہ (ذات) اور ید (قبضہ) دونوں لحاظ سے مملوک ہو، امر ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام

ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن شیبانی کے نزدیک ملک تام سے ملکیت اور قبضہ مراد ہے، اور جب کسی چیز پر انسان کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہوگا، تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، امام زفر بن ابہذیل کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے، حضرت امام شافعی بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں، ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضماریں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ کاسانی نے احوال سے متعلق شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ملک مطلق ہے، ملک مطلق سے مراد یہ ہے کہ اس شئی پر انسان کو ملکیت بھی حاصل ہو اور قبضہ بھی، یعنی باعتبار رقبہ وید وہ مملوک ہو، یہ ہمارے ائمہ ثلاثہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے، امام زفر کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے، امام شافعی کا بھی یہی قول ہے، پس ہمارے نزدیک مال ضماریں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور ان دونوں حضرات کے نزدیک واجب ہوگی“ (بواع ۹۷۲)۔

”البحر الرائق“ میں ہے:

”هو المملوك رقبۃ ویداً (البحر الرائق ۲۰۳/۲)، یعنی ملک مطلق سے مراد رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔“

شامی میں ہے:

”هو الملك یداً و رقبۃ“ (شامی ۲۵۹/۲) وہ رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا

ہے۔

”الفقه علی المناہب الأربعة“ میں ہے:

”حنفیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال قبضہ کے لحاظ سے مملوک ہو، پس اگر کسی چیز پر ملکیت حاصل ہو، مگر اس پر قبضہ نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے قبضہ سے

پہلے عورت کا مہر، ایسی چیز جس پر قبضہ ہو، مگر ملکیت حاصل نہ ہو، اس کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی، مالکیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اپنی مملوکہ اشیاء میں تصرف کا اختیار حاصل ہو، پس غلام کی تمام اقسام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ غلام کو کسی بھی صورت میں مال پر ”ملک تام“ حاصل نہیں ہوتی ہے، شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی قید سے غلام اور مکاتب کو نکالنا مقصود ہے کہ غلام کو سرے سے ملکیت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے اور مکاتب کو ناقص ملکیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے ان دونوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (فقہ علی الحدیث، ج ۱، ص ۵۹۲)۔

علامہ کاسانی کی صراحت کے مطابق شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی تعریف میں قبضہ شامل نہیں ہے، حنا بلہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اس مال پر قبضہ حاصل ہو، اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو اور اس میں اسے حسب منشاء تصرفات کا اختیار حاصل ہو، اور اس کے فوائد اسی کی طرف لوٹتے ہوں، لہذا مال مکاتب پر ان کے نزدیک بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا (بدائع، ج ۲، ص ۹۲)۔

ملک تام کے ذیل میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

### ۱- مال تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی حصولیابی نہیں ہو سکی اور وہ مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا، تو سوال یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ مشتری پر جس نے اس کی پیشگی قیمت ادا کر دی، مگر مال اس کے قبضہ میں نہیں آیا، یا اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جس نے اس کی قیمت وصول کر لی مگر سامان ابھی بھی اسی کے پاس ہے۔

بائع پر اس کی زکوٰۃ اس وجہ سے واجب نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اسے فروخت کر چکا ہے اور اس کی قیمت پر بھی قبضہ کر چکا ہے، اس لئے وہ مال اس کی ملکیت سے نکل چکا، پس ملکیت نہیں

پائی گئی اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت بنیادی شرط ہے، اب رہا یہ سول کہ خریدار پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر چند سالوں کے بعد وہ سامان اس کے قبضہ میں آیا تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی یا نہیں؟۔

اس سلسلہ میں فقہاء کے دو اقوال ملتے ہیں:

۱- پہلا قول یہ ہے کہ سامان تجارت قبضہ سے پہلے نصاب شرعی نہیں بنے گا اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی، اکثر مشائخ عراق کا یہی قول ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی وہ نصاب شرعی ہو جائے گا، اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی، بعض مشائخ کا اسی طرف رجحان ہے، ”فتاویٰ تارخانیہ“ میں ہے: ”یعنی خریدی ہوئی چیز جس پر قبضہ نہ ہو، مشائخ عراق کہتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے تمام ہی فقہاء کے نزدیک وہ نصاب شرعی نہیں ہوگی، دیگر مشائخ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو ثمن میں ہے، بعض مشائخ کہتے ہیں کہ بیع قبضہ سے پہلے بھی بالاتفاق نصاب ہے“ (۲۲۳/۲)۔

علامہ حصکھی صاحب ”در مختار“ نے عدم وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ ”ملک تام“ پر بحث کے ذیل میں لکھا ہے:

”ولا فیما اشتراہ لتجارة قبل قبضہ“ اور بیع قبل قبضہ میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

شامی نے اس عبارت کے تحت لکھا ہے کہ قبضہ سے پہلے تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔

”فیز کیہ ما مضی“ (شامی ۲۶۳/۲) اور قبضہ کے بعد تمام ہی سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔



قاضی خان نے سامان تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے، ان کے نزدیک قبضہ کے بعد جب اس سامان پر حوالان حول ہو جائے گا، تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

”ایک شخص کے پاس سائز بکری تھی اس سے دوسرے شخص نے بکری خریدی مگر اس پر قبضہ نہیں کیا یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا پھر اس پر قبضہ کیا، تو مشتری پر گزشتہ سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور قبضہ کے بعد جب سال پورا ہوگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ وہ بکری اپنے بائع کے پاس ثمن کے عوض مضمون تھی۔“

علامہ ابن نجیم نے بھی قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو ترجیح دی ہے، چنانچہ ”ملک تام“ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”فلا يجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض۔“

### قبضہ کی حقیقت

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر غور کر لیا جائے کہ شرعاً قبضہ اور تسلیم کی حقیقت کیا ہے اور قبضہ کا اصل مقصد کیا ہے، تاکہ اس بات کا فیصلہ آسان ہو جائے کہ وہ سامان تجارت جس کی پیشگی قیمت ادا کی جا چکی اور وہ ابھی مشتری کے پاس نہیں آیا تو اس پر مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟۔

فقہ طاہر بن عبدالرشید نے ”خلاصۃ الفتاویٰ“ کے ”کتاب المبیوع“ میں ایک باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے ”فیما یكون قبضا وفیما لا یكون“ یعنی کسے قبضہ قرار دیا جائے گا اور کسے نہیں، اس باب کے ذیل میں انہوں نے قبضہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”تجرید میں بیع پر قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ بیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی یہ ہے کہ

باعث بیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور اسی طرح ثمن کی سپردگی سمجھی جائے گی، اجناس میں ہے کہ سپردگی کے لئے تین چیزیں معتبر ہیں: (۱) بائع مشتری سے کہے کہ میں نے بیع اور تمہارے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، (۲) بیع مشتری کے پاس اس طرح ہو کہ اگر اس میں وہ کوئی تصرف کرنا چاہے تو بلا کسی رکاوٹ کے کر سکے۔ (۳) بیع حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کر دیا، پس اس پر قبضہ کر لو..... اگر کسی نے گیہوں خریدا اور وہ گیہوں کسی مکان میں ہے، بائع نے اس گھر کی تالی مشتری کو دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور اس کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، تو اسے قبضہ سمجھا جائے گا“ (خلاصۃ الفتاویٰ ۸۹/۳)۔

محقق ابن الہمام نے قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”قبضہ اور بیع کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مشتری اور بیع کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ مشتری کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور یہی مفہوم ثمن کی سپردگی کا ہے..... اور وبری سے منقول ہے کہ اگر کسی مکان میں خریدے گئے سامان تجارت کے ساتھ بائع کے سامان کے علاوہ کسی دوسرے کا سامان ہو تو وہ قبضہ کے حق میں مانع ہوگا، پس اگر اسے سامان پر قبضہ کی اجازت دے دی جائے تو قبضہ صحیح ہو جائے گا، اور سامان بائع کے پاس بحکم ودیعت ہوگا..... کپڑے میں قبضہ کی صورت یہ ہے کہ مشتری اسے اپنے ہاتھ میں لے لے یا اگر کپڑا زمین پر رکھا ہو اور بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور کپڑے کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، پس اس پر قبضہ کر لو، اور مشتری نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے قبضہ کر لیا تو شرعاً اسے قبضہ قرار دیا جائے گا، اور اگر کسی مکان میں رکھے ہوئے گندم کو خریدا گیا اور بائع نے مشتری کو اس مکان کی تالی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور بیع کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے تو شرعاً یہ قبضہ

قرار پائے گا“ (فتح القدیر ۵/۳۹۶)۔

”البحر الرائق“ میں ہے:

”اگر بائع نے مشتری سے بیع کے مکمل ہونے کے بعد کہا کہ ”لے لو“ تو یہ قبضہ نہیں ہوگا اور اگر بیع کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”اسے لے لو“ پس اگر مشتری کے لئے بیع پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو یہ تخلیہ اور قبضہ ہوگا“۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

”بیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ بیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر مشتری اس پر قبضہ کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش نہ آئے“ (البحر الرائق ۵/۳۰۷-۳۰۸)۔

علامہ حاکمی نے قبضہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے:

”پھر قبضہ اور بیع کی سپردگی ایسے تخلیہ سے عمل میں آئے گی جس میں مشتری کے لئے بیع پر قبضہ کرنا بغیر کسی رکاوٹ کے ممکن ہو“۔

علامہ شامی نے صراحت کی ہے کہ تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے، بشرطیکہ تخلیہ کے بعد بیع پر بغیر کسی دشواری کے قبضہ ممکن ہو۔ ”فتح القدیر“ میں ہے:

”اور ملک تام کی قید سے بیع قبل قبضہ نکل جاتے ہے۔ اگر اس پر بائع ہی کے پاس حولان حول ہو جائے، اور اس دوران مشتری کو اس پر ملک تصرف حاصل نہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، واضح رہے کہ کمال ملک کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہو“ (فتح القدیر ۲/۱۱۳)۔

ان عبارات فقہیہ کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء نے ”تخلیہ“ کو بھی حکماً ”قبضہ“ تسلیم کیا ہے اور سامان تجارت پر قبضہ اور اس کی سپردگی کے لئے یہ بات کافی قرآنی گئی ہے کہ سامان تجارت

اور خریدار کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر خریدار سامان پر قبضہ کرنا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، لہذا ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے:

”وہ سامان تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی اور ابھی سامان تجارت بائع ہی کے پاس ہے۔ اس سامان کا مشتری شرعاً اور عرفاً مالک بن چکا ہے، اور اسے سامان پر حکماً قبضہ بھی حاصل ہے، قبضہ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کے خریدے ہوئے مال میں خریدار کو ہر طرح کے تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اور اسے اس پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں اس میں وہ جو چاہے تصرف کر سکتا ہے، بائع کی طرف سے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے کیونکہ ثمن کی وصولیابی کے وقت ہی بائع سامان اور خریدار کے درمیان تخلیہ کر دیتا ہے، لہذا اس مال تجارت کی زکوٰۃ خریدار کے پاس آئے تو اسے گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی“ (تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۲/۲۰۳-۲۰۴)۔

### پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی یا مشتری پر، اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ پیشگی ادا کی ہوئی قیمت چونکہ مشتری کی ملکیت سے نکل چکی ہے، اور اس پر مشتری کو نہ تو ملکیت حاصل ہے اور نہ قبضہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہوگی، البتہ بائع کو اس قیمت پر ”ملک تام“ حاصل ہے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، (دیکھئے: البحر الرائق ۲/۲۰۹)۔

”ایک شخص نے بہ نیت تجارت ایک غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم کے مساوی ہے، اس نے ثمن کی ادائیگی کر دی اور غلام پر قبضہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا، اور اس دوران غلام مر گیا تو بائع پر دو سو درہم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ غلام کی قیمت پر اسے ملکیت حاصل ہو چکی تھی، اور اس پر حولان حوال بھی ہو گیا، مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،

کیونکہ ثمن اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملک میں داخل ہو گیا، پس پورے ایک سال تک ثمن پر مشتری کی ملکیت نہیں رہی، اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔“

### کرایہ کی پیشگی رقم اور ڈپوزٹ پر زکوٰۃ

کرائے کی مد میں دی جانے والی پیشگی رقم ”اجرت معجلہ“ ہے، جس کا مالک، مالک مکان ہے، اس رقم پر اسے ”ملک تام“ حاصل ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی، ”ذکر الشیخ الإمام أبو بکر محمد بن الفضل البخاری فی الإجارة الطويلة التي تعارفها أهل بخاری أن الزکوٰۃ فی الأجرة المعجلة تجب علی الأجر؛ لأنه ملکہ قبل الفسخ“ (دیکھئے: بدائع ۶/۳)۔

(امام ابو بکر محمد بن الفضل البخاری نے اجارہ طویلہ جس کا اہل بخاری کے مابین عام رواج ہے، کے بارے میں لکھا ہے کہ اجرت معجلہ میں آجر، یعنی مالک پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ اجارہ کے فسخ ہونے سے پہلے تک وہ اس کا مالک ہے)۔

”فتاویٰ تاقی خان“ میں ہے:

”اجارہ مرسومہ جس کا بخاری میں رواج ہے، اگر اس میں پیشگی رقم ادا کر دی گئی اور مال چند سالوں تک آجر، یعنی مالک مکان کے پاس ہی رہا، تو شیخ ابو بکر محمد بن الفضل سے منقول ہے کہ اگر اجرت دراہم و دمانیر کے قبیل سے ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی، اس لئے کہ قبضہ کے ذریعہ وہ پیشگی رقم کا مالک ہو چکا ہے، اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر عین مقبوض کی واپسی ضروری نہیں ہوگی، بلکہ اس کے علاوہ دوسرے دراہم و دمانیر کی واپسی کافی ہوگی، تو کو یا کہ یہ اس دین کے مثل ہو جو حولان حول کے بعد لازم ہو،“ (فتاویٰ تاقی خان ۱۱۹/۱)۔

امام نووی شافعی نے لکھا ہے:

”اگر آجر کے پاس ہی کرایہ پر لگایا ہو امکان ہو اور کرایہ دار نے ابھی اس مکان سے

فائدہ نہ اٹھایا ہو اور کرایہ کی رقم پر سال مکمل ہو گیا ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی، اس لئے کہ آجر کو اس پر ملکیت تامہ حاصل ہے“ (المجموع ۲۳/۲)۔  
محقق ابن الہمام کا بیان ہے:

”طویل اجارہ جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں، اور ہر ماہ کے شروع میں تین دن کے لئے خیار شرط لگاتے ہیں، اگر اس میں چند سالوں کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا جائے تو اس کی زکوٰۃ آجر (مالک مکان) پر واجب ہوگی، کیونکہ قبضہ کے ذریعہ آجر اس کا مالک ہو چکا ہے اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر بعینہ اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی، بلکہ اس کی مقدار کا لوٹنا کافی ہوگا، پس سمجھا جائے گا کہ یہ وہ دین ہے جو حولان حول کے بعد اس کے ذمہ میں آیا ہے“  
(فتح القدير ۱۲۱/۲)۔

صاحب ”خلاصۃ الفتاویٰ“ نے بھی اجرت معجلہ کی زکوٰۃ آجر پر واجب قرار دی ہے، مگر لکھا ہے کہ احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں یعنی آجر اور مستاجر اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔  
مگر یہاں پر محل غور و فکر پیشگی ادا کی جانے والی کرایے کی رقم نہیں ہے، بلکہ وہ رقم ہے جسے کرایہ دار ضمانت اور ڈپوزٹ کے طور پر ادا کرتا ہے، بڑے بڑے شہروں اور قصبہات میں مکان، دوکان کرایہ پر لیتے وقت کرایہ کی متعینہ رقم کے علاوہ ایک بڑی رقم ڈپوزٹ، ضمانت، پگڑی کے نام پر کرایہ دار کو ادا کرنی پڑتی ہے، یہ رقم کرایہ دار کو درمیان میں لینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ جب وہ مکان، دوکان خالی کرے گا یا اجارہ کا معاملہ ختم کیا جائے گا تو اسے یہ رقم واپس ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمانت یا ڈپوزٹ کے طور پر دی جانے والی رقم کا شرعی حکم کیا ہوگا، اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی یا مالک مکان پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے، یہ بات تو متحقق ہے کہ مالک مکان کو اس رقم پر ملکیت حاصل نہیں ہے، صرف اس پر اس کا قبضہ ہے،

اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ”ملک تام“ ہونا ضروری ہے، لہذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہونی چاہئے، اب رہا یہ سوال کہ کرایہ دار جو اس رقم کا اصل مالک ہے اس پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رقم کی اصل حیثیت پر غور کیا جائے کہ شرعاً اس رقم کی حیثیت کیا ہے، اس رقم کے بارے میں چند احتمالات ہو سکتے ہیں:

۱- اسے قرض قرار دیا جائے، مگر قرض ہونے کے احتمال کو عرف و تعامل رد کرتے ہیں، کیونکہ قرض کی صورت میں شرعاً قرض دہندہ کو اس کو اختیار رہتا ہے کہ جب وہ چاہے قرض میں دی ہوئی رقم کا مطالبہ کرے، مگر ڈپوزٹ کی رقم کو اجارہ کے ختم ہونے یا فسخ ہونے سے پہلے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا ہے، اس لئے ہم اسے قرض قرار نہیں دے سکتے۔

۲- دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو ”امانت اور ودیعت“ قرار دیا جائے، مگر یہ احتمال بھی اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ ”امانت اور ودیعت“ کی صورت میں اگر سامان مودع کے پاس بلاک ہو جائے تو اس پر تاوان واجب نہیں ہوتا ہے، اور ڈپوزٹ کی رقم ہر حال میں واجب الودع ہوتی ہے، اس لئے اسے امانت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۳- ایک احتمال یہ ہے کہ اسے ”عاریت“ قرار دیا جائے، مگر یہ احتمال بھی اس بناء پر درست نہیں ہے کہ عاریت کی صورت میں بھی مالک کو اپنی چیز واپس لینے کا ہر وقت اختیار رہتا ہے، نیز عاریت حکم میں ودیعت کے ہوتی ہے، اور ڈپوزٹ کی رقم کو نہ تو ہر وقت واپس لینے کا اختیار رہتا ہے اور نہ ہی بلاک ہونے کی صورت میں مالک مکان بری الذمہ ہوتا ہے، اس لئے یہ احتمال بھی درست نہیں ہے۔

۴- ایک احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو ”رہن“ قرار دیا جائے، یہ احتمال درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ رہن رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دائن کی رقم مدیون کے پاس محفوظ رہے، ڈوبنے نہ پائے، اگر خدانخواستہ مدیون دین کی رقم لے کر فرار ہو جائے، یا اس سے انکاری ہو جائے تو دائن

رہن سے اپنا دین وصول کر سکے، ڈپوزٹ اور ضمانت کی رقم کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کرایہ دار درمیان میں کرایہ ادا کئے بغیر مکان خالی کر کے فرار ہو جائے یا مکان میں اپنی طرف سے تغیر و تبدیلی کر دے تو مالک ڈپوزٹ کی رقم سے اپنی واجب الاداء رقم وصول کرے، اور نقصان کی صورت میں نقصان کی تلافی کر سکے، نیز جس طرح رہن میں جب تک ”دین“ ادا نہیں کیا جاتا ہے اس وقت تک مال رہن کی واپسی نہیں ہوتی ہے، اسی طرح ڈپوزٹ کی صورت میں بھی جب تک مکان، دکان خالی نہ کر دی جائے یا مدت اجارہ ختم نہ ہو جائے، اس رقم کی واپسی نہیں ہوتی، اس لئے میرے نزدیک اس رقم کی حیثیت مال رہن کی ہے، اور رہن کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ تو راہن پر واجب ہوگی اور نہ ہی مرہن پر، راہن پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ اگرچہ اسے مال رہن پر ملکیت حاصل ہے، مگر اس پر اس کا قبضہ نہیں ہے، اور وجوب زکوٰۃ کیلئے ”ملک تام“ ملک رقبہ اور بی ضروری ہے جو یہاں پر مفقود ہے، اس لئے راہن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، راہن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ وہ رقم اس کی ضروریات میں مشغول ہے، رہائشی مکانات تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی ضرورت ہے اور وجوب زکوٰۃ کیلئے مال کا ضروریات اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے، اور مرہن پر عدم وجوب کی علت یہ ہے کہ مرہن کو مال رہن پر ”ملکیت“ حاصل نہیں ہوتی ہے، اگر اس پر اسے قبضہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے اس کے حق میں بھی ”ملک تام“ کا تحقق نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، علامہ حاکمی نے لکھا ہے: ”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ (شامی ۲/۲۶۳) اور مال رہن پر قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ شامی نے ”در مختار“ کے قول ”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ کے تحت لکھا ہے:

”مال مرہون کی زکوٰۃ مرہن پر اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ اسے صرف قبضہ حاصل

ہوتا ہے، ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتا ہے، اور راہن پر اس کی زکوٰۃ اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ مال



مرہون پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہوتا ہے، اور جب مال مرہون واپس کیا جائے گا تو راہنہ پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی“ (شامی ۲/۲۶۳)۔

اس لئے اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ:

”وہ رقم جو بطور پیشگی (Advance) مالک مکان یا دوکان کو دی جاتی ہے، اس کی حیثیت مال رہن کی ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار پر واجب ہوگی اور نہ مالک مکان پر، کیونکہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس رقم پر ”ملک تام“ حاصل نہیں ہوتا ہے“۔

#### مدارس اور اداروں کی رقوم پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے لئے شرعاً مال پر ”ملک تام“ حاصل ہونا ضروری ہے، لہذا وہ سارے اموال جن کا کوئی متعین فرد نہ ہو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مدارس اور اداروں میں جو رقوم جمع ہوتی ہیں، ان کا مالک بھی کوئی متعین فرد نہیں ہوتا ہے، اس لئے ان رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، علامہ شامی نے درمختار کے قول ”ملک نصاب“ کے تحت لکھا ہے:

”فلا زکوٰۃ فی سوانم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك“

(شامی ۲/۲۵۹)۔

پس وقف کے ساتھ جانور اور گھوڑے میں ملکیت کے نقد ان کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

”فمنها الملك فلا تجب الزکوٰۃ فی سوانم الوقف والخیل المسبلة

لعدم الملك وهذا؛ لأن فی الزکوٰۃ تملیکاً، والتملیک فی غیر الملك لا يتصور“ (بدائع المنافع ۲/۹۰)۔

(وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ملک تام ہے، لہذا وقف کے مویشی اور گھوڑوں میں عدم ملک کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور اس لئے کہ زکوٰۃ میں تملیک ہوتی ہے اور ملک غیر میں تملیک کا تصور نہیں کیا جاسکتا)۔

”الفقه على المذاهب الأربعة“ میں ہے:

”ولا زكوة في المال الموقوف لعدم الملك فيه“ (الفقه على المذاهب

الأربعة ۱/ ۵۹۲)۔

”الفقه الاسلامی وادلتہ“ میں ہے:

”فلا زكاة في سوانم الوقف والخيل الموقوفة“ (الفقه الاسلامی

وادلتہ ۲/ ۷۳۱)۔

حضرت امام شافعی کا بھی یہی مشہور قول ہے کہ وقف اور مدارس کے اموال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، المجموع میں ہے:

”اس باغ کے پھل اور زمین کے غلہ پر جو جہت عامہ پر وقف ہو، جیسے مدارس، مساجد، فقراء، مجاہدین وغیرہ، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، امام شافعی کا یہی مشہور قول ہے، اور شوانع کے نزدیک اسی قول پر عمل ہوتا ہے“ (المجموع ۵/ ۵۷۵)۔

فقہ حنبلی کے مطابق بھی مدارس اور اداروں کے اموال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، افروع میں ہے:

”ولا زكاة في وقف على غير معين أو على المساجد والمدارس والربط ونحوها“ (کتاب لفروع لابن مفلح ۲/ ۳۶۲)۔

مال حرام پر زکوٰۃ کا حکم

کسی شخص کے پاس مال حرام کے جمع ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف- اس شخص کے پاس سارا مال حرام ہی ہو، جو اس نے ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کر کے جمع کر رکھا ہو، اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا حلال و طیب مال نہ ہو، اس صورت میں اس شخص کو مال حرام پر ملکیت حاصل نہیں ہے، بلکہ سارا ہی مال ناپاک اور خبیث ہونے کی بناء پر واجب التصدق ہے، یا اگر جن لوگوں سے ناجائز طور پر مال حاصل کیا گیا تھا وہ معلوم و متعین ہیں تو ان تک اس مال کی واپسی لازم اور ضروری ہے، اس صورت میں چونکہ سارے ہی مال کا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا، یا اگر مالک موجود ہو تو اس کو واپس کرنا واجب ہے یا واجب الرد ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ مال خبیث پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہے، شامی میں ہے:

”لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة، لأن الكل واجب التصديق فلا

يفيد ايجاب التصديق بعضه“ (شامی ۲/۲۵۲)۔

(اگر کسی شخص کے پاس مال خبیث بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ پوری رقم واجب التصدق ہے، پس صرف زکوٰۃ کی مقدار صدقہ کو واجب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا)۔

”کتاب ابو یوسف“ میں شامی نے مال حرام کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم، وإلا فإن علم

عين الحرام لا يحل له ويتصلق به بنية صاحبه“ (سابق حوالہ ۱۸۰۳)۔

(حاصل یہ ہے کہ اگر ارباب اموال معلوم ہوں تو ان تک مال کا لوٹانا واجب ہوگا، ورنہ اگر عین حرام کا علم ہو تو وہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور صاحب مال کی نیت سے اس کا تصدق ضروری ہوگا)۔

”بحر الرائق“ میں ہے:

”ملکہ ملکا خبیثا فسبیلہ التصدق بہ“ (المحرر المأق ۲/۲۳۶)۔

علامہ یوسف القرضاوی نے مال حرام پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کی علت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت کی جو شرط لگائی گئی ہے، اس سے وہ مال خارج ہو جاتا ہے جسے ناپاک اور حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، جیسے غصب، چوری، رشوت، سود اور فریب دہی کے ذریعہ حاصل کئے گئے اموال..... صحیح بات یہ ہے کہ لوگ اس قسم کے اموال کے مالک نہیں ہوتے ہیں، اگرچہ انہوں نے اپنے جائز مال کے ساتھ اسے اس طرح ملا لیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہو، علماء کہتے ہیں کہ اگر مال خبیث بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مال کی ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کر دے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اس کا حق دار معلوم ہو تو اس کو اس کا حق پہنچائے یا اس کے ورثہ کے حوالہ کرے بصورت دیگر فقراء پر صدقہ کر دے، اور دوسری صورت پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے، لہذا صرف اس کے ایک حصہ (یعنی زکوٰۃ کی حد تک) صدقہ کرنے کا حکم دینا مفید نہیں ہوگا“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۱۳۳)۔

ب- دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ حلال و طیب مال بھی ہو، اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی:

۱- مال حلال اور مال حرام علیحدہ علیحدہ ہوں، دونوں ایک دوسرے سے ممتاز متمیز ہوں تو اس صورت میں بھی مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ مال حرام واجب التصدق ہوگا یا اصحاب اموال معلوم ہوں تو ان تک واپسی ضروری ہوگی۔

۲- مال حرام اور مال طیب کو اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس میں حضرت امام ابو حنیفہ اور

صاحبین امام ابو یوسف، امام محمد کا اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ در اہم و دنا نیر (موجودہ دور میں کرنسی نوٹ بھی در اہم و دنا نیر کے حکم میں ہیں) کا اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو، احتیلاک ہے، لہذا اس احتیلاک کی وجہ سے وہ شخص پورے مال کا مالک بن جائے گا، البتہ مال حرام کی مقدار کا وہ ضامن قرار پائے گا، اور اس پورے مخلوط مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

صاحب ”ولو لہیہ“ نے امام صاحب کے قول کو ارتق بالناس قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ بہت کم ایسے لوگ ہیں جن کے پاس صرف مال حلال و طیب ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر لوگوں کے مال میں غصب وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے، علامہ ابن نجیم مصری نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ:

”اگرچہ امام صاحب کے قول کے مطابق ”خلط“ اور ”احتیلاک“ کے ذریعہ وہ مال حرام کا مالک بن جائے گا، مگر وہ اس مقدار مال کا ضامن ہوگا تو گویا وہ مال مشغول بالمدین ہو، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے، لہذا امام صاحب کے قول کے مطابق بھی اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے، اسی لئے مجتہدین میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال سے بری کر دیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ ابراء سے قبل وہ رقم مشغول بالمدین ہوگی، یہ قید بہت مناسب ہے اس کا یاد رکھنا ضروری ہے“ (البحر الرائق ۲/۲۰۵)۔

فتاویٰ تاتارخانیہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خلط کی صورت میں بھی امام صاحب کے قول کے مطابق صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی، جبکہ اس کے پاس مال مخلوط جس علاوہ دوسرا طیب و حلال مال بقدر نصاب موجود ہو، اگر دوسرا نصاب نہ ہو تو چاہے مال مخلوط جس مقدار میں بھی ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ”ومن ملک أموالاً غیر طیبہ أو غصب أموالاً و خلطها ملکها بالخلط و یصیر ضامناً، وإن لم یکن سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیہ فی تلک الأموال وإن بلغت نصاباً؛ لأنه مدیون و مال المدیون

لا ینعقد سبباً لوجوب الزکوٰۃ عندنا“ (۲۸۹/۲)۔

اور ”در مختار“ میں ہے:

”وہذا إذا كان له مال غیر ما استھلكه بالخلط منفصل عنه یوفی دینہ

وإلا فلا زکوٰۃ علیہ“۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی صرف اس صورت میں مال مخلوط پر وجوب زکوٰۃ ہوگا جب کہ مال حرام کا مالک اسے بری الذمہ کر دے، یا یہ شخص اس کے اصل مالک سے کچھ مال کے بدلے مصالحت کر لے تو اس صورت میں چونکہ اس مال کا خبث زائل ہو جائے گا، اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”لکن علمت أنه لا تجب زكاته إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالح عنه

فیقول خبثہ“ (۲۹۱/۳)۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ مال حرام کو مال حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے وجوب ضمان نہیں ہوتا ہے، اور چونکہ ضمان ہی کی فرغ ملکیت ہے، اس لئے اس مال پر اسے ملکیت بھی حاصل نہیں ہوگی، لہذا اس مال پر نہ تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی، کیونکہ وہ مال مشترک ہے، لہذا جتنا اس میں میت کا حصہ تھا صرف اسی میں وراثت جاری ہوگی۔

علامہ ابن نجیم مصری نے مال حرام پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اور اسی بنیاد پر فقہانے کہا ہے کہ اگر بادشاہ نے مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو وہ مال اس کی ملک ہو جائے گا، اور حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق اس مال پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی، اس لئے کہ ان کے نزدیک اپنے دراہم کو دوسرے کے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے، لیکن صاحبین کے قول کی بنیاد پر وہ ضمان نہیں ہوگا، اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی، اس لئے کہ ملکیت ضمان کی فرغ ہے،

لہذا اس مال میں وراثت بھی جاری نہیں ہوگی، کیونکہ وہ مال مشترک ہے، صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی، ”ولو لوجیہ“ میں امام صاحب کے قول کو ”ارفق بالناس“ قرار دیا ہے، اس لئے کہ بہت کم مال غصب وغیرہ سے پاک ہوتا ہے، فقہاء نے اسی طرح ذکر کیا ہے، لیکن امام صاحب کے قول کے مطابق زکوٰۃ کا وجوب مشکل ہے، اس لئے کہ اگرچہ خلط کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو جائے گی لیکن وہ مال مشغول بالمدین ہے، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے، پس مناسب یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے، اسی بنیاد پر مبنی میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کر دیں، اس لئے کہ ابراء سے قبل وہ رقم مشغول بالمدین ہوگی، یہ قید بہتر ہے اس کا یاد رکھنا ضروری ہے“ (البحر الرائق ۲/۲۰۵)۔

علامہ ابن اہمام نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اور اسی بنیاد پر فقہاء نے کہا کہ اگر سلطان نے کسی کا مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو اس پر اسے ملکیت حاصل ہو جائے گی، حتیٰ کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی، اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک دوسرے کے دراہم کو اپنے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے، لیکن صاحبین کے قول کے مطابق یہ استہلاک نہیں ہے، اس لئے وہ اس مال کا ضامن نہیں ہوگا اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ ملکیت ضمان کی فرع ہے اور نہ ہی اس پورے مال میں وراثت جاری ہوگی، اس لئے کہ وہ مال مشترک ہے پس صرف میت ہی کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی“۔

علامہ حصکھی نے مال مخلوط پر زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اگر سلطان نے مال مغصوب کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو وہ اس کا مالک

ہو جائے گا، اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور وراثت جاری ہوگی، اس لئے کہ دوسرے کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو، امام ابوحنیفہ کے نزدیک استہلاک ہے، امام صاحب کا قول ارفق بالناس ہے، اس لئے کہ بہت کم ہی مال ایسا ہوتا ہے جو غصب وغیرہ سے محفوظ ہوتا ہے اور زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہوگا، جبکہ اس کے پاس مال مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہو جس سے وہ دین ادا کر سکے، ورنہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، شامی میں ہے: صاحبین کے قول کے مطابق وجوب ضمان نہیں ہوگا، لہذا ملکیت بھی ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ ضمان کی فرع ہے، اور نہ اس مال میں وراثت جاری ہوگی، کیونکہ وہ مال مشترک ہے، صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی“ (شامی ۲/۲۹۰-۲۹۱)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں مال حرام جو مخلوط ہو اس کے بارے میں رقم الحروف کی

رائے یہ ہے:

”اس مال پر حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی بنیاد پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ مال حرام کو مال حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے بوجہ استہلاک اگرچہ اسے اس مال پر ملکیت حاصل ہو جائے گی، مگر چونکہ وہ اس مقدار کا ضامن ہوگا، اور اس پر واجب ہوگا کہ مال حرام کی جتنی مقدار اس نے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے، اسے صاحب مال تک لوٹا دے یا اگر صاحب مال کا علم نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے“۔

اس طرح سے وہ رقم مشغول بالدين ہوئی، حالانکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین

سے فارغ ہونا ضروری ہے، البتہ اس مال پر وجوب زکوٰۃ کی یہ صورتیں ہیں:

الف- اس شخص کے پاس مال مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے

ذمہ واجب دین کو ادا کر دے تو بھی اس کے پاس بقدر نصاب مال رہ جائے، تو اس صورت میں

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ”در مختار“ میں ہے:



”وهذا إذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى دينه  
والا فلا زكوة“ (بخاری ۲۹۱/۳)۔

ب۔ جن لوگوں سے اس نے حرام طریقے سے حاصل کیا تھا وہ لوگ اپنی اپنی رقم سے  
اسے بری الذمہ کر دیں، یا وہ شخص صاحب اموال سے کچھ مال دے کر مصالحت کر لے تو اس  
صورت میں چونکہ مال حرام کا حبث دور ہو جائے گا اور وہ شخص پورے طور پر اس مال کا مالک بن  
جائے گا، اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی ہشامی میں ہے:

”إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالح عنه فيزول حبثه“

#### ۵۔ دیون کی زکوٰۃ

ملک تام کی شرط کے ذیل میں دیون کی زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زکوٰۃ شرعاً  
کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک تو ہے، لیکن قبضہ نہیں، یا مدیون پر جس کے قبضہ میں وہ  
رقم ہے، لیکن اس کی ملک میں نہیں، یا دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔

دیون کی زکوٰۃ کے بارے میں امام ابو عبید (م ۲۲۴ھ) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف  
”کتاب الاموال“ میں ائمہ سلف کے پانچ اقوال ذکر کئے ہیں:

۱۔ اگر دین کسی مالدار شخص کے ذمہ ہو تو اپنے دیگر اموال کے ساتھ دین کی بھی زکوٰۃ ادا  
کی جائے گی۔

۲۔ اگر دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو، پھر وہ وصول ہو جائے تو قبضہ کے بعد تمام گذشتہ  
سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

۳۔ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی، چاہے اس مال پر جتنا بھی  
سال گزرا ہو۔

۴- دین کی زکوٰۃ صرف قرض لینے والے پر واجب ہوگی قرض دینے والے پر نہیں۔

۵- دین کی زکوٰۃ نہ تو دائن پر واجب ہوگی اور نہ مدیون پر، چاہے مدیون ثقہ اور مالدار

ہو۔

ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی، سفیان ثوری اور فقہاء عراق کی رائے ہے کہ اگر دین کے وصول ہونے کی امید ہو تو اس صورت میں گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی، اور اگر دین کے وصولیابی کی امید نہ ہو تو اہل عراق کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (کتاب

الاسوال، ۳۱-۵۲۶)

تابعین میں سے حضرت عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح اس بات کے قائل ہیں کہ دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی (سراہقہ جوالہ، ۵۳۳)، ابن حزم نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے: ”لیس فی اللین زکاة“ دین میں زکوٰۃ نہیں ہے، ظاہر یہ کہ یہی مسلک ہے (فقہ الزکاة، ۱۳۵)۔

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک دین کی دو قسم ہے:

۱- ایک قرض وہ ہے جس کی وصولیابی متوقع ہو، یعنی قرض ایسے شخص پر ہو جو اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور دین کا قرض بھی کرتا ہو، ایسے دین کی زکوٰۃ اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ہر سال ادا کی جائے گی، ابو عبید نے صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

تابعین میں سے حسن بصریؒ، ابو ایوبؒ، جابر بن زیدؒ، مجاہدؒ اور میمون بن مہرانؒ کا یہی فتویٰ ہے (کتاب الاسوال، ۵۳۱)۔

۲- دوسرا قرض وہ ہے جس کی وصولیابی کی توقع نہ ہو، یعنی دین کسی ایسے شخص پر ہو جو تنگدست ہو، اور اس کے خوشحال ہونے کی امید نہ ہو، یا دین ایسے شخص پر ہو جو اس کا انکار کر رہا ہو

اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو، اس صورت کا حکم مختلف فیہ ہے، اس کے بارے میں فقہاء کے دو قول ہیں:

۱- پہلا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی، حضرت علیؑ اور ابن عباسؓ کا یہی مذہب ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ دینی پڑے گی، حسنؓ، عمر بن عبدالعزیزؓ کا یہی مسلک ہے، امام مالک کے نزدیک دیون کی تمام اقسام کا یہی حکم ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اس مال پر نہ تو ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ گذشتہ سالوں کی، بلکہ قبضہ کے بعد جب حولان حول ہو جائے گا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا یہی مذہب ہے (فقہ الزکاۃ ۱۵۱/۱۳۶-۱۳۷)۔

حنفیہ کے نزدیک وہ دین جس کی وصولیابی کی امید نہ ہو پھر اتفاق سے وہ وصول ہو جائے تو اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ حضرت علیؑ کے نزدیک مال ضار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، ابن اہمام نے حضرت حسن بصریؒ اور عمر بن عبدالعزیزؓ کا بھی یہی مسلک ذکر کیا ہے (فتح القدیر ۲/۱۳۳)۔

دین کے قائل وصول ہونے کی اور ناقابل وصول ہونے کے لحاظ سے فقہاء احناف نے دین کے اندر یہ تفصیل کی ہے:

۱- ایسا مقرض جو قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور وہ قرض کا اقرار بھی کرتا ہو تو اس کے ذمہ واجب الاداء دین کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی پڑے گی، اگر مقرض تنگ دست ہو تو بھی مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی، لیکن حسن بن زیادؒ کی روایت یہ ہے کہ تنگ دست پر دین ہونے کی صورت میں اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۲- ایسا شخص جس کا دیوالیہ ہو گیا ہو اور اسلامی حکومت نے اس کے دیوالیہ پن کی وجہ

سے اسے ”مفلس“ قرار دے دیا ہو، صاحبین کے قول کے مطابق ایسے شخص کے ذمہ جو دین ہوگا اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب نہیں ہوگی، امام ابوحنیفہ کے نزدیک حکومت اور عدالت کی رائے کسی شخص کے دیوالیہ اور تفلّیس کی بابت معتبر نہیں ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی ہوگی، امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی، صاحبین کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (ہدایہ ص ۱۲۳/۲)۔

اسی طرح اگر مدیون دین سے انکاری ہو اور اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو تو مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی، مگر عدالت کی پیروی اور قاضی کے فیصلہ حاصل کرنے میں جو دشواریاں ہیں ان کے پیش نظر علماء نے اس صورت میں دائن پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے، کیونکہ گواہی کے لئے گواہوں کو عدالت کے سامنے پیش کرنا اور قاضی سے انصاف کی توقع رکھنا مشکل ہے (عنایلی ہاشم الہدایہ ص ۲۳/۲)۔

لیکن اس سلسلہ میں حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وہ دین جس سے مدیون انکاری ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، آئندہ اگر خلاف توقع وہ دین وصول بھی ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (ہدایلی ہاشم ص ۱۳۱/۲)

### دیون کی اقسام اور ان کا حکم

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

۱- دین قوی: وہ دین جو مال تجارت کے بدلے میں واجب ہو، جیسے سامان تجارت کی قیمت، تجارت کے غلام اور مال تجارت کے نلہ کی قیمت، قرض بھی اسی حکم میں ہے، اسے دین قوی سے تعبیر کیا جاتا ہے، دین قوی کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے مابین زکوٰۃ کے وجوب کی بابت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جب دین کا ایک خمس، چالیس درہم وصول ہو جائے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی، اور چالیس میں سے ایک

درہم ادا کرنا پڑے گا، صاحبین کہتے ہیں کہ جتنا جتنا دین وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی (بدائع ۲/۱۰، البحر الرائق ۲/۲۰۷، المصوب ۲/۱۹۵)۔

۲- دین متوسط: وہ دین ہے جو کسی مالی عوض کے طور پر واجب ہو، مگر وہ سامان تجارت کی قیمت نہ ہو، بلکہ ایسے مال کے بدلے میں واجب ہو جس میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑوں اور رہائشی مکان کی قیمت، خدمت کے غلام کی قیمت ایسے دین کو دین متوسط کہا جاتا ہے، ان کے نزدیک دین قوی کے حکم میں ہے، اور دوسری روایت کے مطابق دین ضعیف کے حکم میں ہے، ”کتاب الاصل“ میں امام صاحب کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا، البتہ ادائیگی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب اس پر قبضہ ہو جائے (سابق حوالہ جات)۔

ابن نجیم نے لکھا ہے:

”صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کے نزدیک“ دین وسط پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب دین پر قبضہ ہو جائے، البتہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی، اور قول ضعیف کے مطابق گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں دینی پڑے گی“ (البحر الرائق ۲/۲۰۷)۔

ابن ساعد نے امام ابو یوسفؒ کے واسطے سے امام ابو حنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ دین کی صرف دو قسم ہے اور انہوں نے ”دین وسط“ کو دین ضعیف قرار دیا ہے، کرخی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے (المصوب المشرعی ۲/۱۹۵)۔

صحیح قول کے مطابق دین قوی اور دین متوسط میں اتنا فرق ہے کہ دین قوی کے ایک شمس کی وصولیابی پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، جبکہ دین متوسط کی صورت میں بقدر نصاب مال پر قبضہ ضروری ہوتا ہے، صاحبین کے نزدیک سارے دیون برابر ہیں، قبضہ سے پہلے ان کی

زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، البتہ جتنی مقدار پر قبضہ ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی (المحرم المرقی ۲/۲۰۸، بدائع ۲/۱۰۷)۔

۳- دین ضعیف، وہ دین جو کسی مالی عوض کے بدلے میں واجب نہیں ہوتا ہے، جیسے مہر کی رقم، خلع، اور صلح عن اقتصاص کی رقم اس دین کا حکم یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، وصولیابی کے بعد جب اس رقم پر مکمل ایک سال گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، بدائع میں ہے:

”ولا زکوٰۃ فیہ مالہم یقبض ویحول علیہ الحول بعد القبض“ (بدائع ۲/۱۰۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک دیون کی مذکورہ تمام قسموں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن ادائیگی قبضہ کے بعد ہوگی، دین قوی میں خمس نصاب، یعنی کم سے کم چالیس درہم کی وصولیابی کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی، اور دین متوسط اور دین ضعیف میں نصاب کی مالیت کے بقدر قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہوگا، البتہ دین متوسط میں گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی، جبکہ دین ضعیف میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

مالکیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں:

۱- دین کی ایک قسم وہ ہے جس پر قبضہ کے بعد مکمل ایک سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے وراثت، بیہ، وقف، صدقہ، عورت کا مہر اور خلع کا عوض، اسی قبیل کے دین سے تعلق رکھتا ہے، ان تمام دیون میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، قبضہ کے بعد سے جب ایک سال اس پر گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲- دوسرے وہ دین ہے جس میں صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، جیسے دین قرض اور دین تجارت جسے حنفیہ کے نزدیک ”دین قوی“ سے موسوم کیا گیا ہے، اس طرح کے دین میں مالکیہ کے نزدیک حسب ذیل چار شرطوں کے ساتھ وجوب زکوٰۃ ہوگا:

الف- قرض کی اصل سونا، چاندی ہو، یا جمع کئے گئے سامان تجارت کی قیمت ہو، مثلاً تجارتی کپڑوں کی قیمت۔

ب- اس دین کے ایک حصہ پر دائن کا قبضہ ہو چکا ہو، اگر دین کا کچھ بھی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ج- قبضہ کی ہوئی شئی نقد سونے، چاندی کے قبیل سے ہو، اگر اس نے سامان تجارت مثلاً کپڑے یا گیہوں پر قبضہ کیا تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

د- جتنے مال دین پر اس کا قبضہ ہوا ہے وہ کم سے کم بقدر نصاب ہو، یا اگر نصاب سے کم ہو مگر اس کے پاس دوسری مالیت ہو جس کے ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳- تیسرا دین مدیر ہے: دین مدیر سے اس تاجر کا دین مراد ہے جو موجودہ قیمت کے ساتھ خرید و فروخت کرتا ہے، پس اگر دین کی اصل سامان تجارت ہو تو وہ ہر سال دین کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

شوائف کے نزدیک اگر دین درہم و دینار یا سامان تجارت کی قیمت کے قبیل سے ہو تو جب دائن اپنے دین پر قبضہ کر لے گا یا اپنے دین کے حاصل کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو جائے گی تو گذشتہ تمام سالوں کی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ اگر دین مویشی اور مطعوم کے قبیل سے ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (فقہ الاسلامی وادلہ ۲/ ۷۷۰-۷۷۱)۔

دین کے بارے میں حنا بلہ کی رائے یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے دین مغل ہو یا مؤجل، اور چاہے مقروض دین کا اقرار کرنے والا ہو یا اس سے انکاری ہو، اور چاہے وہ تنگ دست ہو یا خوشحال یا مال منول کرنے والا، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد واجب ہوگی، اور گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی (المغنی ۳/ ۳۶۳)۔

## ۶- پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

”ملک نام“ ہی کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں سرکاری محکموں، مختلف پرائیویٹ کمپنیز اور ادارے میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں، ان کی ماہانہ تنخواہ میں سے ایک متعین حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکاری کمپنی اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے، اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم مع بونس کے ملازم کو دیدی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ (PF) کہلاتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے بعد واجب ہوگی تو گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ یا قبضہ کے بعد سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کی حیثیت کی تعیین کر لی جائے کہ دین کی کس قسم میں اس کا شمار ہے، پھر اس پر حکم لگانا آسان ہوگا، حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے:

دین قوی وہ ہے جو سامان تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذمہ واجب ہو، اس کی تفصیل دیون کی بحث کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

دین متوسط جو مالی معاوضہ کے طور پر ذمہ میں واجب ہو مگر وہ ایسے سامان کی قیمت ہو جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، جیسے استعمالی کپڑے اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف جو مالی معاوضہ کے بغیر واجب ہو، جیسے عورت کا دین مہر، خلع اور صلح کی رقم۔ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کو دین قوی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ کسی سامان تجارت کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے اور خدمت مال تجارت ہے یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کے نزدیک یہ تفصیل ہے:



”غلام اور مکان اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے، البتہ جو غلام اور مکان تجارت کے لئے ہو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار دیا گیا ہے، تو جب غلام کی خدمت کو کلی الاطلاق مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے، بلکہ صرف تجارت کے غلام کی خدمت کو مال تجارت قرار دیا گیا تو آزاد شخص کی خدمت کو بدرجہ اولیٰ مال تجارت قرار نہیں دیا جاسکتا ہے“ (البحر الرائق ۲/۲۰۸)۔

اب صرف دو احتمال باقی رہ جاتا ہے:

۱- اگر خدمت کو مال تجارت قرار دیا جائے تو وہ دین متوسط میں داخل ہوگا۔

۲- اور اگر اسے مال عی قرار نہ دیا جائے تو وہ دین ضعیف میں داخل ہوگا۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ دین متوسط کے حکم میں ہے اور قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مبسوط، جامع اور امالی میں امام صاحب سے یہی قول منقول ہے، علامہ شمس الدین سرحسی نے اس قول کو اصح قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ منفعۃ عقد کے ذریعہ مالیت کا حکم لے لیتی ہے، اس قول کے مطابق اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہیں:

۱- ایک قول یہ ہے کہ جب تک دو سو درہم بقدر نصاب پر قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس درہم پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ خدمت و اجرت ”دین ضعیف“ کے حکم میں ہے، اور وہ مہر کی طرح ہے۔

امام ابو یوسف نے اسے امام صاحب سے نقل کیا ہے، اس قول کے مطابق اس کی

وصولیابی کے بعد جب حولان حول ہو جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی (المبسوط للسرہنی ص ۳۳)۔  
 اجرت و خدمت کے بارے میں تیسری روایت یہ ہے کہ اجرت و خدمت علی الاطلاق  
 نہ تو مال ہے اور نہ غیر مال، بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا مکان تجارت کی اجرت ہے تو وہ مال  
 ہے ورنہ مال نہیں ہے، صاحب ”مبسوط“ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے (حوالہ سابق)۔

مگر یہ سب مباحث اور روایات کا اختلاف غلام کی خدمت کے بارے میں ہے، جو  
 من وجہ مال ہے، آزا کی خدمت کے مال ہونے کی صراحت کسی فقیہ نے نہیں کی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں پر اوپنٹ کی رقم دین قوی میں داخل نہیں ہو سکتی، اور اسے  
 دین متوسط میں بھی داخل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آزا شخص کی خدمت کو مال  
 قرار دینے کی تصریح نہ مل جائے، اور اگر بالفرض اسے دین متوسط میں داخل بھی کر دیا جائے تو صحیح  
 قول کے مطابق اس کا حکم بھی دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب  
 نہیں ہوگی۔

لہذا پر اوپنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ جب وہ رقم قبضہ میں آجائے گی  
 تو سال مکمل ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ دینی پرے گی، گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں  
 ہوگی، حضرت تھانویؒ نے PF پر زکوٰۃ کا عدم وجوب ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس جمع شدہ روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ وصول  
 کے بعد سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس تفصیل سے کہ اگر اس کے پاس پہلے سے کوئی نصاب  
 نہیں تب تو بعد حولان حول کے اور اگر کوئی نصاب ہو تو اس نصاب کی زکوٰۃ کے ساتھ“ (امداد

الفتاویٰ ۲/۳۵)۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے:

”روایات فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے احقر کو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم

پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں“ (حوالہ سابق)۔

دوسری شرط نما

نما کی تعریف اور اس کی حقیقت

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا نامی ہونا ہے، نماء بالمذلت میں زیادتی اور بڑھوتری کے معنی میں آتا ہے، جدید اصطلاح میں نمایا نمو کے معنی ہیں وہ مال جو صاحب مال کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور اصطلاح شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں:

نما حقیقی اور نما تقدیری

حقیقی کا اطلاق مویشیوں کی نسل بڑھنے اور کاروبار میں اضافہ ہونے پر ہوتا ہے، اور تقدیری کا اطلاق ایسے مال پر ہوتا ہے جس کا بڑھایا جانا ممکن ہو یعنی اضافہ پذیری کی صلاحیت رکھنے والا مال، صاحب مال یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو (البحر المرقوم ۲/۲۰۶-۲۰۷)۔

لہذا وہ مال جس میں صاحب مال اپنے ذریعہ یا اپنے نائب کے ذریعہ اضافہ اور بڑھانے پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی، اگرچہ اس مال پر اسے ملکیت حاصل ہو، جیسے مال شمار، اور اسی وصف نما کے فوت ہونے کی وجہ سے مال مفقود، عبد آبق، دریا میں گرے ہوئے مال، صحرا میں دن کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی گئی ہے (فقہ المکا ۱۳۹/۱۳)۔

حیوانات میں نمو اور افزائش نسل کے ذریعہ ہوتی ہے اور حیوانات کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ سونے اور چاندی میں خلقتی طور پر نمایا جاتا ہے، اس لئے ہر حال میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، شریعت نے وجوب زکوٰۃ کیلئے حقیقت نما کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، کیونکہ نما ایک امر خفی ہے اور اس میں لوگوں کے طریقے اور ان کی عادتیں باہم مختلف ہوتی ہیں، اس لئے

شریعت نے حیوانات کے اندر ”اسامہ“ کو حصول نسل کے قائم مقام قرار دیا ہے، اور حیوانات اور سونے چاندی کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کی نیت سے اسے اپنے پاس مکمل ایک سال روک کر رکھنے کو حصول نما کے قائم مقام قرار دیا ہے (بدائع ۱۱/۲، تاوی ۲۵، رضانہ ۲/۲۱۷)۔

### نمو کے شرط ہونے کی حکمت

محقق ابن الہمام نے ”نمو“ کے شرط لگانے کی حکمت و مصلحت ذکر کرتے ہوئے لکھا

ہے:

”اگرچہ زکوٰۃ کا مقصد ابتلاء ہے، تاہم اس سے مقصود فقراء کے ساتھ مواساة اور ہمدردی ہے اس طور سے کہ وہ خود فقیر نہ بن جائے، اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ وہ اپنے کثیر مال میں سے تھوڑا سا مال ان پر خرچ کرے، لہذا اگر اموال غیر نامیہ میں زکوٰۃ واجب کی جاتی تو چند سال گزر جانے کے بعد اس کے برعکس صورت پیدا ہو سکتی ہے“ (فتح القدیر ۲/۱۱۳)۔

### وہ اموال جن کی نشوونما رک گئی ہو ان پر زکوٰۃ

نمو کے ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اموال جن کی نشوونما اور افزائش رک گئی ہو، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر اس پر زکوٰۃ واجب کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ وہ مال ہی ختم ہو جائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ مال کے نمو میں رکاوٹ کی دو صورتیں ہیں:

۱- ایک وہ رکاوٹ ہے جو نفس مال کی طرف سے ہو۔

۲- دوسری وہ ہے جو صاحب مال کی طرف سے ہو۔

جو رکاوٹ مال کی طرف سے ہو، مثلاً مال غصب کر لیا گیا ہو اور مال مغصوب کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو، یا ایسا قرض جس کے واپس ملنے کی کوئی امید نہ ہو، یا مال دریا میں گر گیا ہو، یا مال صحرا میں دفن کیا گیا اور دفن کی جگہ بھول گیا ہو تو ان صورتوں میں اصحاب اموال شرعاً

معذور تر اپنائیں گے اور قبضہ سے پہلے ان اموال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔  
 رعی وہ رکاوٹ جو خود صاحب مال کی طرف سے ہو تو عدم اثر انش کے معاملے میں  
 شریعت نے اس عذر کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، اور رکاوٹ کے اسباب کی تفصیلات میں گئے بغیر  
 اس پر زکوٰۃ واجب تر اردی گئی ہے، کیونکہ ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال  
 کو نفع بخش بنانے کی کوشش کرے اور ہر جائز ذریعہ سے اس میں اضافہ کی کوشش کرے (فقہ  
 الحکاۃ ۱/۱۳۳)۔

### تیسری شرط حاجت اصلیه سے فارغ ہونا

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا حاجت اصلیه سے فارغ ہونا ہے، اگر کسی شخص کے  
 پاس بقدر نصاب مال ہے اور اسے اس مال پر ”ملک تام“ بھی حاصل ہے اور وہ مال نامی بھی ہے،  
 مگر وہ مال اس کی حاجت اصلیه میں مشغول ہے تو شرعاً اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مال کے  
 حاجت اصلیه سے فارغ ہونے کو وجوب زکوٰۃ کی شرط اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر غنی  
 (مالداری) اور نعمت کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے، کیونکہ جو شخص ضروریات اصلیه کا محتاج ہوتا ہے اسے  
 عرفاً مالدار ہی نہیں سمجھا جاتا ہے اور نہ وہ شخص برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، علامہ کاسانی نے  
 اس کے شرط ہونے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”مال کا حاجت اصلیه سے فارغ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ غنی درحقیقت اسی  
 صورت میں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو شخص ضروریات اصلیه کا محتاج ہوگا وہ غنی نہیں کہا جاسکتا اور نہ  
 اس صورت میں تنعم کا مفہوم پایا جاتا ہے، جس کے شکر کے طور پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے اور نہ ہی  
 اس صورت میں برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے خوش دلی اور برضا  
 و رغبت اپنے اموال کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے (بدائع ۱۱/۲)۔“

فقہاء کی اصطلاح میں حقیقتہً حاجتِ اصلیہ میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کا انسان اپنی بقاء و تحفظ کے لئے محتاج ہو، مثلاً اشیاء خورد و نوش، ہر موسم کے لحاظ سے لباس، رہائشی مکان، فرنیچر، اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں، اہل حرفت کے لئے آلاتِ حرفت اور وہ ساری چیزیں حاجتِ اصلیہ کے دائرہ میں آتی ہیں جنہیں عرفاً ضروریاتِ زندگی سمجھا جاتا ہے، علامہ ابن نجیم اور ابن عابدین شامی نے ابن الملک کے حوالہ سے حاجتِ اصلیہ کی یہ تعریف کی ہے:

”حاجتِ اصلیہ وہ چیزیں جو انسان سے بلاکت کو دور کر دیں تحقیقاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلاتِ حرب، گرمی اور سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے یا تقدیراً جیسے قرض، کیونکہ قرض دار ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کو قید سے بچانے کے لئے جو بلاکت کے مترادف ہے نصاب کے مال میں قرض ادا کرے، اسی طرح آلاتِ حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک جہالت بھی بلاکت ہی کے مثل ہے“ (۲۶۳/۲، ج ۲، ۲۰۶/۲)۔

حاجتِ اصلیہ کا مفہوم، زمان و مکان کے تغیر سے بدلتا رہے گا

حاجتِ اصلیہ کا تعلق دراصل انسان کی شخصی اور انفرادی ضروریات سے ہے جس میں زمان و مکان، عرف و تعامل اور ماحول کے لحاظ سے تبدیلی عینِ فطرت ہے، حالات و زمانے اور مکان و ماحول کے تغیر سے انسان کی بنیادی حاجتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے حاجتِ اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین کرنا مشکل ہے، اسے مہلتی بہ کے حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ بہت ہی مختصر، محدود اور تنگ ہے اور اس کے اندر صرف وہی چیزیں داخل ہیں، جو انسان کو بلاکت سے یقینی طور پر بچاتی ہیں، مگر حاجتِ اصلیہ کے ذیل میں جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ حاجتِ اصلیہ کا دائرہ کافی حد تک وسیع اور تمام ہی ضروریاتِ زندگی کو شامل

ہے، فقہاء کرام نے جس طرح بلاکت جسمانی کا لحاظ کر کے اس سے تحفظ دینے والی اشیاء کو اس کے دائرہ میں شمار کیا ہے اسی طرح انہوں نے بلاکت معنوی اور روحانی کا بھی اعتبار کیا ہے اور اس سے بچانے والی چیزوں کو ”حاجت اصلیہ“ کا عنوان دیا ہے، چنانچہ اہل علم کے لئے اس کے موضوع سے متعلق علمی و فنی کتابوں کو حاجت اصلیہ کا درجہ دیتے ہوئے اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ جہالت ان کے لئے بلاکت وتبایع کے درجہ میں ہے، ”فإن الجہل عندہم کالہلاک“ (بخاری ۲۶۲/۲)۔

علامہ کاسانی نے حاجت اصلیہ کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کی انسان کو اپنی بقاء و تحفظ کے لئے ضرورت پڑتی ہے:

”لأنہ من ضرورات حاجة البقاء و قیام البدن“ (بدائع ۱۱/۲)۔

غور کیا جائے فقہاء نے حاجت اصلیہ کے ذیل میں رہائشی مکانات، سردی اور گرمی سے تحفظ دینے والے لباس، پیشہ وارانہ آلات، وآلات حرب وغیرہ کو شمار کیا ہے، جن کا تعلق شخصی ضروریات و حاجات سے ہے جن میں زمان و مکان اور حالات کے تغیر سے تبدیلی عین ممکن ہے، اس لئے حاجت اصلیہ کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حاجت اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ حالات و زمانہ اور عرف و ماحول کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی، لباس و پوشاک کا معیار زمانہ اور مسلک و تمدن کے لحاظ سے بدلے گا، سواری میں فرق آئے گا، کھانے پینے کی اشیاء میں تبدیلی ہوگی، رہائشی مکانات اور گھر بلوسامان میں فرق ہوگا اور یہ چیزیں حاجت اصلیہ کے زمرہ میں آئیں گی، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ حضرات فقہاء کرام نے حاجت اور تحسین و زینت کے درمیان جو فرق کیا ہے اسے ملحوظ رکھا جائے اور جو چیزیں تحسین و زینت کے دائرہ میں آتی ہیں انہیں حاجت کے دائرہ میں نہیں رکھا جائے۔

واضح رہے کہ حاجت اصلیہ سے مراد مکلف بالزکاة کی اس کے اہل و عیال اور ان

انہ کی حاجت اصلیہ ہے جن کا نفقہ شرعاً اس پر واجب ہوتا ہے جیسے بیوی، بچے۔  
 ”والمعتبر هنا الحاجات الأصلية للمكلف بالزكاة ومن يعوله من  
 الزوجة والأولاد“ (فقہ الزکاة ۱/۱۵۳)۔

### چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط مال کا دین سے محفوظ ہونا ہے، اگر کسی کے پاس بقدر نصاب  
 مال ہو، مگر وہ مقرض ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد صاحب نصاب نہ رہتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب  
 نہیں ہوگی، مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار کی مالیت ہے مگر وہ چالیس ہزار کا مقرض ہے تو  
 اس شخص پر صرف دس ہزار جو فارغ عن الدین ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

دین کی بحث کے ذیل میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

- ۱- کن اموال میں دیون مانع زکوٰۃ ہیں۔
- ۲- کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں۔
- ۳- دیون کی اقسام۔
- ۴- طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوٰۃ میں مانع ہیں یا نہیں۔
- اب ہم ان پر ترتیب وار گفتگو کرتے ہیں۔

### ۱- کن اموال میں دیون مانع زکوٰۃ ہیں

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دین اموال باطنہ (سونا، چاندی اور سامان تجارت) میں  
 مانع زکوٰۃ ہے، یعنی دین کی مقدار مال منہا کرنے کے بعد بقیہ مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی، عطاء،



سلیمان بن یسار، حسن نخعی، لیث، مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابو ثور، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے، امام مالک کے استاذ ربیعۃ الرازی، حماد بن سلمان اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قول جدید اس کے خلاف ہے۔

اموال ظاہرہ، حیوانات اور کھیتوں کے بارے میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس میں دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے، امام مالک، اوزاعی، شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کی ایک روایت اسی کے مطابق ہے (المغنی ۳۲۳-۳۳)۔

### ۲، ۳- کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں

دیون کی قسمیں، حنفیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں:

الف- بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو، جیسے قرض اور سامان تجارت کی قیمت اور اجرت وغیرہ۔

ب- بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو، جیسے وہ مال حرام جس کے مالک کا پتہ نہ ہو۔

۲- وہ دیون جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، ان کی بھی دو صورتیں ہیں:

الف- بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو، جیسے زکوٰۃ، عشر اور خراج، کو یہ چیزیں حق اللہ کے قبیل سے ہیں، مگر بندوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے، اموال ظاہرہ، مویشی اور زرعی پیداوار میں امام وقت کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے اور اموال باطنہ، سونا چاندی اور سامان تجارت میں بھی امام یا اس کے نائب کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے۔

ب- دوسری صورت یہ ہے کہ بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو، جیسے دیون، نذر و کفارات، ان دیون میں سے دین عبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی موجود ہو وہ

وجوب زکوٰۃ کے باب میں مانع ہے اور صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ دین کی مقدار مالیت نکالنے کے بعد باقی ماندہ مالیت بقدر نصاب ہو جائے۔

دین عبد کی وہ قسم جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہ ہوتا ہو، جیسے مال حرام، صحیح قول کے مطابق وہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا۔

وہ دین جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اس میں صرف وہ دین وجوب زکوٰۃ اور وجوب صدقۃ انظر میں مانع ہوگا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو، مگر یہ دین بھی عشر و خراج کے وجوب میں مانع نہیں ہوگا، ”بحر“ میں ہے:

”لأن الدين لا يمنع وجوب العشر والخراج ويمنع صدقة الفطر“

(بدائع ۶/۳)۔

باقی وہ سارے دیون جن کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہیں ہوتا ہے جیسے دیون، نذور، کفارات تو وہ مانع نہیں ہوں گے، علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

”وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط مال کا دین سے فارغ ہونا ہے، اور دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو، اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہو تو وہ بقدر دین مانع زکوٰۃ ہوگا، چاہے وہ دین معجل ہو یا مؤجل، امام شافعی کے نزدیک دین چاہے جس قسم کا ہو وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا۔“

کاسانی نے دین کے مانع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت عثمان کا یہ قول پیش کیا ہے کہ انہوں نے رمضان المبارک میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

”لو کو! تمہارے زکوٰۃ دینے کا مہینہ سایہ فلگن ہو گیا ہے، پس جس شخص کے پاس مال ہو اور مقروض ہو تو وہ مقدار دین کو منہا کرنے کے بعد اپنے باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔“

”بحر الرائق“ میں ہے:

”مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو، لہذا اندر و کفارات کا دین و جوہ زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا“ (بحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

### عورت کا مہر مانع و جوہ زکوٰۃ ہے یا نہیں

یہ سوال کہ عورت کا دین مہر و جوہ زکوٰۃ میں مانع ہوگا یا نہیں؟ یعنی جس طرح دوسرے دیون مانع و جوہ ہیں مہر کی رقم بھی مانع ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں:

۱- ایک قول یہ ہے کہ مطلقاً عورت کا مہر و جوہ زکوٰۃ میں مانع ہے۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ مہر معجل مانع ہے، مؤجل مانع نہیں ہے۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مہر کی ادائیگی کا فوری ارادہ ہو تو مانع ہے اور اگر ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو مانع نہیں ہے، علامہ کاسانی نے ہمتانی کے حوالہ سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

”زاد القہستانی عن الجوہر والصحیح أنه غیر مانع“ (نہج ۵/۲)۔

”بحر الرائق“ میں ہے:

”ولو صدق زوجة المؤجل إلى الطلاق أو الموت، قيل: المہر المؤجل لا يمنع؛ لأنه غیر مطالب به عادة بخلاف المعجل، وقيل: إن كان الزوج على عزم الأداء يمنع وإلا فلا، لأنه لا يعد ديناً“ (بحر الرائق)۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۲/۲۳)

پس حاصل یہ ہے کہ اگر بیوی کا مہر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں عورت کا مہر و جوہ زکوٰۃ میں مانع ہوگا، اس کی ادائیگی کے بعد اگر مال بقدر نصاب رہ جائے تو اس پر جوہ زکوٰۃ ہوگا اور اگر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پھر مہر مانع و جوہ زکوٰۃ نہیں ہوگا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوٰۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

دیون کی بحث کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لئے قرض اور اس قسم کے مختلف ترقیاتی قرضے سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کی ادائیگی کے لئے ۵ سال سے لے کر ۳۰-۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسط و اقساط کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے، مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لئے ۵ کروڑ روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے، یعنی سالانہ دس لاکھ روپے ادا کرنا ہے، یا کسی شخص نے ٹریڈر کی خریداری کیلئے ایک لاکھ روپے قرض لیا جسے دس سال میں دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے، ان صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے اموال زکوٰۃ میں پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟

اس سلسلہ میں اگرچہ عام طور پر علماء یہی فرماتے ہیں کہ دین مؤجل ہو یا مؤجل، دونوں ہی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا، علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

”فإنه يمنع وجوب الزكاة بقدره حالا كان أو مؤجلاً“

تاہم بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ دین مؤجل وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا، خود کاسانی نے بعض مشائخ سے یہ نقل کیا ہے:

”وقال بعض مشائخنا: إن المؤجل لا يمنع لأنه غير مطالب به عادة“

(بدائع ۶/۳۲۰)

شامی نے ”شرح الطحاوی“ کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب ایسے دین کو مانع زکوٰۃ قرار نہیں دیتے تھے، شامی ہی نے تہستانی کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ایسا دین وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔

”فتاویٰ تارخانیہ“ میں مجد الأئمة السرخسی کے حوالہ سے ان کے بعض مشائخ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین مؤجل و وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے (۲۶۱/۳)۔

”ذکر مجد الأئمة السرخسی عن مشائخه أنه لا يمنع“ (فتاویٰ ۲۶۱/۳)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں رقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے طویل الاجل ترقیاتی قرضوں میں صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### کمپنیوں کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ کا حکم

زکوٰۃ کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء اور حصہ دار ہوتے ہیں جو اپنے اپنے حصہ کے بقدر مالیت کے مالک ہوتے ہیں، بعض صورتیں ایسی ممکن ہیں کہ کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت نصاب زکوٰۃ سے زائد ہو، مگر شرکاء کے حصص کو علیحدہ کرنے کی صورت میں کوئی بھی صاحب نصاب نہ ہوتا ہو، یا بعض صاحب نصاب ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کا وجوب کمپنی کی مجموعی مالیت کے لحاظ سے ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، اس سلسلہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت اور اس کے اثاثے میں وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا، بلکہ کمپنی کے شرکاء کی انفرادی حالت کا اعتبار ہوگا، اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت ہوگی جس کے ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو صرف اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کڑور ہے جو بلاشبہ نصاب شرعی سے کافی زائد مالیت ہے، کمپنی کے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ ہے تو وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر شریک کی انفرادی حیثیت کو دیکھا جائے گا اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت پہلے سے موجود ہو جس کو ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو اس

پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔  
امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر سائمنڈ جانور دو یا دو سے زائد افراد کے مابین مشترک ہو، یا سامان تجارت ہو تو وجوب زکوٰۃ میں شرکاء کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر شریک کی انفرادی حالت معتبر ہوگی۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ان کے درمیان معاملہ شرکت درست اور صحیح ہوگا تو پھر زکوٰۃ کا وجوب ”مجموعی مالیت“ پر ہوگا۔

”ولا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة  
وان صحت الخلط فيه“ (در مختار علی ہاشم الثانی ۲/۳۰۴)۔

### ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ شرعاً منصوص ہیں، اموال زکوٰۃ قیاسی نہیں ہیں، لہذا قیاس و ظن کے ذریعہ کسی ایسی چیز پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاسکتی جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے، معدنیات میں سے صرف سونے اور چاندی پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے، باقی معدنیات چاہے جتنی بھی قیمتی اور مالیت رکھنے والی ہوں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں کی گئی ہے، لہذا ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے جتنی بھی مالیت کے ہیرے و جواہرات اپنے پاس محفوظ کئے جائیں، یا زیورات کی شکل میں محفوظ کئے جائیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر کوئی شخص ہیرے اور جواہرات کی تجارت شروع کر دے تو پھر ان کا حکم سامان تجارت کا ہوگا اور سامان تجارت کی حیثیت سے ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ در مختار میں ہے:

”لا زکوة فی اللالی والجواهر وإن ساوت ألفا اتفاقاً إلا أن تكون  
للتجارة، والأصل أن ما عدا الحجرین والسوائم إنما یزکی بنية التجارة بشرط  
عدم المانع“ (در مختار علی ہاشم الثانی ۲/۲۷۳)۔

”فتاویٰ تارخانیہ“ میں ہے:

”ولیس فیما یشتری للتجمل و الزینة من خادم و متاع و لؤلؤ و جوهر و فلوس للنفقة شیء خزانه الفقه، و لیس فی البواقیت، و فی المضممرات: و إن کان حلیاً إلا أن تكون للتجارة“ (۲۳۲/۲-۲۳۵)

### اموال تجارت میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا

مال تجارت کی زکوٰۃ میں قوت خرید کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ سامان تجارت کی موجودہ قیمت و مالیت معتبر ہوگی اور اسی لحاظ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ اس سلسلہ میں علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے کہ کس دن کی قیمت معتبر ہوگی؟ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ جس دن اس مال پر سال گزرا اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوئی اس دن اس سامان کی جو قیمت و مالیت رہی ہوگی اسی کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جس دن زکوٰۃ ادا کی جائیگی اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

”ولو أراد أن یودی القیمة جاز عندنا خلافاً للشافعی لکن عند أبی حنیفة فی الزیادة و النقصان جمیعاً أن یودی قیمتها یوم الحول..... و عندهما فی الفصلین جمیعاً یودی قیمتها یوم الأداء“ (بدائع ۲۳۲/۲)

”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”وإن أدى من قیمتہ یعتبر یوم الوجوب وهو تمام الحول عند الإمام، و قالوا: یوم الأداء لمصرفها“ (ہندیہ ۱۸۰/۱، وکذا فی التارخانیہ ۲۳۲/۲)

زکوٰۃ کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے، اسی مال سے زکوٰۃ بھی ادا کی جائے، مگر فقہاء کرام نے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ اصل سامان کے بجائے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اس لئے کہ

قیمت اصل کا بدل ہوتی ہے، اس اعتبار سے صاحبین کا مسلک زیادہ رائج اور قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ جس دن زکوٰۃ ادا کی جا رہی ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے، کیوں کہ وہی قیمت اصل کا بدل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا چھٹکر فر و خنگی کا، تو ظاہر ہے کہ اگر تھوک کے حساب سے مال فروخت کیا جاتا ہے تو تھوک کے بھاؤ کا لحاظ ہوگا، اور اگر چھٹکر فر و خت کیا جاتا ہے تو چھٹکر فر و خنگی کا اعتبار ہوگا، اور اگر کوئی شخص دونوں طرح سے فروخت کرنا ہو تو پھر نفع للمنفرداء کے اصول کے پیش نظر چھٹکر فر و خنگی کے لحاظ سے ادا کرے۔ ”ہدایہ“ میں ہے:

”يقومها بما هو أنفع للمساكين احتياطا لحق الفقراء“ (ہدایہ علی ہاشم

الفتح ۱۶۷/۳)۔

اگر اراضی کی خرید و فروخت تجارتی کاروبار کے نقطہ نظر سے کی جائے تو وہ سامان تجارت ہونے کی وجہ سے اموال تجارت میں شامل ہیں، اور سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں ان کی موجودہ معروف قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، وجوب زکوٰۃ میں اراضی کی موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا، آئندہ متوقع قیمت فروخت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

### شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیرز چونکہ ایک تجارتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں، لہذا شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ شیرز کی زکوٰۃ میں تفصیل یہ ہے:

”جو کمپنی تجارت کرتی ہے اور خود سامان تیار کر کے فروخت کرتی ہے، جیسے ریشم اور کپڑے کے کارخانے، تو اس صورت میں کمپنی کی مالیت کی حیثیت سامان تجارت کی ہوگی، اور رأس المال اور اس کے منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ آلات حرفت اور مشنری اشیاء کی مالیت اس سے مستثنیٰ ہوگی، اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے صرف کرایہ وصول کرتی ہے کرایہ پر



مکانات، دکانات دیتی ہے تو ایسی کمپنی کے صرف منافع پر وجوب زکوٰۃ ہوگا۔“  
 ”فتاویٰ رحیمیہ“ میں ہے:

”شیئرز پر زکوٰۃ ہے۔ شیئرز جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے، لوہا اور سامان بنا کر تجارت کرنے والے کارخانے اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصل رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے، اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے محض کرایہ وصول کرتی ہے تو زکوٰۃ نفع پر واجب ہے، اصل رقم پر زکوٰۃ معرض نہیں ہے“ (فتاویٰ رحیمیہ ۱۱۱/۳)۔

یوسف القرضاوی نے شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے:

”صنعتی اور اس جیسی کمپنیاں جن کا سرمایہ مشینوں اور عمارتوں وغیرہ میں لگا رہتا ہے جیسے پریس، فیکٹریاں، کرایہ پر چلنے والی موٹریں، تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے نہیں بلکہ ان کی خالص آمدنی اور منافع سے لی جائے گی، ایسی تجارتی کمپنیاں جن کا بیشتر سرمایہ منقولات میں لگا رہتا ہے اور جن کی تجارت کی جاتی ہے اور جو اصلاً باقی نہیں رہتیں تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے بازار کی قیمت کے مطابق وصول کی جائے گی، اس قیمت میں منافع کو شامل کر کے اور غیر منقولہ سامان کی قیمت کو حصص میں سے وضع کر کے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا پڑے گا (نقد الزکوٰۃ ۱/۵۲۷-۵۲۸)۔“

واضح رہے کہ شیئرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت و مالیت کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جائے گا، بلکہ بہ وقت اداء زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ اور مالیت ہوگی اس کا اعتبار کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### بونڈز کی زکوٰۃ

بونڈز (Bonds) درحقیقت بینک، کمپنی یا حکومت کے قرض دار ہونے کا وثیقہ اور تمسک ہے جن کے حامل متعین رقم مع منافع پانے کا حقدار ہوتا ہے، گویا بونڈ کا مالک دین مؤجل کا

مالک ہوتا ہے، لہذا یہ ”دین قوی“ کے قبیل سے ہے، اس لئے کیش کرانے کے بعد تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### مخبر ثانی: نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں سے کسے معیار قرار دیا جائے یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے سونے اور چاندی کو مستقل نصاب کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس وقت سونے اور چاندی کے نرخ میں غیر معمولی تفاوت اور فرق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امول تجارت میں نصاب و وجوب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے یا سونے کے نصاب سے؟ اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ، غنی یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لئے زکوٰۃ لیما ممنوع قرار دیا جائے گا، معیار کسے قرار دیا جائے؟

اس سلسلہ میں علماء کے خیالات و رجحانات مختلف ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے دونوں میں سے کسے اصل اور معیار قرار دیا جائے، علامہ یوسف القرضاوی کا رجحان اس طرف ہے کہ سونے کو معیار قرار دینا زیادہ بہتر ہے، مگر خود قرضاوی صاحب نے علماء معاصرین کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اکثریت چاندی کو معیار قرار دیتی ہے، لکھتے ہیں:

”البتہ اس وقت ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نقدین سونے چاندی میں سے کس کے ذریعہ نصاب شرعی کی تحدید و تعیین کریں گے، یعنی غنا کی وہ آخری حد کیا ہوگی جس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ہوگا، اس گفتگو کی ضرورت اس بناء پر پڑی کہ شارع نے سونے چاندی کو علیحدہ علیحدہ نصاب مقرر کیا تھا، ایک کا نصاب دوسرے کے مخالف تھا، تو کیا ہم چاندی کو وجوب زکوٰۃ کا معیار قرار دیں گے، بہت سے علماء معاصرین کا اسی طرف میلان ہے اور اس میلان کی دو

وجہ ہے:

- ۱- چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اس کا ثبوت احادیث صحیحہ مشہورہ ہے۔
- ۲- چاندی کو معیار قرار دینے اور اس کے ذریعہ تقدیر کی صورت میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے، کیونکہ چاندی کو معیار قرار دینے کی صورت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

راقم الحروف کا بھی اسی طرف رجحان ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے نصاب چاندی کو معیار قرار دیا جائے، لہذا اس دور میں اگر کسی کے پاس سامان تجارت یا کوئی دوسری مالیت نصاب چاندی کے بقدر ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور وہ غنی قرار پائے گا، اس کے لئے زکوٰۃ لیمّا حرام ہوگا، زکوٰۃ کے باب میں ہمیشہ فقراء و مساکین کی منفعت کے پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہئے، کیونکہ زکوٰۃ کی مشروعیت ہی فقراء کو نفع پہنچانے کے لئے ہوئی ہے۔

### مخبر ثالث: مصارف زکوٰۃ

#### اہل مدارس کیلئے ایک آسان راہ

اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ ہے ادارہ اس کے قیام و طعام، تعلیم اور دوسری ضروریات کے انتظام پر آنے والے اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو روپے کا چیک، اس کے حوالے کرے، چیک پر طالب علم کا قبضہ اصل رقم پر تصور کیا جائے گا اور اس طرح سے وہ اس رقم کا مالک ہو جانے کے بعد جب وہ چیک مدرسہ کو واپس کرے گا تو مدرسہ والوں کے لئے اس رقم کو مدرسین کی تنخواہ اور تعمیرات میں خرچ کرنے کی گنجائش ہوگی، مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کے لئے یہ آسان اور قابل عمل طریقہ ہے، اس پر عمل کرنے سے بہت ساری برائیوں سے حفاظت ہوگی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل اور طلبہ کا نائب ہے  
 مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہے، کیونکہ معطلی نے اسی کو زکوٰۃ صرف کرنے کا حکم دیا  
 ہے اور اسے وکیل بنایا ہے، اس لئے قبضہ مہتمم من کل الوجوه قبضہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہوگا اور تملیک  
 طلبہ اور تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری ہوگی، اور محض مہتمم مدرسہ کو زکوٰۃ دے دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں  
 ہوگی، نیز مہتمم مدرسہ طلبہ کا بھی نائب ہے، واضح رہے کہ طلبہ کے نائب ہونے کا مطلب یہ نہیں  
 ہے کہ وہ جہاں چاہے زکوٰۃ کی رقم صرف کر دے بلکہ وہ جس کا نائب ہے اور جس کی نیابت کے طور  
 پر اس نے زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقم وصول کی ہے اسی پر صرف کرنا متعین ہے، اگر وہ غیر مصرف  
 میں اسے صرف کر دیتا ہے تو زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس  
 سلسلہ میں لکھا ہے:

”مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے،  
 پس جوشی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکالا اور  
 ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول الکمیہ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں  
 وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے“ (فتاویٰ رشیدیہ)۔

### کمیشن پر زکوٰۃ

مدارس اسلامیہ کے سفراء مخلصین عاملین زکوٰۃ کے حکم میں نہیں ہیں جن کا مستحق زکوٰۃ ہونا  
 نص قرآنی سے ثابت ہے، کیونکہ عامل زکوٰۃ جو مصرف زکوٰۃ ہے وہ شخص ہے جسے امیر المؤمنین نے  
 لوگوں کی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی تحصیل کیلئے مامور کیا ہو، عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:  
 ”العامل هو الذی یبعثہ الإمام لجباية الصدقات“ (عنایہ علی ہاشم للفتح ۲/۲۰۳)۔  
 ”الفتنہ علی المذہب الاربعہ“ میں ہے:

”عالم زکوٰۃ صرف اس صورت میں زکوٰۃ لینے کا حقدار ہوگا جب کہ امام وقت نے زکوٰۃ کی وصولی پر اسے مامور کیا ہو، ”وإنما يأخذ العامل منها إذا فرقها الإمام“ (اللہ علیٰ المرءہب الاربعہ ۱/ ۶۳۵)۔

امام المسلمین کو تمام مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے اور اس بنیاد پر اسے زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا شرعاً حق ملتا ہے، اور زکوٰۃ کی وصولی کیلئے اس کا متعین کیا ہوا عملہ مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہے، مگر مدارس کے مہتمم کو ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، اس لئے اس کے مصلیٰ و سفراء کو عاملین زکوٰۃ کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عامل صدقات کو زکوٰۃ کی رقم بطور معاوضہ و اجرت نہیں ملتی ہے، بلکہ وہ اپنے اوقات کو مامور المسلمین کے لئے فارغ کر دیتا ہے اور ہمہ وقت اس میں مشغول رہتا ہے اس لئے جزاء احتباس کے طور پر بقدر کفایت (جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے گزارے کے لئے کافی ہو) اسے مال زکوٰۃ میں سے دیا جاتا ہے۔

”الاختیار لتعلیل المختار“ میں ہے:

”ولیس ذلک بالاجارۃ لانه عمل غیر معلوم“ (الاختیار لتعلیل المختار ۱/ ۱۱۸)۔

مدارس کے سفراء کو زکوٰۃ کی رقم بطور اجرت و معاوضہ دی جاتی ہے اور زکوٰۃ کی رقم کو اجرت و معاوضہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

کمیشن پر چندہ کرانے میں کئی طرح کی خرابیاں ہیں:

- ۱- اس میں اجرت مجہول ہوتی ہے، عمل و مدت کی بھی تعیین نہیں ہوتی، حالانکہ عقد اجارہ کی صحت کیلئے اجرت کی تعیین، عمل اور مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔
- ۲- زکوٰۃ کی رقم کا زیادہ تر حصہ خود مصلیٰ و سفراء پر خرچ ہو جاتا ہے جو مشروعیت زکوٰۃ کے خلاف ہے، زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتی ہے اور اس صورت

---

میں ان تک زکوٰۃ کی رقم کا بہت کم حصہ پہنچ پاتا ہے۔

۳- مدارس کے ذمہ داران کے لئے زکوٰۃ کی رقم کو اس کے مصرف میں صرف کرنا ضروری ہے اور جب تک وہ رقم اپنے مصرف میں صرف نہیں ہوگی زکوٰۃ دہندگان بری الذمہ نہیں ہوں گے، اس لئے ان وجوہات کی بنا پر کمیشن پر چندہ کرنا شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، البتہ اگر کمیشن کی رقم زکوٰۃ و صدقات واجبہ کے علاوہ غیر واجب اتملیک رقم سے ادا کی جائے تو اس صورت میں صرف ایک خرابی لازم آئے گی اور وہ ہے اجرت کا مجہول ہونا، جسے بعض مجبوریوں کے تحت کوارہ کیا جاسکتا ہے۔

## حلال و حرام مخلوط مال میں زکوٰۃ کے احکام

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی ☆

زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم ترین رکن ہے جس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے اور اس کا منکر کافر ہے قرآن و احادیث نبویہ میں اس کی ادائیگی کی بہت تاکید اور عدم ادائیگی پر بہت سخت وعیدیں بھی آئی ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ رب اعزت نے اپنی کتاب مقدس قرآن عظیم میں اتقامت صلوٰۃ کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا متعدد جگہوں میں حکم دیا ہے، زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ما قبل کی شریعتوں میں بھی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مسائل معلوم کر کے اپنے اموال کی جن پر زکوٰۃ فرض ہے، پوری ایمانداری اور دیانت کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کریں، البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ تمام اموال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے، بلکہ خاص اصناف میں مخصوص شرائط کے ساتھ زکوٰۃ فرض ہے، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

### اموال زکوٰۃ

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ دو طرح کے ہیں:

☆ مفتی امارت شریعہ بیجاوا اڈیسہ بھلوار کی شریف، پٹنہ۔

الف- اموال ظاہرہ۔

ب- اموال باطنہ۔

اموال ظاہرہ درج ذیل ہیں:

۱- سائمنہ جانور، یعنی وہ جانور جو پورا سال، یا سال کا بیشتر حصہ چرنے پر اکتفاء کرتے ہوں اور مالک کو ان کا چارہ دینا نہ پڑتا ہو، اس طرح سائمنہ جانور جن پر زکوٰۃ فرض ہے وہ تین طرح کے ہیں:

الف- (امل) اونٹ اس میں ہر نوع کے اونٹ داخل ہیں۔

ب- (بقر) گائے، بیل، بھینس وغیرہ زومادہ۔

ج- (غنم) خصی، بکری، دنبہ اور بھیڑ۔ (بدائع ۲/۸۷۲)

۲- کھیت کی ہر طرح کی پیداوار خواہ نلے ہوں یا سبز یا ہوں یا پھل عشر، یا نصف عشر واجب ہے، یعنی اگر کھاد، پانی وغیرہ کے ذریعہ سے فصل تیار ہوئی ہے تو بیسواں حصہ ورنہ دسواں حصہ واجب ہے۔

۳- نفود، خواہ اثمان خلقیہ ہوں، مثلاً سونا، چاندی، یا اثمان عرفیہ، یعنی مختلف ممالک کی کرنسیاں جو شمن عرفی کی حیثیت سے رائج ہوں، مثلاً ہندوستانی نوٹ یا سکے یا ریال پونڈ وغیرہ۔ اثمان خلقیہ خواہ سکے ہوں یا زیورات بنائے گئے ہوں، اور عرض التجارہ وہ سامان جو تجارت کی نیت سے خرید کر رکھا گیا ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، خواہ فی الحال تجارت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

### وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں ایک شرط ملک تام بھی ہے، اگر کسی شے کا مالک متعین نہیں ہے تو اس شے پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے



ہوئے جانوروں میں ملک نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے، چونکہ زکوٰۃ میں تملیک مستحقین شرط ہے اور غیر ملک میں تملیک متصور نہیں۔

”أما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها الملك، فلا تجب الزكاة في سوانم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك، وهكذا، لأن في الزكاة تمليكاً و التمليك في غير الملك لا يتصور“ (بدائع ۲/۸۲۳)۔

### ملک تام پر وجوب زکوٰۃ کی حکمت

ملک تام پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں:

”ملکیت بڑی نعمت ہے، کیونکہ یہ آزادی اور انسانیت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس سے غلام اور جانور محروم ہوتے ہیں، ملکیت سے آدمی کی قائدانہ حیثیت معلوم ہوتی ہے اور ملک تام کے ذریعہ انسان اپنے مال سے منتفع ہوتا ہے اور از خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کے بڑھانے پر قادر ہوتا ہے، اس عظیم نعمت کا شکر یہ ادا کرنا انسان پر لازم ہے کہ جب اس کو یہ نعمت نصیب ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے (فقہ الزکاۃ ۱/۱۳۱)۔“

### ملک تام سے مراد

ملک تام سے مراد ملک رقبہ اور ملک ید ہے، ملک رقبہ یہ ہے کہ اس شئی پر ملکیت حاصل ہو اور ملک ید یہ ہے کہ وہ چیز اپنے قبضہ و تصرف میں ہو، اگر ملکیت حاصل نہیں ہے، جیسا کہ غلام کو اپنے مال پر ملکیت حاصل نہیں ہے اس کا جو بھی مال ہے اس کے آقا کا ہے، یا مدیون (جس پر قرض ہے) کے پاس جو مال ہے اس پر اس کا قبضہ تو ہے، لیکن اس کی ملکیت نہیں یا ملکیت تو

حاصل ہے، لیکن قبضہ وتصرف میں نہیں ہے، یا اس سے انتفاع پر قدرت نہیں ہے، جیسا کہ مہر کی رقم ہے، قبضہ سے قبل ملکیت تو ہے، لیکن قبضہ وتصرف میں نہیں، غرض یہ کہ ملکیت رقبہ یا ملکیت ید دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

”ومنها الملك التام وهو ما اجتمع فيه الملك واليد الخ“

(ہندیہ ۱/۲۷۴ طہروت)۔

### ملک تام کی مراد میں اختلاف

امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ تو یہی فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک رقبہ اور ملک ید دونوں ضروری ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ امام زہریؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید شرط نہیں ہے، اگر کسی شے پر مکمل ملکیت ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ قبضہ وتصرف میں ہو یا نہ ہو (دیکھئے: بدائع الصنائع، کتاب الزکوٰۃ ۲/۸۲۳)۔

### مال ضما میں زکوٰۃ

چونکہ امام زہریؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ملک ید وجوب زکوٰۃ کیلئے شرط نہیں ہے، اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضما میں زکوٰۃ واجب نہیں، اور امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مال ضما میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، چونکہ مال ضما میں ملک رقبہ تو حاصل ہے، لیکن ملک ید مفقود ہے۔

### مال ضما کی تفسیر

مال ضما ہر وہ مال ہے جس پر اصل ملکیت تو قائم ہو، لیکن انتفاع پر قدرت نہ ہو، جیسا

کے بھاگا ہوا غلام، گم شدہ چیز، مال مفقود، سمندر میں ضائع شدہ مال، اسی طرح وہ مال جس کو کسی نے ظلماً لے لیا، اسی طرح وہ مال جو جنگل یا بہت پرانے مکان میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو یہ سب مال ایسے ہیں کہ ملکیت تو قائم ہے، لیکن انتفاع پر قدرت نہیں ہے (بدائع الصنائع ۲/۸۲۳)۔  
امام زفرؒ اور امام شافعیؒ ان تمام روایات سے استدلال کرتے ہیں جو اس باب میں عام ہیں، ان میں ملک رقبہ اور ملک ید کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے اگر کسی مال کا مالک متعین ہے تو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے، خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو جس کی دلیل مسافر کے مال پر وجوب زکوٰۃ ہے، اگر مال گھر میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اسی طرح قرض پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب ہے باوجودیکہ ان تینوں صورتوں میں ملکیت تو قائم ہے، لیکن مال قبضہ و تصرف میں نہیں ہے، معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے، لہذا مال ضما میں زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ ملکیت ثابت ہے۔

فریق اول کی ایک دلیل تو حدیث رسول ﷺ: "لا زکوٰۃ فی مال الضمما" ہے یعنی مال ضما میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ مال جس سے مالک انتفاع نہ کر سکتا ہو وہ مالک کے حق میں معدوم ہے، اس کے ذریعہ غنی (صاحب نساب) نہیں سمجھا جائے گا اور جو صاحب نساب نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مسافر کے مال میں وجوب زکوٰۃ کا تعلق ہے تو چونکہ مسافر اپنے مال کے ذریعہ اپنے مال میں انتفاع پر قدرت رکھتا ہے اور جو مال گھر میں مدفون ہے اس سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ پورے گھر کو کھود کر مال مدفون کی جگہ معلوم کی جاسکتی ہے، اسی طرح قرض سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ دائن جب چاہے مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس لئے ان تینوں صورتوں میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ملک ید نہیں ہے (بدائع ۲/۸۲۳-۸۲۵)۔

خلاصہ کلام یہ کہ حنفیہ کے نزدیک مفتی بقول کے مطابق وجوب زکوٰۃ کیلئے ملک ید اور ملک رقبہ دونوں ضروری ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جواب: سوال سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور خریدار نے پیشگی ثمن بھی ادا کر دیا ہے، لیکن بائع (فروخت کرنے والے) نے ابھی تک بیع خریدار کے حوالہ نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں پیشگی ثمن اور بیع دونوں پر وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث ہے کہ ان دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر۔

### ثمن پر زکوٰۃ

بیع مکمل ہو جانے کے بعد ثمن پر بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو بہر دو صورت بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً اختیار ہوتا ہے، اور جب بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً اختیار ہے تو بائع کے ذمہ ثمن پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جا رہی ہے۔ (جواز التصرف فی الثمن) بھیمہ أو بیع أو غیرہما لو عینا می مشار إلیہ (قبل قبضہ) (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۱۶۵/۳) نیز ثمن کی حیثیت دین قوی کی ہوتی ہے اور دین قوی پر دائن (قرض خواہ) کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لہذا مذکورہ صورت میں، جبکہ ثمن بائع کے قبضہ و تصرف میں آچکا ہے تو بائع کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### بیع پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ

مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ خرید و فروخت مکمل ہو چکی، لیکن بیع پر خریدار کا قبضہ نہیں ہوا تو بیع پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر؟ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

الف- اصولاً اور شرعاً فروخت کرنے والے کے ذمہ بیع کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ بیع فروخت کرنے والے کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔

ب- البتہ خریدار کے ذمہ واجب ہے یا نہیں اس سلسلہ میں کتب فقہ کی عبارتیں مختلف نظر آتی ہیں، ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ شرح فتح القدر، درمختار، یوسف القرضاوی کی فقہ الزکوٰۃ کی عبارت اس سلسلہ میں صریح ہے کہ مشتری (خریدار) پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ خریدار کو قبضہ سے قبل بیع پر ملک تام حاصل نہیں ہے، کیونکہ خریدار قبضہ سے قبل بیع میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا ہے، چنانچہ ”فتح القدر“ میں ہے: ”ويخرج أيضا المشتري لتجارة إذا لم يقبض حتى حال حول، لا زكوة فيه إذ لم يستفد ملك التصرف، وكمال لملك بكونه مطلقاً للتصرف، وحقيقته مع كونه حاجزاً“ (شرح فتح القدر ۲/ ۱۵۳، نیز دیکھئے فقہ الزکوٰۃ ۱/ ۱۳۰)۔

علامہ علاء الدین الحسکلی درمختار میں تحریر فرماتے ہیں:

”ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه“ (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/ ۷۷)۔

علامہ شامی اس سلسلہ میں مضمون نظر آتے ہیں چنانچہ ”درمختار“ کی عبارت قبل قبضہ کے تحت لکھتے ہیں:

”قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ سے قبل ہی واجب ہوگی، لیکن اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی (قولہ قبل قبضہ) أما بعده فيزكيه عما مضى كما فهمه في البحر عن المحيط“ (۲/ ۷۷)۔

لیکن علامہ شامی نے ”فتاویٰ خانہ“ کے حوالے سے جو چیز یہ نقل کیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنی جو رائے دی ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی (۲/ ۷۷)۔

لیکن ”خانیہ“ میں ہے کہ ایک شخص کے پاس سائمنہ جانور (وہ جانور جو پورا سال یا سال کا بیشتر حصہ جنگل میں چرنے پر اکتفاء کرتا ہو) ہے اور دوسرے شخص نے اس کو سائمنہ بنانے کے لئے خریدا اور سال گزرنے کے بعد اس پر قبضہ کیا تو خریدار پر گزشتہ سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ بائع پر مضمون بائمن ہے، یعنی اگر سائمنہ جانور ہلاک ہو جائے تو بائع پر اس کے ثمن کی واپسی ضروری ہوگی، اس علت کا تقاضہ یہ ہے کہ جانور خواہ سائمنہ بنانے کے لئے خریدا ہو یا تجارت کے لئے دونوں کے حکم میں فرق نہ ہو، علامہ شامی نے ”فتاہل“ کہہ کر اس مسئلہ میں مزید غور و فکر کی دعوت دے دی اور اپنے عدم اطمینان کا اظہار بھی کر دیا۔

### مسئلہ کا فقہی جائزہ

چونکہ کتب فقہ کی ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے، اس لئے ہم پہلے اس کا فقہی جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جاتی ہے یا نہیں، اس کے بعد اپنی رائے قائم کریں گے۔

مذکورہ صورت میں غور کرنے کے بعد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے بیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو ملک رقبہ تو حاصل ہے، اس لئے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد بی بیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے خواہ بیع پر خریدار کا قبضہ ہو یا نہ ہو۔

”البيع ينعقد بالايجاب والقبول“ (ہدایہ ۲۳۳)، البتہ چونکہ بیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہے، اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ خریدار کو بیع پر قبضہ سے قبل ملک ید حاصل نہیں ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں خریدار پر بھی بیع کی زکوٰۃ واجب نہ ہو ”قال فی الفتح: الأصل أن كل عقد يفسخ بهلاك العوض قبل القبض لم يجز التصرف في ذلك العوض قبل قبضه إذا كان عيناً لا يجوز بيع“

شئ من ذلك ولا أن يشترک فیہ غیرہ“ (ثانی فصل فی التصرف فی البیع والتمس ۳۱۶۳)۔  
 لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خریدار کو ملک رقبہ کے ساتھ ملک یہ بھی حاصل ہے، اس لئے کہ جب بیع مکمل ہو چکی ہے اور خریدار نے ثمن بھی ادا کر دیا ہے تو اس کو شرعاً بیع سے انتفاع پر قدرت حاصل ہے، کیونکہ وہ جس وقت چاہے فروخت کرنے والے سے بیع کا مطالبہ کر کے بیع سے انتفاع کر سکتا ہے، لہذا اس کی حیثیت دین قوی کی ہوگی، اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آئے، علامہ ابن نجیم نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح ”البحر الرائق“ میں محیط السرخسی کے حوالہ سے ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو نقل کیا ہے۔ محیط السرخسی نے دوسری رائے (قبضہ سے قبل خریدار پر بیع کی زکوٰۃ کا واجب ہونا) کو صحیح قرار دیا ہے (دیکھئے: البحر الرائق ۳/۲۰۸-۲۰۹)۔

علامہ ابن نجیم نے محیط السرخسی کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد بہت ہی بہتر اور عمدہ فیصلہ فرمایا ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ سے قبل ہی واجب ہوگی، البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی، اور دین قوی کی طرح گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ”فعلى هذا قولهم لا تجب الزکوٰۃ معناه قبل قبضه، وأما بعد قبضه فتجب زکوٰۃ فیما مضى كالدين القوی“ (البحر الرائق ۳/۲۰۹)۔

### خلاصہ جواب

رقم الحروف علامہ ابن نجیم کے مذکورہ فیصلہ سے متفق ہے اور مذکورہ بحثوں کی روشنی میں اپنی رائے بھی یہی رکھتا ہے کہ قبضہ سے قبل بیع کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی، البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور دین قوی کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

### عقد اجارہ میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوٰۃ

کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کر دی جاتی ہے، اس کی حیثیت رہن کی ہوتی ہے اور شئی مرہون پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ ہی راہن پر اور نہ ہی مرہون پر، راہن پر اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہے کہ شئی مرہون اس کے قبضہ و تصرف میں نہیں ہے اور شئی مرہون سے اس وقت تک انتفاع بھی نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ مرہون کے قبضہ میں رہے۔ اور مرہون پر اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہے کہ اس کے قبضہ اور تصرف میں تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے، گویا کہ راہن اور مرہون دونوں کی ملکیت ناقص ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں سے کسی پر شئی مرہون کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لہذا کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار کے ذمہ واجب ہوگی نہ ہی مالک کے ذمہ واجب ہوگی، البتہ کرایہ دار کو وہ رقم جب واپس مل جائے تو پھر اس پر سال گزر جائے یا پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس دوسری مالیت ہو تو اس کے ساتھ ضم کر کے کرایہ دار کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

### مدارس اور اداروں میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں تین طرح کی ہوتی ہیں:

۱- چندہ دہندگان نے چندہ کی رقم کسی خاص مد، مثلاً مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر صرف کرنے کے لئے دیا ہو۔

۲- ہدایا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم جو عام مد میں صرف کرنے کے لئے دی گئی

ہو۔

۳- زکوٰۃ، صدقہ فطر، چہرہ بانی یا دیگر صدقات واجبہ کی رقمیں۔



پہلی صورت میں چونکہ مدرسہ یا ادارہ کے منتظم و مہتمم چندہ دہندگان کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے جب تک وہ رقم جس مد پر صرف کرنے کے لئے چندہ دہندگان نے دی ہے اس مد پر صرف نہ کر دی جائے چندہ دہندگان ہی اس کے مالک رہیں گے۔ وہ جب چاہیں اس رقم کو واپس لے سکتے ہیں اور دوسرے مد میں صرف کر سکتے ہیں۔ یا صرف کرنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مدرسہ یا دینی ادارہ میں جمع شدہ رقوم پر ملکیت کے تمام احکام جاری ہوں گے، اور سال گزرنے پر چند دینے والوں کے ذمہ ان رقوم کی زکوٰۃ بھی واجب الاداء ہوگی۔

دوسری اور تیسری صورت میں مہتمم و منتظم رقم دینے والوں کے بھی وکیل ہوتے ہیں اور مدارس میں پڑھنے والے طلبہ یا دیگر تمام فقراء و مساکین کے بھی وکیل ہوتے ہیں، ایسی صورت میں مذکورہ دونوں طرح کی رقوم کے شرعاً حقدار وہ تمام طلباء و فقراء و مساکین ہوتے ہیں جو متعین نہیں ہیں اور جس مال کا مالک متعین نہ ہو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے گھوڑے یا اسلامی خزانہ بیت المال میں جمع شدہ رقوم زکوٰۃ، صدقات واجبہ، یا صدقات نافلہ، مال فنی، مال غنیمت کا خمس وغیرہ۔ اس طرح عام فقراء و مساجد، مجاہدین، یتامی، رباطیا دیگر ابواب خیر پر وقف شدہ اشیاء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ ان تمام صورتوں میں مال کا مالک متعین نہیں ہے، لہذا مدارس اور دینی اداروں میں جمع شدہ دونوں طرح کی رقوم پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ ان دونوں صورتوں میں مالک متعین ہے۔ علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

”وعلى هذا إذا كان هناك مال لا مالک له واعنى بالمالک

المالک المعین الخ“ (فقد الزکاۃ ۱۳۱/۱۳۲-۱۳۳)

خلاصہ جواب

الف- پہلی صورت میں جب کہ مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں کسی

خاص مد پر صرف کرنے کے لئے دی گئی ہوں، چندہ دہندگان کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر سال گزر گیا اور وہ رقم محفوظ ہے تو چندہ دہندگان اس کی زکوٰۃ ادا کریں گے۔

ب- دوسری اور تیسری صورت میں، جبکہ صدقات واجبہ کی رقم ہو یا ہدا یا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم ہو مالک متعین نہ ہونے کی وجہ سے ان رقم پر کسی کے ذمہ بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

### مال حرام پر زکوٰۃ کا حکم

کسی کے قبضہ میں مال حرام ہونے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف- پورا کا پورا مال حرام اور مال خبیث ہو، حلال اور طیب مال کچھ بھی نہ ہو۔

ب- حرام و حلال دونوں مال ہوں، لیکن ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں، باہم مخلوط نہ ہوں۔

ج- حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہوں کہ ان دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہو۔

چونکہ پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں، جبکہ کل مال حرام ہو یا حلال و حرام دونوں ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں، مال حرام پر قبضہ کرنے والے کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے ”قنیہ“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

”وفی القنیة: الرشوة يجب ردھا ولا تملك“ (۳۰۴/۳)۔

اس لئے ان دونوں صورتوں میں ”مال حرام“ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت شرط ہے۔

”وفی القنیة: لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزکوة؛ لأن الكل واجب

التصدق عليه فلا يفيد إيجاب التصديق ببعضه“ (رد المحتار ۲/۲۵۷)۔

اس مال کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم و متعین ہو تو وہ مال اس کے حوالہ کیا جائے۔ مالک کے حوالہ، خواہ براہ راست ہو اور یہ کہہ کر دیا جائے کہ تمہارا فلاں مال ہے، یا اگر اس طرح حوالہ کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ ہو یا جان و مال کے نقصان یا عزت کی پامالی کا قوی اندیشہ ہو تو بغیر کہے ہوئے بھی کسی بھی ذریعہ سے اس کی ملک تک پہنچا دینا ضروری ہوگا، یا اگر مالک معلوم و متعین نہ ہو تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مالک کی طرف سے اس کا تصدق واجب ہوگا، ”والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال و جب رده، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه“ (مطلب فیمن عدت مال الحرام ۲/۱۳۰)۔

اس مال حرام کو فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے، البتہ رفاہ عام پر بھی صرف کرنے کی گنجائش ہے (اس کی پوری تفصیل تیسرے مجلہ فقہ اسلامی میں مذکور ہے، وہاں پر یہ بحث دیکھی جاسکتی ہے)۔

### مخلوط مال حرام و حلال پر زکوٰۃ کا حکم

تیسری صورت جب کہ مال حرام و حلال باہم اس طرح مخلوط ہو چکے ہوں کہ ان کے درمیان تمیز مشکل ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ چونکہ مال حرام و حلال دونوں کے باہم مخلوط ہو جانے کی وجہ سے اہتلاک پایا گیا، اس لئے وہ مال جس کے قبضہ میں ہے وہ اس کا مالک ہے۔ اس میں وراثت بھی جاری ہوگی اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

جہاں تک ضمان کا تعلق ہے کہ مالک کے آنے پر اس مال کی واپسی ضروری ہے تو اس سلسلہ میں امام صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ضمان اس کے ذمہ میں ہے، عین اسی مال کی واپسی ضروری نہیں ہے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ قبضہ کرنے والا مال حرام کا مالک نہیں ہوا، بلکہ وہ مال اس کے پاس بطور امانت ہے، ان دونوں حضرات کے نزدیک ملکیت کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے نہ وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ میں اور علامہ علاء الدین الحسکمی نے ”در مختار“ میں ”الولوالجیہ“ کے حوالہ سے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے، اس لئے کہ ایسا مال کم ہے جو حرام مال سے خالی ہو، اگر اس طرح کے اموال میں وراثت جاری نہ ہو اور زکوٰۃ واجب قرار نہ دی جائے تو وارثین اور فقراء و مساکین کا حق مارا جائے گا۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی بقول کے مطابق مذکورہ مخلوط مال پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور امام صاحب اور صاحبین کے مابین اختلاف صرف وراثت کے جاری ہونے میں ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ میں۔ امام صاحب کے نزدیک ملکیت کی وجہ سے وراثت جاری ہوگی اور صاحبین کے نزدیک وراثت جاری نہیں ہوگی، لیکن تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ اگر امام صاحب کا یہ قول کہ ملکیت ثابت ہو جائے گی، تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے قول کے مطابق زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ وہ مال مضمون بالذین ہے، اگر مالک کا پتہ ہو تو وہ مال مالک کے حوالہ کیا جائے گا، ورنہ بلا نیت ثواب اس کا تصدق واجب ہوگا اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دیون سے فارغ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ میں یہی اشکال کیا ہے اور امام صاحب کے قول کے مطابق وجوب کی ایک شرط ”المبعضی“ کے حوالہ سے بھی نقل کی ہے:

”زکوٰۃ اس شرط کے ساتھ واجب ہے کہ مالکان نے اس مال کی ادائیگی سے بری کر دیا ہو کیونکہ بری کرنے سے قبل وہ مال مضمون بالذین ہے اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی“۔

علامہ ابن نجیم نے اس قید کو حسن اور اس کو محفوظ کر لیا واجب قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: البحر الرائق ۲/۲۰۵)۔

علامہ شامی نے اس موقع سے جو بحث کی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ علامہ شامی نے فتاویٰ تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

الف۔ مال حرام و حلال کے مخلوط ہونے کی صورت میں اس پر قبضہ کرنے والا شخص اس مال کا مالک تو ہو جائے گا لیکن وہ اس مال کا ضامن ہوگا۔

ب۔ اگر مال مخلوط کے علاوہ بقدر نصاب حلال و طیب مال نہیں ہے، تو مال مخلوط پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ مشغول بالمدین ہے۔

ج۔ اگر مال مخلوط کے علاوہ دوسرا جائز مال بقدر نصاب موجود ہے تو اس مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

البتہ اس صورت میں یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ زکوٰۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی جو بقدر نصاب ہے یا مال مخلوط میں بھی واجب ہوگی۔ اگر مال مخلوط میں زکوٰۃ واجب ہوگی تو پورے مال میں یا صرف جائز و پاک مال میں؟۔

علامہ شامی کی عبارت سے یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی۔ مال مخلوط میں زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوگی (فی الفصل العاشر من التاتارخانیہ عن فتاویٰ الحجیة من ملک اسوال غیر طیبہ الخ ۲/۲۵)۔

لیکن اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مال حرام کی مقدار معلوم و متعین ہو تو حرام مال کی مقدار کے علاوہ جو جائز مال کی مقدار ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور حرام مال کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا اور اگر حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی مقدار معلوم نہیں ہے تو پورے مال مخلوط پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ پورے مال کو

صدقہ کرنا ہوگا۔

مال حرام کا مالک ہونے اور نہ ہونے پر زکوٰۃ کا حکم

اس موقع سے یہ بحث بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو تو کیا حکم ہے اور اگر معلوم و متعین نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے یا کوئی فرق بھی ہے؟

علامہ شامی نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے ان کی بحث سے دو رائیں سامنے آتی ہیں:

۱- اگر مالک معلوم و متعین نہ ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو، اور جب مالک کا پتہ ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اس دین کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ رہا نہیں، علامہ شامی نے اپنے شیخ کی یہی رائے نقل کی ہے۔

۲- مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ کل مال کا تصدق واجب ہوگا۔ علامہ شامی کا رجحان بھی یہی ہے۔

خلاصہ جواب

الف- اگر مال مخلوط میں مال حلال و حرام کے درمیان تمیز مشکل ہو اور مال حرام و حلال کی مقدار بھی معلوم و متعین نہ ہو تو کل مال کا تصدق واجب ہوگا۔ اس طرح کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ب- اگر مال مخلوط کے علاوہ جائز و طیب مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس زائد مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ج- مال مخلوط میں اگر حلال و حرام دونوں کی مقدار معلوم و متعین ہو تو مال مخلوط کے حلال

مال کی مقدار پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور مال حرام کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔

### دین پر زکوٰۃ

دین پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو دائن اور مدیون دونوں پر یا کسی ایک پر؟ اس سلسلہ میں درج ذیل تفصیل ہے:

۱- دائن اور مدیون دونوں پر زکوٰۃ واجب ہو، اس کا قائل کوئی بھی فقیہ نہیں ہے۔

۲- دائن اور مدیون دونوں میں سے کسی پر بھی دین کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کے قائل حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء ہیں، ابن حزم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کا یہی قول نقل کیا ہے، اصحاب ظواہر کا مسلک بھی یہی ہے، امام مالک کا مسلک بجز چند استثنائی صورتوں کے تقریباً یہی ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ دین میں وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرط ”ملک تام“ نہیں پائی جارہی ہے، نہ تو دائن کی ملکیت تام ہے اور نہ ہی مدیون کی، مدیون کے قبضہ و تصرف میں ہے، لیکن اصل ملکیت حاصل نہیں ہے اور دائن کو اصل ملکیت حاصل ہے، لیکن اس کے قبضہ و تصرف میں نہیں ہے، لہذا ملک تام نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔

۳- دور صحابہ سے لے کر ان کے بعد تک کے جمہور فقہاء کے نزدیک مدیون پر تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ دائن پر کچھ تفصیل کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے، جو درج ذیل ہے:

### دین کی قسمیں

یہ حضرات دین کی دو قسمیں کرتے ہیں:

الف- دین غیر موجود دین جس کے ملنے کی امید نہ ہو، مثلاً ایسے نادار اور مفلس پر دین ہو جس کی مال داری کی امید نہ ہو، یا ایسے شخص پر دین ہو جو دین کا انکار کرتا ہو اور کوئی شرعی

شہادت موجود نہ ہو۔

ب- دین موجود دین جس کے ملنے کی امید ہو، مثلاً کسی ایسے صاحب مال پر دین ہو جو اس دین کا قرا کرتا ہو۔

جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

حضرت علیؑ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

”جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اس کی ادائیگی اس پر قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔“

امام شافعیؒ اور امام زہریؒ بھی یہی فرماتے ہیں، اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک ”ملک تام“ سے مراد اس مال کا مکمل مالک ہونا ہے، خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو، اسی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک مال شمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس مال میں ملکیت باقی ہے تو جو حق اللہ ہے، یعنی زکوٰۃ وہ کیسے ساقط ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس طرح کے دین کا حکم ”مال شمار“ کا ہے، مال شمار (وہ مال جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو) کی طرح قبضہ سے قبل اس دین پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس دین کے ملنے کی امید نہیں ہے اور نہ اس سے انتفاع پر قدرت ہے تو اس مال کی وجہ سے غنا کا تحقق نہیں ہوگا اور زکوٰۃ غنی (صاحب نصاب) پر واجب ہے نہ کہ غیر صاحب نصاب پر۔

علامہ یوسف قرضاوی نے ”فقہ الزکوٰۃ“ میں اس مسئلہ پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی ہے اور اخیر میں امام صاحب کی رائے سے مکمل موافقت کا اعلان کیا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:



”ونحن نوافق أبا حنيفة في اعتبار هذا النوع من الدين المجحود أو الميوس منه والمال الضمار بصفة عامة إذا قبضه صاحبه كالمال الجديد المستفاد“ (نقد الزكاة ۱/۱۳۵-۱۳۸)۔

### جس دین کے ملنے کی امید ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی دورائیں ہیں:

۱- امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جس دین کے ملنے کی امید ہو وہ ”دین قوی“ ہے۔ ہر سال اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، لیکن مقتول کی دیت اور بدل کتابت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں:

”بدل کتابت اور مقتول کی دیت کے علاوہ اس طرح کے تمام دیون پر صاحب دین کو ”ملک تام“ حاصل ہے، اس لئے کہ وہ دین کی وصولیابی پر قادر ہے، جب چاہے وہ اس کا بدل وصول کر سکتا ہے، لہذا اس طرح کے تمام دیون پر ”ملک تام“ پائے جانے کی وجہ سے قبضہ سے قبل بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ دیت اور بدل کتابت پر دائن کی ملکیت ناقص ہے، اس لئے ان دونوں میں قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ دیت پر اس لئے ملکیت ناقص ہے کہ اگر تافل کے عاقلہ میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس پر جو دیت ہے وہ ساقط ہو جائیگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیت پر مقتول کے وارثین کی ملکیت ناقص ہے، ورنہ مرنے والے کے ذمہ دین کے ساقط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور ”بدل کتابت“ درحقیقت دین ہی نہیں ہے، اس لئے کہ مکاتب پر جب تک ایک درہم بھی باقی ہو وہ غلام ہے اور غلام پر آقا کا دین واجب نہیں ہوتا

ہے۔ مکاتب جو کچھ بھی کماتا ہے اس پر من و چہ آقا کی ملکیت بھی رہتی ہے اور من و چہ مکاتب کی بھی۔ آقا کی ملکیت تو اس لئے رہتی ہے کہ غلام کا جو بھی مال ہے وہ آقا کا ہے اور مکاتب کی ملکیت اس لئے رہتی ہے کہ مکاتب اپنی کمائی میں آزاد ہے۔“

۲- امام صاحب اس طرح کے دیون کی تین قسمیں کرتے ہیں: دین قوی۔ دین متوسط

اور دین ضعیف۔

### دین قوی

کسی کا قرض کسی کے ذمہ ہو یا تاجر نے سامان تجارت فروخت کیا اور خریدنے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی ہے، اس کو دین قوی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی، لہذا اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ نصاب زکوٰۃ کے برابر یعنی چالیس درہم یا اس کی مالیت کے بقدر رقم وصول ہو جائے، اس سے قبل زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی، لیکن ادائیگی کے وقت گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی حساب کر کے ادا کرنا ہوگی۔

واضح رہے کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ اور ۵ رتی چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ آٹھ رتی برابر ایک ماشہ اور بارہ ماشہ برابر ایک تولہ ہوتا ہے، اس طرح چالیس درہم کا وزن دس تولہ چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوا، گویا کہ ”دین قوی“ میں زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دس تولہ اور چھ ماشہ چاندی یا اس کی قیمت کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

### دین متوسط

وہ قرض جو کسی سامان کی قیمت ہو، لیکن وہ سامان تجارت کی قیمت نہ ہو۔ اس کو ”دین متوسط“ کہتے ہیں۔ اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ سے دو روایتیں

ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا حکم دین قوی کی طرح ہے کہ ”دین قوی“ کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، البتہ اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی، جبکہ دوسورہم یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

امام صاحب سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس میں دین ضعیف کی طرح گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، صاحب بدائع وغیرہ نے اسی دوسرے قول کو صحیح قرار دیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع ۲/۸۲۶-۸۲۷)۔

### دین ضعیف

وقرض جو کسی مال کے عوض مدیون پر عائد نہ ہو خواہ وہ کسی چیز کا معاوضہ ہی نہ ہو، جیسے حصہ میراث یا وصیت کا مال جو کسی پقرض ہو یا کسی چیز کا معاوضہ تو ہو، لیکن مال کا معاوضہ نہ ہو مثلاً مہر، یہ معاوضہ تو ہے، لیکن مال کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ ملک بضعہ کا معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے، اس کو دین ضعیف کہتے ہیں۔ دین ضعیف پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے، قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دیون کی مذکورہ بالا تقسیم اور دین قوی پر زکوٰۃ واجب ہونے اور دین متوسط اور دین ضعیف پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے سلسلہ میں امام صاحب کے دو نقطہ نظر ہیں:

۱- پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ دین درحقیقت مال نہیں ہے بلکہ صاحب دین کو مال کا مالک بنادینے اور مال اس کے حوالہ کر دینے کا ایک واجبی اور ضروری عمل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل مال نہیں ہے، لہذا جب دین مال نہیں تو اصولاً تمام دیون میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہوتی ہے، البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو وہ مال کے حکم میں ہے،

کیونکہ کسی چیز کا بدل اس کے قائم مقام ہوا کرتا ہے گویا کہ خود مال تجارت اس کے قبضہ میں ہے جس پر سال گزر رہا ہے لہذا اصولاً و شرعاً دین قوی میں تو زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے، دوسرے دیون میں نہیں۔

۲- دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دین کو مال مملوک تسلیم کر لیا جائے تب بھی چونکہ یہ قبضہ و تصرف میں نہیں ہے اور نہ ہی اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیونکہ دین ذمہ میں واجب ہے، حقیقتہً مال نہیں ہے اور جو چیز ذمہ میں واجب ہو اس پر قبضہ کا احتمال نہیں رہتا ہے، اس لئے مال مملوک تسلیم کر لینے کی صورت میں بھی تمام دیون پر اصولاً زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو اس کو مال تجارت کے قائم مقام دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پر قبضہ کا احتمال ہے، کیونکہ کسی شے کا بدل اس شے کے قائم مقام ہوتا ہے، لہذا اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔

دیون کی اس تقسیم اور عدم تقسیم کے سلسلہ میں فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے، اسی قول کو عام مشائخ نے اختیار کیا ہے، البتہ صاحبین کا قول اختیار کرنا احوط ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بدائع ۲/۸۲۶-۸۲۸، البحر الرائق ۲/۲۰۷، فتاویٰ خانہ ۱/۲۵۲)۔

### پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ

سرکاری محکمے یا پرائیویٹ کمپنیز یا ادارے اپنے اپنے ملازمین کی تنخواہ سے جو رقم قانوناً اور جبراً ہر ماہ وضع کر کے اس میں اضافہ کے ساتھ ملازمین کے محفوظ کھاتے میں رکھ دیتے ہیں، اور ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو یا ان کے انتقال کے بعد ان کے وارثین کو اضافہ شدہ رقم کے ساتھ پوری رقم واپس کر دیتے ہیں جس کو آج کی اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے، اس پوری رقم کے حقدار وہ ملازمین ہوتے ہیں، یا ان کا واجبی حق ہے جو ان کو یا ان کے وارثین کو ملنا ہے، لہذا اس کی حیثیت ایسے دین کی ہوگی جس کے ملنے کی امید ہو۔

چونکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو وہ دین قوی ہے اور اس پر ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوتی ہے، اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی، علامہ یوسف اقرضاوی نے بھی ”فقہ الزکوٰۃ“ میں یہی بات لکھی ہے، اور ان کی رائے بھی صاحبین کی رائے کے موافق ہے، ”فالمذی أرجحہ أن ملکہ فی ہذہ الحال ملک تام وہی کالمدین المرجو الذی قال فیہ أبو عیبہ: إنه بمنزلة المال الذی فی یدہ، فحينئذ تجب فیہا الزکوٰۃ فی کل حول إذا بلغت نصاباً وتوفرت الشروط الأخری من السلامة من المدین ونحوہ“ (فقہ الزکوٰۃ، ۱/۱۳۹)۔

البتہ امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے مطابق غور کرنا ہوگا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دیون کی کس قسم میں داخل ہے؟ ”دین قوی“ میں یا ”دین متوسط“ میں یا ”دین ضعیف“ میں یا ”مال ضار“ میں اس کا شمار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دین قوی ہو نہیں سکتا ہے، اس لئے کہ دین قوی مال تجارت کا معاوضہ ہوتا ہے یا دیا ہوا قرض ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ان میں سے نہ تو مال تجارت کا معاوضہ ہے اور نہ ہی دیا ہوا قرض، یہ دین متوسط بھی نہیں، اس لئے کہ دین متوسط کسی غیر تجارتی مال کا معاوضہ ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے، خدمت مال ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حسب تصریحات فقہاء ”عبد تجارت“ (وہ غلام جو تجارت کے لئے ہو) کی خدمت تو مال ہے، لیکن کوئی بھی فقیہ آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار نہیں دیتا ہے، اس رقم کو ”مال ضار“ میں بھی شامل نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس دین کے ملنے کی امید ہے اب لامحالہ اس کو ”دین ضعیف“ میں شامل کرنا ہوگا جس پر قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اوپر دیون کی تفصیل میں یہ بات گذر چکی

ہے، امام ابوحنیفہ کا قول راجح اور مفتی بہ ہے اور صاحبین کا قول احوط ہے، لہذا مفتی بہ قول کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ قبضہ کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یا اگر پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس مال موجود ہو جس پر سال گزر رہا ہو تو مال مستفاد کی طرح اس رقم کو بھی سابق نصاب کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔

### وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نماء

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا ”نامی“ ہونا ہے۔ مال غیر نامی میں زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے۔ وجوب زکوٰۃ کے لئے ”مال نامی“ کی شرط کیوں ہے۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

”زکوٰۃ کی مشروعیت اس لئے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس مال و دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہ اپنے مال کا کچھ حصہ نکال کر فقراء و مساکین کو دے جس سے ان کی غمخواری ہوگی، زکوٰۃ میں اتنا مال نہ دے جس سے وہ خود فقیر ہو جائے، اگر ایسے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے جس میں ”نمو“ کی صلاحیت نہ ہو تو زکوٰۃ دینے والا خود ہی فقیر ہو جائے گا جو اسلامی روح کے خلاف ہے“ (فتح القدیر ۲/۱۵۵)۔

### وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ایک بنیادی شرط ”اموال نامیہ“ کا حوائج اصلیہ سے زائد ہونا ہے، جو مال حوائج اصلیہ میں شامل ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ اس مال کے ذریعہ غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ شرعاً غنی پر واجب ہے، نیز حوائج اصلیہ میں شامل اموال پر زکوٰۃ کی ادائیگی خوش دلی سے نہیں ہو سکتی ہے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ادوا زکوة أموالکم طيبة بها أنفسکم“ (اپنے اموال کی زکوٰۃ خوش دلی سے نکالو)۔  
حاجت کے ساتھ اصلیت کی قید کیوں لگائی گئی ہے اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ  
یوسف القرضاوی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

”چونکہ انسان کی حاجتیں بے شمار اور لامحدود ہیں۔ خاص طور سے اس زمانہ میں جب  
کہ قعیش و کمال، حاجت کا، اور حاجت ضرورت کا درجہ اختیار کر چکی ہے، اس لئے ہر وہ چیز جس کی  
خواہش انسان رکھتا ہے اس کو حاجت اصلیت میں شمار کر کے وجوب زکوٰۃ سے خارج نہیں کر سکتے  
ہیں۔ کیونکہ انسان حریص ہے اگر اس کو سونے کی دو واوی مل جائے تو خواہش کرے گا کہ تیسری  
بھی مل جائے“ (ملاحظہ ہو: وإلما قلنا: الحاجة الاصلية، لأن حاجات الإنسان كثيرة الخ) (فقہ  
الکرامۃ ۱/۱۵۲)۔

### حاجت اصلیت کی تعریف

حاجت اصلیت کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف علامہ یوسف القرضاوی نے ان الفاظ  
میں بیان کی ہے:

حاجت اصلیت ہر وہ چیز ہے جو انسان کی بقا کے لئے ضروری اور معین و مددگار ہو، جیسے  
کہ کھانا، کپڑا، پانی یا رہائشی مکان یا جس علم و فن کو حاصل کرنے والا ہے اس علم و فن کی کتابیں۔ یا  
جس پیشہ کو اختیار کرنے والا ہو اس پیشہ کے آلات وغیرہ (حوالہ سابق)۔

فقہاء حنفیہ نے حاجت اصلیت کی نہایت ہی علمی اور دقیق تفسیر بیان کی ہے، چنانچہ علامہ  
شامی ابن ملک کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

”وهي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى  
الخ“ (رد المحتار ۶/۲)۔

یعنی حاجت اصلیہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو بلاکت سے محفوظ رکھے خواہ وہ بلاکت حقیقی ہو یا تقدیری، حقیقی کی مثال نفقہ، رہائشی مکان، آلات حرب، سردی، گرمی سے بچنے کیلئے ضروری کپڑے ہیں اور تقدیری کی مثال ”دین“ ہے، اس لئے کہ مدیون اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ اس کو دے کر قرض کی ادائیگی کر دے تاکہ قید وغیرہ سے محفوظ رہ سکے، کیونکہ قید ایک طرح سے بلاکت ہی ہے، آلات حرب، گھریلو سامان اور سواری کے جانور بھی تقدیری کی مثال ہیں، اسی طرح علم و فن حاصل کرنے والوں کے لئے اس علم و فن کی کتابیں ہیں کیونکہ جہالت بلاکت کے مانند ہے۔

خلاصہ یہ کہ حاجت اصلیہ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کی بقاء اور اس کے وجود کے لئے ضروری ہیں اور جو اس کو بلاکت سے محفوظ رکھ سکیں خواہ حقیقتہً ہو یا تقدیراً۔

### حاجت اصلیہ کا دائرہ

یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ کیا ہے؟ آیا جس شخص کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے اسی کی ضروریات کی چیزیں حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گی یا دوسرے لوگوں کی ضروریات بھی اس کے حوائج اصلیہ کے تحت آئیں گی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ صرف زکوٰۃ دینے والے تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کی ضروریات کے ساتھ بیوی، نابالغ اولاد یا جن بالغ اولاد کا نفقہ اس پر واجب ہے، اسی طرح والدین اور دیگر رشتہ دار جن کا نفقہ واجب ہے ان سب کی ضروریات اس کے حوائج اصلیہ میں شمار ہوں گی ”والمعتبر هنا: الحاجات الأصلية للمكلف بالزكاة ومن يعوله من الزوجة والأولاد، مهما بلغ عددهم، والوالدين والأقارب الذين تلزمه نفقتهم، فإن حاجتهم من حاجته“ (فقہ الزکاۃ)۔



حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور کے اعتبار سے ہوگا

چونکہ زمانہ، حالات اور ماحول کی تبدیلی سے لوگوں کی حاجت و ضرورت میں تبدیلی آتی رہتی ہے، ہر دور میں ہر ایک کی حاجت و ضرورت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک چیز ہے جو عام انسانوں کی حاجت و ضرورت سے خارج ہے، لیکن کسی خاص انسان مثلاً وزیر اعظم کی حاجت و ضرورت میں شامل ہے، اس لئے ”حاجت اصلیہ“ کا تعین ہر دور اور ہر زمانہ کے اعتبار سے ہوگا حتیٰ کہ افراد و اشخاص کے اعتبار سے بھی حاجت اصلیہ کا تعین علیحدہ علیحدہ ہوگا۔ وقت کے صاحبِ رای اور اولیٰ الامر جو لوگ ہوں گے ان پر چھوڑ دیا جائے گا، وہ جس کو ”حاجت اصلیہ“ میں شمار کریں گے اس کا شمار ”حاجت اصلیہ“ میں ہوگا، ہر ایک کو ”حاجت اصلیہ“ کے تعین کا اختیار نہیں ہوگا ”والذی نری علی کل حال أن الحاجات الأصلية للإنسان قد تتغير وتتطور بتغير الأزمان والبيئات والأحوال، والأوى أن تترك لتقدير أهل الرأي واجتهاد أولى الأمر“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۱۵۳)۔

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط ”مال نامی“ کا دین سے محفوظ ہونا بھی ہے، اگر ”مال نامی“ حوائج اصلیہ سے زائد ہے، لیکن دین سے محفوظ نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس دس ہزار روپے حوائج اصلیہ سے زائد ہیں، لیکن وہ دس ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ بقیہ پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے ماہ رمضان المبارک میں صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں خطبہ دیا، اور خطبہ کے دوران یہ ارشاد فرمایا:

”فمن كان له وعليه دين فليحسب ماله بما عليه ثم يترك بقية ماله“

یعنی اگر کسی کے پاس مال ہے اور اس پر دین بھی ہے تو دین کے بقدر مال الگ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ دے، کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ مدیون کا مال زکوٰۃ کے عموم سے خارج ہے اور مال کی جو مقدار دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، نیز جو مال دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہو وہ حوائجِ اصلیہ میں سے ہے، کیونکہ دین کی ادائیگی انسان کی حاجتِ اصلیہ میں شمار ہوتی ہے، اور جس مال کا شمار حوائجِ اصلیہ میں ہو اس کی موجودگی میں غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ غنی پر واجب ہے نہ کہ غیر غنی پر، لہذا دین کے بقدر جو مال ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں ترار پائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

اب یہاں پر تین باتیں قابل ذکر ہیں جن پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے گی:

۱- کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے؟

۲- وہ دین جو مانع وجوب زکوٰۃ ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

۳- کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے؟

پہلی صورت کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے

کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے، اس سلسلہ میں غور کرنے سے فقہاء کرام کے تین اقوال سامنے آتے ہیں:

الف- بعض فقہاء اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اموالِ باطنہ (نقد و اور اموالِ تجارت) میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے، اموالِ ظاہرہ (سامانہ جانور اور کھیت کی پیداوار) میں نہیں۔

ب- جمہور کے نزدیک اموالِ ظاہرہ اور باطنہ دونوں طرح کے اموال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔

ج۔ البتہ امام ابوحنیفہ کا راجح قول یہ ہے کہ کھیت کی جو بھی پیداوار ہو خواہ نلے ہوں یا پھل وغیرہ اس میں دین مانع و جوب زکوٰۃ نہیں ہے، دین کے باوجود زمین کی کل پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا، بلکہ زمین سے جو بھی پیداوار ہوگی اس پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا، اسی وجہ سے اراضی موقوفہ کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے، یہی قول احناف کا مفتی بہ ہے اور اسی پر عمل بھی ہے ”وَأَمَّا عَلَى ظَاهِرِ الرَّوَايَةِ فَلَأَنَّ الْعَشْرَ مَوْنَةَ الْأَرْضِ النَّامِيَةِ كَالْخِرَاجِ فَلَا يُعْتَبَرُ فِيهِ غِنَى الْمَالِكِ، وَلِهَذَا لَا يُعْتَبَرُ فِيهِ أَصْلُ الْمَلِكِ عِنْدَنَا، حَتَّى يُجِبَ فِي الْأَرْضِ الْمَوْقُوفَةِ وَأَرْضِ الْمَكَاتِبِ“ (مثنیٰ، کتاب الزکوٰۃ ۵/۴)۔

دوسری صورت۔ اس دین کی قسمیں جو مانع زکوٰۃ ہے

جو دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں: دین اللہ اور دین العبد۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی مختلف صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ مثلاً زکوٰۃ ”دین اللہ“ ہے، لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا بندہ ہے، اس لئے کہ ”اموال ظاہرہ“ میں تو خود سلطان مطالبہ کرتا ہے اور ”اموال باطنہ“ میں اس کے نائب، یعنی اصحاب اموال، حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی دور تک تو ”اموال ظاہرہ“ اور ”اموال باطنہ“ دونوں کی زکوٰۃ کی وصولیابی حکومت وقت کی جانب سے ہوا کرتی تھی، لیکن جب بعد میں اموال کی کثرت ہوئی اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور تمام اموال کا تتبع دشوار ہوا تو حضرت عثمان غنیؓ نے خود اصحاب اموال کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیدیا، اس طرح اصحاب اموال سلطان کے نائب اور وکیل قرار پائے، اسی وجہ سے اگر اصحاب اموال ”اموال باطنہ“ کی زکوٰۃ از خود ادا نہ کریں تو سلطان ان سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۲۔ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو، مثلاً حج فرض یا نذر یا نماز، روزہ وغیرہ کا کفارہ کہ یہ سب دین اللہ ہیں، لیکن ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی وجہ

سے ان کی ادائیگی پر نہ تو کسی کو مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قید و بند کیا جاسکتا ہے۔

۳- دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو، مثلاً ایسا دین ہے جس کے مالک کا پتہ ہے اس طرح کے دین کا مطالبہ کرنے والا خود مالک یا اس کا نائب موجود ہے۔

۴- دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو، مثلاً کسی کے پاس مال حرام ہے لیکن اس کے مالک کا پتہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مال حرام ”دین العبد“ تو ہے، لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے، اسی طرح ”مہر مؤجل“ کہ اس کی ادائیگی کا وقت موت یا طلاق ہے، بند و ستانی عرف و عادت کے مطابق بیوی موت یا طلاق سے قبل اپنے اس دین کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے، کو یا کہ یہ دین ہی نہیں ہے، اس طرح مہر مؤجل دین العبد تو ہے، لیکن کوئی عہد اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں ہے۔

۵- دین العبد اصالتہ ہو۔ یعنی براہ راست یہ دین اس کے ذمہ عائد ہو۔ کسی دوسرے کے دین کی ذمہ داری نہ لی ہو۔

۶- دین العبد کفالتہ ہو۔ کسی پر دوسرے شخص کا قرض تھا، مقرض شخص اس کی ادائیگی میں نال منول کر رہا تھا، یا اس کی ادائیگی سے قاصر تھا اور قرض دینے والا مسلسل اس سے مطالبہ کر رہا تھا اور پریشان کئے ہو تھا، دوسرے شخص نے اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی جس نے قرض کی ضمانت لی ہے اس پر یہ دین اصالتہ نہیں ہوگا بلکہ کفالتہ ہوگا، قرض دینے والا اپنے قرض کا مطالبہ ضمانت لینے والے سے بھی کر سکتا ہے۔

۷- دین العبد معجل ہو، یعنی وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری ہو، دائن ہر وقت اپنے دین کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۸- دین العبد مؤجل ہو، وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری نہ ہو، دائن وقت سے پہلے اپنے دین کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہ دین کی چند صورتیں ہوں، ان میں سے کون سا دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

### تیسری صورت کون سا دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے؟

تیسری اور اہم بحث یہ ہے کہ مذکورہ بالا دیون میں سے کون سا دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی یہ تصریحات موجود ہے کہ وہ دین مانع و جوب زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ موجود ہے، خواہ وہ دین اللہ ہو یا دین العبد، اصالتاً ہو یا کفالتاً اور مؤجل ہو یا معجل، لہذا زکوٰۃ جو دین اللہ، لیکن مطالبہ کرنے والا بندہ، یعنی سلطان یا اس کا نائب موجود ہے، یا کسی کے دین کی ضمانت لے لی ہو یا طویل الاجل دین ہو یہ مانع و جوب زکوٰۃ ہیں، علامہ علاء الدین الحسینیؒ ”در مختار“ میں لکھتے ہیں:

”فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزكاة وخراج أو للعبد ولو كفالة أو مؤجلاً الخ“ (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۵/۲۳۷)۔

البتہ اگر ایسا دین ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے وہ مانع و جوب زکوٰۃ نہیں ہے، لہذا نذر، کفارات، صدقہ فطر اور جوب حج وغیرہ، یہ دیون مانع و جوب زکوٰۃ نہیں ہوں گے، کیونکہ ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے، ان کا اثر احکام آخرت میں ظاہر ہوگا یعنی ان کی ادائیگی پر ثواب اور ترک پر گناہ ہوگا، احکام دنیا میں ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا، اسی وجہ سے اس طرح کے دیون کی ادائیگی پر نہ توجہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدم ادائیگی پر قید و بند۔ ”بدائع الصنائع“ میں ہے:

”وأما الديون التي لا مطالب لها من جهة العباد كالنذور والكفارات الخ“ (بدائع ۸۲۱/۲)۔

جہاں تک اس مال حرام کا تعلق ہے جس کے مالک کا پتہ نہیں ہے، اصولاً اس کو مانع و وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی عبد نہیں ہے، لیکن یہ بھی مانع و وجوب زکوٰۃ ہے اس کی تفصیل مال حرام کی بحث میں گزر چکی ہے۔

مہر مانع و وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

ایک بحث مہر کی رہ جاتی ہے کہ مہر مانع و وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں:

۱- مطلقاً مہر مانع و وجوب زکوٰۃ ہے خواہ مہر مؤجل ہو یا مؤجل اور اس کی ادائیگی کا ارادہ ہو یا

نہ ہو۔

۲- مہر مؤجل مانع ہے۔ مہر مؤجل نہیں۔

۳- اگر شوہر مہر ادا کرنے کا عزم رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

علامہ شامی نے ہستانی کے حوالہ سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے ” زاد القہستانى عن الجواهر و الصحيح أنه غير مانع“ (شامی ۵/۲۴۵)، جبکہ مولانا اشرف علی تھانوی نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی اگر شوہر مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مہر مؤجل ہے تو یہ مانع و وجوب زکوٰۃ ہے خواہ شوہر فی الفور ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس لئے کہ عورت جس وقت چاہے اپنے مہر مؤجل کا مطالبہ کر سکتی ہے، اس میں طلاق اور موت سے قبل بھی مطالبہ کا حق ہے، اسی طرح اگر مہر مؤجل ہے اور شوہر کافی الحال مہر کی ادائیگی کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو چونکہ ہندوستانی عرف و عادت کے مطابق موت یا طلاق سے قبل عورت کو مہر کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے، اس لئے ایسی صورت میں مہر مؤجل مانع و وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔

دین طویل الاجل بھی مانع زکوٰۃ ہے

چونکہ فقہی تصریحات کے مطابق دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ ہے جیسا کہ اوپر درمختار وغیرہ کے حوالہ سے گذر چکا، اس لئے سرکار کی جانب سے مختلف پروگراموں کے لئے ملنے والا قرض جس کی ادائیگی کے لئے ایک لمبی مدت مقرر ہوتی ہے، مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ پورے قرض کو منہا کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنیز جس کی مالیت مشترک ہے چند افراد کے درمیان، کسی خاص فرد کی ملک نہیں۔ اور مال مشترک کا حکم یہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، بلکہ ہر شریک کے حصہ کا اعتبار کیا جاتا ہے، اسی پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب پہنچ جائے، لہذا مذکورہ صورت میں وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنیز کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فرد کے حصہ کا علیحدہ علیحدہ اعتبار کیا جائے گا، جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب ہو اسی پر زکوٰۃ شرعاً واجب ہوگی۔ مال مشترک پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو ”درمختار“ اور ”شامی“ کی عبارت:

”ولا تجب الزکاة عند ما فی نصاب مشترک من سائمة و مال تجارة

السخ“ (ثانی باب زکاة المال ۴/۳۳)

ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ

اصول یہ ہے کہ سونے اور چاندی یا مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں جو ”ثمن“ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور سائمتہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں جب تک اس کو تجارت کی نیت سے حاصل نہ کیا جائے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اسی وجہ سے فقہاء نے صراحتاً لکھا ہے کہ

ہیرے، جوہرات، مثلاً لعل، یا قوت، زمرد وغیرہ یا جائیداد یا وہ جانور جن کو چارہ کھلایا جاتا ہے یا غلام یا کپڑے یا دیگر سامان وغیرہ میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے، الا یہ کہ ان کو تجارت کی نیت سے حاصل کیا جائے، لہذا مذکورہ صورت میں جو ہیرے اور جوہرات محض اکم نیکس سے بچنے کی غرض سے خرید کر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں، خریدتے وقت ان میں تجارت کی نیت نہیں ہوتی ان پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو خواتین ہیرے اور جوہرات کو محض تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، گرچہ ان ہیروں اور جوہرات کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں روپے کیوں نہ ہوں۔ ”لا زکاة فی اللالی والجواہرو ان ساوت ألفاً اتفاقاً إلا أن تكون للتجارة الخ“ (رد المحتار ۴/۱۳)۔

### اموال تجارت کی زکوٰۃ میں کس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا

مفتی بقول کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت سامان تجارت کی جو قیمت ہوگی اسی قیمت کا اعتبار کیا جائیگا، اور اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، سامان تجارت کی خرید و فروخت جس اعتبار سے ہوتی ہو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی ”وتعتبر القيمة یوم الوجوب وقالوا: یوم الأداء إجماعاً، وهو الأصح، وفي المحيط: يعتبر یوم الأداء بالإجماع وهو الأصح.... فاعتبار یوم الأداء یكون متفقاً علیہ عندہ وعندہما“ (ثا ۲/۲۲)۔

اگر سامان کی خرید و فروخت تھوک بھاؤ سے ہوتی ہو تو تھوک بھاؤ سے اور اگر پھٹکر کے اعتبار سے ہوتی ہو تو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔

”وتعتبر القيمة یوم الوجوب وقالوا یوم الأداء الخ (ثا ۲/۲۲)۔

ارضی کی خرید و فروخت کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ نلہ حاصل کرنے کے لئے



خریدی جائے اور ضرورت پڑنے پر فروخت بھی کی جائے، ایسی صورت میں ارضی کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ اس کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا، اگر زمین عشری ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ارضی کی خرید و فروخت تجارت کی غرض سے ہو، یعنی ارضی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہی ہو اور ضمنی طور پر نفلہ بھی حاصل کیا جائے، ایسی صورت میں جو ارضی سال گزرنے پر مالک کے پاس بچ جائے وہ اموال تجارت میں شمار ہوں گی اور ان ارضی کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان ارضی کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

### شیرزکی زکوٰۃ

شیرز چونکہ تجارتی سرمایہ ہے، اس لئے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ شیرزکی زکوٰۃ کس اعتبار سے ادا کی جائے گی۔ یعنی زکوٰۃ اصل رقم پر واجب ہوگی یا اصل رقم اور منافع دونوں پر یا زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیرزکی جو قیمت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً ایک تجارتی کمپنی قائم ہے جس کی مالیت ایک لاکھ کی ہے جس میں دس آدمی شریک ہیں۔ زید نے بھی دس ہزار روپے جمع کیا اور دس ہزار روپے کے بدلہ کمپنی کا مالک ہو گیا۔ ایک سال کے بعد زید کو ایک ہزار روپے نفع ملے۔ اب کمپنی میں زید کی مالیت گیارہ ہزار روپے ہو گئی اور اسی شیرز کی قیمت بازار میں مثلاً بارہ ہزار روپے ہے۔ تو زکوٰۃ ان تینوں میں سے کس مالیت کے اعتبار سے واجب ہوگی؟۔

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے یعنی گیارہ ہزار روپے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص شیرزکی خرید و فروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ

---

کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیئر کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### بونڈس کی زکوٰۃ

بونڈس جو درحقیقت قرض ہے جس کی ادائیگی کی مدت کمپنی یا حکومت کی جانب سے ۵ سال یا دس سال کی مقرر ہوتی ہے، اس کی حیثیت ”دین قوی“ کی ہے۔ لہذا ”دین قوی“ کی طرح ہر سال اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ کم از کم نصاب زکوٰۃ کے ۵۱ کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

## مشترک سرمایہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی نوعیت

مولانا اعجاز احمد اعظمی ☆

زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے، جو صاحب نصاب مسلمان پر عائد ہوتی ہے، اس کے احکام و مسائل، جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں، کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہے:

”تملیک جزء مال عینہ الشارع من مسلم فقیر غیر ہاشمی ولا  
مولانا محمد رفیع (درمختار ۲/۲۵۷)۔“

(کسی مسلمان فقیر کو جو نہ ہاشمی ہو نہ ہاشمی کے موالی میں سے ہو، مال کے ایک حصہ کا جسے شریعت نے متعین کیا ہے اللہ کے واسطے مالک بنانا)۔  
اور اس کا سبب فرضیت یہ تحریر کیا ہے کہ:

”ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد وعن  
حاجتہ الأصلیة نام ولو تقدیراً“ (حولہ سابق)۔

ایسے نصاب کی ملکیت تامہ جس پر سال پورا ہو چکا ہو اور اس پر کوئی ایسا دین نہ ہو جس کا مطالبہ بندوں کی جانب سے ہو، نیز اس کی حاجت اصلیہ سے فارغ ہو اور وہ نامی ہو، اگرچہ وہ حکماً ہی ہو۔

سوالنامے کے دونوں محور کا جواب اسی سبب کی تفصیل میں مضمرا ہے، اس میں چند باتیں قابل غور ہیں:

۱- ملک تام

۲- نصاب حولی

۳- فراغت عن الدین

۴- فراغت عن الحاجة لأصلية

۵- نماء

یہی پانچ نکتے ہیں جن پر اس مجلس میں غور کرنا ہے۔

سوال: ملک تام سے کیا مراد ہے؟

”إن المراد بالملك التام المملوكة يداً ورقبة“ (درمختار مع رد المحتار ۲/۲۶۹)۔  
ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شئی کا مالک ہو، اور قبضہ بھی اسی کا ہو، اگر قبضہ نہ ہو تو ملکیت ناقص ہے، یا قبضہ ہو، لیکن شئی کا مالک نہ ہو تو یہ بھی ناقص ہے، لیکن بعض اوقات ملکیت ناقصہ، ملک تام کے حکم میں ہوتی ہے، اس کی تفصیل دین کے اقسام کے سلسلے میں آرہی ہے۔

سوالات کے جواب

۱- مال تجارت جس کی قیمت پیشگی او اکر دی گئی ہو، اور مال ابھی وصول نہ ہوا ہو، ”بحر الرائق“ میں ”محیط“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی، لیکن ادائیگی کا وجوب قبضہ کے بعد ہوگا اور سالہائے ماضی کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی (بحر ۲/۲۰۸-۲۰۹)۔  
محیط میں ”اقسام دین کے بیان“ کے تحت مذکور ہے کہ بیع قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہوتا، کیونکہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ نصاب ہو جاتا ہے، اس

لئے کہ وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور اسے عوض پر قبضہ کرنا عین ممکن ہے، پس اس کا قبضہ نصاب پر معتبر مانا جائے گا، کیونکہ شرعاً وہ قبضہ پر قدرت رکھتا ہے، اس بنیاد پر فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہ ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد گذشتہ مدت کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، جیسا کہ دین قوی (دین قوی کی تعریف آگے آرہی ہے) میں ہوتا ہے۔

اور قیمت جو پیشگی ادا کر دی گئی، اس پر بائع کی ملک تام ہوگئی، اس لئے اس کی زکوٰۃ بائع کے ذمہ ہوگی، آگے ایک مسئلہ اجارہ کا آرہا ہے اسی میں اس مسئلہ کی دلیل بھی موجود ہے۔

۲- کرایہ کی مد میں دی گئی رقم جو پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی جس نے رقم وصول کی ہے، کیونکہ وہ اس پر ملکیت تامہ رکھتا ہے۔

امام ابو بکر محمد بن الفضل بخاری نے ذکر کیا ہے کہ اجارہ طویلہ جس کا تعارف اہل بخارا میں ہے، اس میں پیشگی دی ہوئی اجرت کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، کیونکہ جب تک اجارہ فتح نہ ہو، اس رقم کا مالک وہی ہے (بدایع ۶۲)۔

اور جو رقم ڈپوزٹ ہوتی ہے اور بعد میں واپس کر دی جاتی ہے وہ بحکم رہن ہے، (ولو استاجر داراً أو شیئاً و أعطی بالأجرة رهنًا جاز) (ہندیہ ۲۳۵/۵) اگر کسی نے مکان یا کوئی اور چیز کرایہ پر لی اور اجرت کے عوض کوئی چیز بطور رہن کے دی تو جائز ہے، ظاہر یہی ہے کہ ڈپوزٹ رقم جو بعد میں واپسی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے وہ رہن اجرت ہی بنے گی، خود شی مستاجر کے عوض تو رہن رکھنا درست نہیں ہے، کیونکہ وہ امانت ہے، پس وہ اجرت ہی کے عوض تسلیم کیا جائے گا اور رہن کے متعلق تصریح ہے کہ اس میں زکوٰۃ سرے سے واجب ہی نہیں ہوتی، نہ راہن پر نہ مرتہن پر اور نہ مال مرہون میں قبضہ کے بعد اس پر، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ یعنی نہ مرتہن پر، ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے، اور نہ راہن پر، قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور جب راہن اس شی مرہون کو واپس

لے لے گا جب بھی سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ نہیں ادا کرے گا (فتاویٰ ثانی ۲/۲۶۳)۔

۳۔ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

وقف کے جانوروں اور فی سبیل اللہ مہیا کئے ہوئے گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ ان پر کسی کی ملکیت نہیں ہے (حولہ سابق ۲/۲۵۹)۔

۴۔ وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بہ طور حرام آتا ہے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اگر یہ حرام مال علیحدہ ہے، حلال مال کے ساتھ شامل نہیں ہوا ہے تو اس پر اس کی ملکیت نہیں، اگر چہ قبضہ ہے، اس لئے اگر مالک معلوم ہے تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک نامعلوم ہے تو پورے کو قراء و مستحقین میں تقسیم کر دینا واجب ہے، پس اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اور اگر اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس خلط کی وجہ سے وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا، لیکن چونکہ دوسرے کا مال اس کی ملکیت میں غلط طور سے شامل ہو گیا ہے، اس لئے اس مقدار کا وہ ضامن ہوگا، گویا وہ اتنے کا مدیون ہے، اگر بقدر دین اور بہ مقدار ضمان علیحدہ کرنے کے بعد، نصاب کے برابر مال موجود ہے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور بقدر نصاب نہیں بچتا تو چونکہ یہ مدیون ہے اس لئے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”تنبیہ میں ہے کہ اگر ناجائز مال بقدر نصاب ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ وہ کل واجب التصدق ہے (جب کہ مالک معلوم نہ ہو)، اس لئے اس کے کچھ حصے کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں، اور اسی طرح بزاز یہ بھی ہے، اور ”فتاویٰ تارخانیہ“ کی دسویں فصل میں ”فتاویٰ حجۃ“ سے نقل کیا ہے کہ جو حرام مال کا مالک ہو یا اس نے کوئی مال غصب کیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو خلط کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا، لیکن اس کا ضمان دینا ہوگا، اور اگر اس کے سوا اس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر چہ وہ خود

بقدر نصاب ہو، کیونکہ وہ مدیون ہے اور مدیون کا مال ہمارے نزدیک وجوب زکوٰۃ کا سبب نہیں ہوتا“ (شامی ۲/۲۹۱)۔

۵- دین کی زکوٰۃ مدیون پر نہیں واجب ہوتی، ہاں اگر مدیون کے پاس دین سے فاضل نصاب موجود ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، دین کے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص نال منول کر رہا ہے تو ظلم ہے، اس کے خلاف دنیا میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے اور آخرت میں خدا کے حوالے کرنا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے زکاۃ کے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زکوٰۃ کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کے اس جرم کے بدلے عائد کی جائے، یہ تو ایک عبادت ہے جو خلوص دل اور انشراح صدر کے ساتھ ادا کی جانی چاہئے۔

### دین کی اقسام

وصولیاتی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں:

دین قوی، دین متوسط، دین ضعیف۔

دین قوی - وہ دین جو قرض یا مال تجارت کے عوض میں لازم ہوا ہو۔

دین متوسط - وہ دین جو قرض اور مال تجارت کے علاوہ کسی اور مال کے عوض لازم

ہوا ہو، جیسے استعمالی کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف - ایسا دین جو کسی مال کے عوض نہ لازم ہوا ہو، جیسے مہر، وصیت اور بدل خلع

وغیرہ۔

امام ابوحنیفہؒ نے دین کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱- قوی اور وہ بدل قرض اور بدل مال تجارت ہے۔

۲- متوسط وہ ایسے مال کا بدل ہے جو تجارت کے لئے نہ ہو، جیسے استعمال کے

کپڑے، خدمت گزار غلاموں اور رہائشی مکانات کی قیمت۔

۳۔ ضعیف اور وہ ایسی چیز کا بدل ہے جو مال نہ ہو، جیسے مہر، وصیت، بدل خلع، صلح عن دم الحمد، دیت، بدل کتابت اور سعایت (بحر ۲۰۷/۲)۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ جب اس پر سال تمام ہوگا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اس کی ادائیگی کا وجوب اس وقت تک مؤخر ہوگا، جب تک اس میں چالیس درہم کے بقدر دین وصول نہ ہو جائے، جب اتنی رقم مل جائے گی تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی، اور اس کے بعد جتنی وصول ہوتی جائے گی، اسی کے حساب سے چالیسواں حصہ واجب ہوگا۔

اور دین متوسط میں اس وقت تک ادائیگی واجب نہ ہوگی جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ ہو جائے، لیکن جب اتنا وصول ہو جائے گا تو سالہائے گزشتہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دین ضعیف میں زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہ ہوگی، جب تک بقدر نصاب دین وصول ہو کر اس پر سال نہ گزر جائے۔

لہذا دین قوی میں جب سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائیگی چالیس درہم وصول ہونے تک مؤخر رہے گی، جب اتنا وصول ہو جائے گا تو ایک درہم واجب ہوگا اور اسی طرح زائد میں اس کے حساب سے، اور دین متوسط میں اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک نصاب نہ وصول کر لے، اور اس میں سال گزشتہ کا بھی اعتبار ہے، یہی صحیح روایت ہے، اور دین ضعیف میں جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ کر لے، اور اس پر قبضہ کے بعد سال نہ گزر جائے، اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (البحر الرائق ۲۰۷/۲)۔

۶۔ سرکاری محکموں اور بعض پرائیویٹ کمپنیوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکار اس میں اضافہ کرتی ہے جس کو پرائیویٹ فنڈ کہتے ہیں، اس رقم کے دو حصے ہیں، ایک حصہ اصل تنخواہ والا، دوسرا جو اس پر اضافہ ہوا ہے۔



اضافہ کی زکوٰۃ کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس لئے کہ اس پر نہ اس ملازم کی ملکیت وارد ہے اور نہ وہ بہ حکم دین ہے، بہ حکم دین اگر کوئی چیز ہے تو وہ اصل تنخواہ والا حصہ ہے، اس لئے اس اضافی حصہ کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر قبضہ ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے۔

البتہ اصل تنخواہ میں سے وضع شدہ رقم کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ آیا وہ دین ہے؟ اگر ہے تو دین کی تین قسموں میں سے کس میں داخل ہے، امام سرحسی نے ”مبسوط“ میں اجرت کی حیثیت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے فرماتے ہیں:

”اجرت کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ سے تین روایتیں ہیں، ایک روایت میں اس کو مثل مہر کے قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ مال کا بدل نہیں ہے، کیونکہ یہ منفعت کا بدل ہے، اور ایک روایت میں اسے استعمالی کپڑوں کی قیمت کے مانند ٹھہرایا ہے، کیونکہ منافع ایک طرح کے مال ہیں، لیکن وجوب زکوٰۃ کے محل نہیں ہیں، اور اصح یہ ہے کہ گھریا غلام جو برائے تجارت ہو اس کی اجرت اور کرایہ سامان تجارت کی قیمت کی طرح ہے، جب چالیس درہم وصول ہوں گے ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں بدل منفعت کو بدل عین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے“

(مبسوط ۲/۱۹۵-۱۹۶)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرایہ اور اجرت دین میں داخل ہیں، اور اصح روایت کے مطابق جو حکم اس شے کا ہے، جس کی اجرت حاصل ہوئی ہے وہی اجرت کا بھی ہے، اگر مال تجارت کی اجرت حاصل ہوئی تو اس میں اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے جس طرح مال تجارت میں واجب ہوتی، کو یا یہ دین قوی ہے، اور اگر استعمالی سامانوں کی اجرت حاصل ہوئی تو اس کا قیاس انہیں پر ہے۔

حوالہ بالا میں جو دوسری روایت ہے، ”منحة الخالق حاشیہ بحر الرائق“ میں ”محیط“ کے

حوالے سے اسے ظاہر روایت قرار دیا ہے، غرض پہلی روایت کی بنیاد پر اجرت دین ضعیف میں داخل ہے اور دوسری روایت کی روشنی میں وہ دین متوسط میں شامل ہے، اور صحیح روایت کے پیش نظر وہ اصل مال مستاجر کے تابع ہے، لیکن واضح ہو کہ یہ تینوں روایتیں ایسی چیزوں کے کرایہ اور اجرت کے احکام بتاتی ہیں، جو خود مال ہیں، مثلاً مکان، غلام وغیرہ، لیکن یہاں جو اجرت اور تنخواہ زیر بحث ہے وہ کسی مال کی نہیں ہے بلکہ یہ بدل ہے خدمت حرکی، اور حربہ تصریح فقہاء مال نہیں ہے، لہذا اس کی خدمت بھی مال نہیں ہو سکتی، پس یہ تنخواہ غیر مال کی بدل ہے اس لئے یہ دین ضعیف ہے، اور دین ضعیف کا حکم معلوم ہے کہ اس میں قبضہ کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پس پراویڈنٹ فنڈ میں خواہ اصل تنخواہ کی وضع شدہ رقم ہو یا اضافی رقم، زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ بقدر نصاب قبضہ میں آجائے اور اس پر سال گزر جائے، یا اگر اس کے علاوہ نصاب موجود تھا تو یہ رقم اس میں شامل ہو جائے گی اور اصل نصاب پر سال پورا ہونے کے بعد اسی کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ نکل جائے گی۔

### دوسری شرط ”نماء“

نماء کے لغوی معنی بڑھنے کے ہیں، علامہ شامی فرماتے ہیں: نماء بالمد لغت میں بڑھوتری کے معنی میں ہے، اور بغیر مد کے ہمزہ کے ساتھ غلط ہے، کہا جاتا ہے: ”نمسی بنمسی نماءاً، وینمو نمواً، اور ”انماہ اللہ تعالیٰ، کذا فی المغرب“ (۲۶۳/۲)۔

شریعت کی اصطلاح میں بھی نماء کا وہی معنی ہے جو لغت میں ہے، البتہ یہاں اس کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں، اول یہ کہ حقیقتاً اضافہ ہو، جیسے جانوروں میں توالد و تناسل کے ذریعہ بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، اسی طرح تجارت کے واسطے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ اضافہ تقدیراً اور حکماً ہو، جیسے سونا اور چاندی کہ جب یہ اپنی ملک اور قبضہ میں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، کیونکہ اس پر قدرت حاصل ہے، یہ مال نامی تقدیراً ہے، یعنی

ظاہر اہم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا مگر اسے نامی تسلیم کیا گیا ہے۔

”شریعت میں نماء کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور تقدیری، حقیقی وہ نماء ہے جو توالد و تناسل اور تجارتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ نماء پر قدرت ہو، اس طرح کہ مال خود مالک کے قبضہ میں ہو یا اس کے ماتب کے“ (۲۱)۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے مال نامی کا نصاب ہونا شرط ہے، اگر کسی کے پاس نماء کی دونوں قسموں کے اعتبار سے کوئی مال نامی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، مثلاً کسی کے پاس زمینیں بہت ہیں یا مکانات ہیں یا کارخانہ ہے، جس میں مشینیں قیمتی قیمتی ہیں، تو کو یا اس کے پاس مالیت بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز مال نامی نہیں ہے، اس لئے ان کا حساب نصاب زکوٰۃ میں نہ ہوگا۔

تیسری شرط: حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ کے دائرہ میں وہ چیزیں آتی ہیں جن کا تعلق انسان کے جان و مال کی حفاظت اور بچاؤ سے ہے، مثلاً نفقہ، رہائشی مکان، لڑائی کے اوزار، گرمی اور سردی کی ضرورت کے کپڑے، آلات حرفت، گھر کے سامان، سواریاں اور ان کی حفاظت کے گھر، مثلاً اصطلیل، گیراج وغیرہ اور اہل علم کے واسطے کتابیں ”الحاجة الأصلية هي ما يدفع الهلاك من الإنسان تحقيقاً كالفقعة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر والبرد أو تقديراً كالدين وآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها“ (۲۲)۔

(حاجت اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دفع کرتی ہیں، حقیقتاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلات حرب اور گرمی و سردی کے لباس، یا تقدیراً جیسے آلات حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کیلئے کتابیں)۔

حاجتِ اصلیہ میں مزید کچھ اور تفصیلات ہیں جنہیں فقہاء اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً استعمالی کپڑے کتنی تعداد میں ہوں، رہائشی مکان کس مقدار کا ہو، سواری کے جانور کتنے ہوں، کتابوں کے کتنے نسخے ہوں تو حاجتِ اصلیہ میں داخل ہوں گے اور کتنے اس سے زائد ہوں گے، لیکن زکوٰۃ کی بحث میں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں سرے سے حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی قید و وجوب میں مؤثر نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے لئے نصابِ نامی شرط ہے اور نصابِ نامی بہر حال حاجتِ اصلیہ سے فاضل ہوگا، تو یہ قید درحقیقت کسی امتراز کے لئے نہیں ہے، محض بیانِ واقعہ یا اہتمام ذکر کے لئے ہے۔

چنانچہ علامہ شامی نے لکھا ہے:

”فإن الحوائج الأصلية أعم من المدين والنامي أعم منها“ (مآی ۲/۲۶۲)۔  
یعنی حوائجِ اصلیہ دین سے عام ہیں اور نامی ہونا حوائجِ اصلیہ سے عام ہے، تو جب ایک عام قید اور شرط کسی حکم میں لگا دی گئی تو اس کے ضمن میں خاص خود بخود آ گیا، اب اس کے ذکر کی ضرورت امتراز کے لئے نہیں ہوتی، ہاں کسی خصوصیت کے اہتمام کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے، پس ثابت ہو گیا کہ مالِ نامی ہونا بنیادی شرط ہے، حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی شرط صرف اظہار واقعہ کے لئے ہے، چنانچہ علامہ شامی اس کی مثال میں ذکر کرتے ہیں:

”لأنه يخرج منها كتب العلم لغير أهلها وليس من الحوائج الأصلية“  
دیکھئے غیر اہل علم کے پاس کتابیں حوائجِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں، لیکن چونکہ مالِ نامی نہیں ہے، اس لئے ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی شرط: دین سے محفوظ ہونا

دین سے محفوظ ہونے میں فقہاء نے طویل لاءِ اجل اور قصیر لاءِ اجل کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین مطلقاً خواہ وہ طویل لاءِ اجل ہو یا قصیر

لاجل، نصاب میں سے پورا وضع کیا جائے گا، دیکھئے مہر مؤجل کتنی طویل المیعاد ہوتی ہے، مگر فقہاء نے اسے بھی موانع زکوٰۃ میں سے شمار کیا ہے، لیکن ”بدائع الصنائع“ میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مہر مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

”قال بعض مشائخنا: إن المؤجل لا يمنع؛ لأنه غير مطالب به عادة“

(۱۳۱)

(ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ مہر مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ عرفاً اس کا

مطالبہ نہیں ہوتا)۔

اس کی علت ”لأنه غير مطالب به عادة“ پر نظر کی جائے تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سالانہ واجب لاداء قسط کے بقدر ہی ہر سال دین وضع کیا جائے، کیونکہ عادتاً اس سے زائد کا مطالبہ اس سال نہیں ہوتا، نیز یہ کہ امام شافعیؒ کے نزدیک کوئی بھی دین مانع زکوٰۃ نہیں ہوتا، اس خیال سے اگر احتیاطاً صرف قسط واجب الاداء کے بقدر وضع کر کے باقی کی زکوٰۃ ادا کی جائے تو مستحسن معلوم ہوتا ہے۔

### کمپنیوں پر زکوٰۃ

کسی تجارت میں اگر متعدد شرکاء ہوں تو مجموعی سرمایہ پر مجموعی طور سے زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا بلکہ ہر ایک پر علیحدہ زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، جبکہ اس کا حصہ بقدر نصاب ہو، یا کمپنی میں تو بقدر نصاب نہ ہو، لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ مال زکوٰۃ موجود ہو، تو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا (۱۳۱/۲۶۳)۔

بہر حال جب تجارت مشترک ہو تو اس میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شرکت کی حالت میں بھی وہی چیز معتبر ہے جو انفرادی کی حالت میں ہے اور وہ نصاب تام ہے، ہر ایک کے حق میں، پس اگر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بقدر ہے تب تو زکوٰۃ واجب ہوگی،

ورنہ نہیں (ثانی)۔

### ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، اگر بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

موتیوں اور جواہرات میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے کو وہ ہزار کے برابر ہوں، البتہ یہ اگر تجارت کے لئے ہوں تب زکوٰۃ واجب ہوگی ”لا زکوٰۃ فی اللالی و الجواہر و ان ساوت ألفاً اتفاقاً إلا ان تكون للتجارة“ (درمختار مع الثانی ۲/۲۷۳)۔

تاہم جو لوگ اگم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نیت کس زمرے میں آئے گی، احقر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اسے فروخت کر کے پھر اسے روپیہ بنالیں گے اور نفع بھی ہاتھ آئے گا، آج کا ایک لاکھ کا ہیرا عین ممکن ہے کہ دس سال کے بعد ڈیڑھ دو لاکھ کا ہو جائے، اس لئے ایسے ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ جو خواتین محض تزئین و آرائش کے لئے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی میں اصل یہ ہے کہ وہ نصاب کے جز سے ہو، یعنی جس مال کا نصاب ہو، زکوٰۃ اسی میں ادا کی جائے۔ البتہ اذتوں میں شریعت نے ایک خاص حد تک بکریاں متعین کی ہیں، پھر اس کے بعد اونٹ کا وجوب ہوتا ہے، اس کے علاوہ تمام اموال میں قاعدہ یہی ہے کہ

جس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے اسی مال میں سے بقدر زکوٰۃ کے علیحدہ کیا جائے، صاحب ”بدائع“ فرماتے ہیں:

بہر حال اموال تجارت میں واجب کی صفت یہ ہے کہ ان میں عین مال، یعنی نصاب کا چالیسواں حصہ واجب ہے (بدائع الصنائع ۲/۲۱۲)۔

لیکن علماء احناف کے نزدیک بجائے عین مال کے اس کی قیمت کو زکوٰۃ میں دینا درست ہے، امام ابوحنیفہ کے قول میں تو عین یا قیمت ہر دو میں سے ایک واجب ہے اور صاحبین کے بقول اصل واجب تو عین مال سے ہے، مگر اس کے عوض میں قیمت بھی دی جاسکتی ہے، اس قاعدہ کے پیش نظر مسئلہ کا جواب یہ ہوا کہ جب سال پورا ہو تو اس وقت مال کا جو نرخ ہو اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

”بدائع“ میں ہے:

پھر ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحب کے نزدیک دراہم و درانیر اور اموال تجارت میں نصاب کا جز معنوی حیثیت سے واجب ہے، صورتاً نہیں، اور صاحبین کے نزدیک واجب اس کا جزء صورت اور معنی کے لحاظ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ کو معنوی حیثیت سے اس کی جگہ رکھ سکتے ہیں اور صورت کا اعتبار صاحب حق، یعنی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ختم ہو جائے گا، اسی قاعدہ پر جامع صغیر کا یہ مسئلہ مبنی ہے کہ کسی شخص کے پاس دو سو گز تفتیز گیہوں تجارت کے لئے ہے اور اس کی قیمت دو سو درہم ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے اور اس پر سال گذر گیا، تو اگر گیہوں ادا کرنا چاہے تو بغیر اختلاف کے پانچ تفتیز ادا کرے گا، اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو امام شافعی کے برخلاف یہ بھی جائز ہے، لیکن امام صاحب کے نزدیک کمی اور زیادتی ہر صورت میں سال پورا ہونے کے دن کی قیمت ادا کرے گا اور وہ پانچ درہم ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ادا کے دن کی قیمت دے گا (فتاویٰ

تھوک اور پھٹکر تجارت میں زکوٰۃ کے لئے اس کے طریقہ تجارت کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر تھوک کا تاجر ہے تو مال کی قیمت تھوک کے حساب سے لگائی جائے گی ورنہ پھٹکر۔

زمین کی تجارت کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشری یا خراجی زمین بغرض تجارت خریدی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ اس کا فریضہ عشر یا خراج ہے، لیکن امام محمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اس میں کھیتی کرے گا تو عشر یا خراج بھی واجب ہوگا۔

اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور امام محمد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ اگر عشری زمین بغرض تجارت خریدی تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کھیتی کرے گا تو عشر بھی واجب ہوگا (فتاویٰ ہاضمی خاں علی الہند یہ ۱/۲۵۳)۔

اور اگر غیر عشری و خراجی زمین بغرض تجارت لی گئی ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس وقت کے نرخ کے حساب سے ہوگی۔

### شیر ز اور بونڈ ز کی زکوٰۃ

شیر ز پر مال تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہوگی، ان کی مالیت کا تعین نہ ان کی بنیادی قیمت سے ہوگا اور نہ مارکیٹ کے نرخ سے، بلکہ وہ شیر جس مالیت پر مشتمل ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً شیر کا مالک ابتداء سال میں بقدر نصاب ملکیت رکھتا تھا اور پھر درمیان میں بذریعہ تجارت اس میں اضافہ ہوتا رہا، اور سال کے آخر میں جس قدر مالیت فراہم ہوگئی ہے اسی سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مالیت کا پتہ کیسے چلے گا تو موجودہ کاروباری نظام میں اس کے معلوم کرنے کا طریقہ واقعی دشوار ہے، ایسی صورت میں آسان راہ یہ ہے کہ مارکیٹ کا نرخ دیکھ لیا جائے، یقینی طور پر تو نہیں لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ اس کی مالیت سے کچھ زائد یا کم از کم



برابر ہوتا ہوگا تو احتیاطاً اسی نرخ سے زکوٰۃ ادا کی جائے، تاکہ زکوٰۃ میں کمی کا احتمال نہ رہے کہ خدا کے یہاں مواخذہ ہو، اگر کچھ زیادہ دے دی جائے گی تو مستحسن ہے۔

### محور ثانی، نصاب زکوٰۃ

۱- سونے اور چاندی دونوں کا نصاب اصل ہے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے تابع نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ مال تجارت کی قیمت کا تعین دونوں سے ہو سکتا ہے، لیکن اگر ایک سے نصاب پورا ہوتا ہو اور دوسرے سے نہیں تو جس سے نصاب پورا ہوتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا، وجوب زکوٰۃ کے اندر بھی اور اسی پر قیاس کر کے حرمت اخذ زکوٰۃ کے اندر بھی، اس لحاظ سے موجودہ دور میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

پھر سامان تجارت کی تقویم میں اختیار ہے کہ درہم و دینار میں سے جس سے چاہے قیمت لگائے البتہ اگر کسی ایک سے نصاب نہ پورا ہوتا ہو تو وہ متعین ہے جس سے نصاب پورا ہو (فتاویٰ قاضی خان علی ہاشم الہندیہ)۔

### محور ثالث، مصارف زکوٰۃ

۱- سوال میں مذکور پہلی صورت زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے نہ صرف یہ کہ درست ہے بلکہ مستحسن ہے، جسے اہل مدارس کو اختیار کرنا چاہئے، مہتمم مدرسہ ظاہر ہے کہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کی رقم اسی لئے اس کے حوالے کی ہے کہ مدارس میں جو مستحق طلبہ ہیں ان پر خرچ کی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کا نائب بھی ہے، مولانا رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں:

”مہتمم مدرسہ کا قیم، و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا کہ امیر جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شے کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگرچہ وہ مجہول الکفایت والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں

وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے، (تذکرۃ الرشید، ۱۳۲)۔

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ طلبہ کے نائب اور قیّم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم قبضہ کرنے کے بعد آزاد ہے کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ وہ جن کا نائب ہے اور جن کی نیابت میں اس نے زکوٰۃ وصول کی ہے، انہیں پر خرچ کرنا متعین ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو حسب تصریح فقہاء زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، انہیں دوبارہ زکوٰۃ دینی ہوگی اور اس کا وبال مہتمم مدرسہ پر پڑے گا، اگر کوئی مہتمم ایسا کرتا ہے تو اسے زکوٰۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے، یہ تو مدرسہ کے مہتمم کا مسئلہ ہے، جس کو زکوٰۃ دہندگان پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے، خود صاحب امر اور سلطان زکوٰۃ وصول کرتا ہے، اور صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، چنانچہ مبسوط میں ہے:

رہے وہ صدقات اور عشر و خراج اور جزیہ جسے ہمارے زمانہ کے ظالم حکام وصول کرتے ہیں تو اس سے امام محمد علیہ الرحمہ نے کوئی تعرض نہیں کیا اور بہت سے ائمہ بلخ فتویٰ دیتے ہیں کہ دوبارہ ادا کیا جائے فیما بینہ و بین اللہ، جبکہ باغیوں کے متعلق فتویٰ ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحیح مصارف صدقہ پر خرچ نہیں کرتے (مبسوط، ۱۸۰/۲)۔

یہاں ایک اور صورت بتائی گئی ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا خود انہیں ظالم سلاطین کو دینے کی نیت کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، کیونکہ انہوں نے ظلم کر کے اور ناجائز اموال جمع کر کے اپنے اوپر دوسروں کے اتنے حقوق جمع کر لئے ہیں کہ سارا مال دے کر بھی ان حقوق سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زبردست مدیون ہیں اور اس کی وجہ سے انفلاس کے انتہائی مرتبہ پر ہیں، پس انہیں کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، چنانچہ علامہ سرحسی لکھتے ہیں:

اور اصح یہ ہے کہ سب مال والوں سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، جبکہ وہ دیتے وقت

خود نہیں کو زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کر لیں، کیونکہ اتنے اموال مسلمانوں کے غلط طور پر ان کے پاس ہیں اور اتنے تاوان ان پر مسلط ہیں جو ان کے مال سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب لوٹا دیں تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ بچے گا، وہ بمنزلہ فقراء کے ہیں (حوالہ سابق)۔

اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن ”البحر الرائق“ میں اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل درج ہے، وہ لکھتے ہیں:

”وظاهر ما صححه السرخصی أنه لا فرق بین الأموال الظاہرة والباطنة، وصحح الولوالجی عدم الجواز فی الأموال الباطنة، قال: وبه یفتی؛ لأنه لیس للسلطان ولایة الزکوٰۃ فی الأموال الباطنة فلم یصح الأخذ“ (البحر الرائق ۲/۲۲۳)

(امام سرخسی نے جس کی تصحیح کی ہے بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال ظاہرہ و باطنہ میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر ولوالجی نے اموال باطنہ میں عدم جواز کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے، کیونکہ سلطان کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں پس اس کا ایما صحیح نہیں ہے)۔

یہی بات علامہ ابن ہمام نے بھی حاکم شہید کے حوالے سے نقل کی ہے (حوالہ سابق)۔ انہوں نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، بہر حال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا تعلق ہمارے موضوع زیر بحث سے نہیں ہے، لیکن اس سے اشتباہ ہو سکتا تھا، اس لئے وضاحت کر دی گئی ہے۔

غرض جب صاحب امر غلط مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، تو مدرسہ کا مہتمم جو صاحب امر اور صاحب ولایت بھی نہیں، وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے کیسے خرچ کر سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

۲- زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مدارس میں جو سفراء و مصلین مقرر کئے جاتے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ پر عامل نہیں ہیں، قرآن نے جن لوگوں کو العالمین علیہا کہا ہے وہ دوسرے لوگ ہیں،

چنانچہ فقہاء ان کی تعریف کرتے ہیں:

”فہم الذین نصبہم الإمام لجباية الصدقات“ (المحرر الرائق)۔

امام کو جبايت صدقات کا حق اس کی ولایت عامہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور عاملین اس کے کارکن ہوتے ہیں، مدارس کے مہتمم حضرات کو اہل اسلام پر کون سی ولایت عامہ حاصل ہے، صرف کام کی ظاہری مشابہت دیکھ کر حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، مہتمم مدرسہ کا صرف منتظم ہے، زیادہ سے زیادہ جن لوگوں سے اسے چندہ دستیاب ہوتا ہے ان کا وکیل ہے، اس کے کارکنوں پر شریعت کی مخصوص اصطلاحوں کو منطبق کرنا مناسب نہیں ہے۔

پھر ان سفراء کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن دینے کا مسئلہ اور نازک ہے، اول تو یہ عاملین علی الزکوٰۃ نہیں ہیں کہ انہیں زکوٰۃ لینے کا اس بنیاد پر استحقاق ہو، دوسرے کمیشن کے طور پر زکوٰۃ دینا خود محل نظر ہے بلکہ فقہاء کی تصریحات اور تعامل کے خلاف ہے۔

”قال العینی: اتفق العلماء علی أن العامل فی الصدقات هم السعاة المتولون قبض الصدقات، وإنهم لا يستحقون علی قبضها جزءاً معلوماً سبباً أو ثمناً وإنما له أجر عمله علی حسب اجتهاد الإمام“ (اوجز المسائل، ۱۹۶-۲۰)

(امام عینی نے فرمایا کہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عامل فی الصدقات وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی کرنے والے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ وصول کرنے کے عوض میں کسی متعین جز، یعنی آٹھویں یا ساتویں حصے کے مستحق نہ ہوں گے، ان کے لئے عمل کا معاوضہ امام کے اجتہاد کے مطابق ہوگا)۔

عاملین کو جو وظیفہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاتا ہے وہ بقدر کفایت ہوتا ہے، یہی تمام فقہاء لکھتے ہیں، اور اسی پر تعامل رہا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ سے اسے اتنی رقم دے دی جائے کہ اس کے کام کے زمانہ میں اس کے اور اس کے گھر والوں کے اخراجات بہ

سہولت پورے ہو جائیں، اس میں اجرت کی مشابہت تو ضرور ہے مگر اجرت نہیں ہے، اسی لئے اس کو اجرت کے بجائے ”عمالہ“ کا نام دیا جاتا ہے (اوجز المسائلک ۲۱/۸۶)، اس کے برخلاف کمیشن اول سے آخر تک اجرت کا معاملہ ہے، اسی واسطے فقہاء نے اس طرح کے کمیشن کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اجرت بالکل مجہول ہوتی ہے اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اجرت کی جہالت معاملہ کو فاسد کر دیتی ہے، اگر اس اجرت کے فساد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی یہ طور کمیشن کے زکوٰۃ کی رقم دینا کسی طرح جائز نہیں، کیونکہ زکوٰۃ کو کسی مال یا خدمت کے عوض دینا درست نہیں ہے۔

البتہ اگر کمیشن زکوٰۃ یا امول و اجبۃ التملیک کے علاوہ کسی مال سے طے کیا جائے تو اس میں صرف اس کی جہالت کا خدشہ باقی رہے گا، اگر یہ دور ہو جائے تو معاملہ صحیح ہوگا۔  
 زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے، زکوٰۃ صدقہ ہے جو کسی چیز کا عوض نہیں ہوتا، اور تنخواہ اجرت ہے، اجرتوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا خلاف موضوع ہے۔

### خلاصہ جوابات

### پہلی شرط ملک تام

- ۱- مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی نہیں ہوئی ہے، قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بائع کے اوپر، اور مال جو وصول نہیں ہوا ہے اس کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی مشتری کے اوپر، لیکن چالیس درہم کے بقدر وصول ہونے کے بعد ادا کرنا واجب ہوگا۔
- ۲- کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی۔
- ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے وہ رہن کے حکم میں ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر۔
- ۳- جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
- ۴- حرام مال اگر غیر مخلوط اور ممتاز ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور اگر مخلوط وغیر

تمیز ہو گیا ہے تو اس کی مقدار جدا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۵- دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، مگر وجوب ادا چالیس درہم کے بقدر وصولیابی کے بعد ہے، دین متوسط کی زکوٰۃ بھی دائن پر واجب ہے، مگر بقدر نصاب وصول ہونے کے بعد، اور دین ضعیف کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد جب کہ بقدر نصاب ہوسال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

۱- دین کے مانع زکوٰۃ ہونے میں طویل لاءِ جل اور قصیر لاءِ جل کی تفصیل نہیں ہے۔

### کمپنیوں پر زکوٰۃ

۱- ایک تجارت میں کئی افراد شریک ہوں تو انفرادی زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، اجتماعاً نہیں۔  
۲- ہیرے جوہرات بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، سرمایہ محفوظ رکھنے کے لئے اس کو ہیرے جوہرات کی شکل میں رکھ لینے سے اس میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، محض تزئین و آرائش کے لئے ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۳- اموال تجارت میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے نرخ کا تعین وجوب زکوٰۃ کے دن کے لحاظ سے ہوگا۔ عسری اور خراجی زمین جو بغرض تجارت لی گئی ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی زمین یا گھر برائے تجارت لیا گیا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۴- کمپنیوں کے شیئرز تجارتی مال ہیں اس کے لئے ان کی زکوٰۃ واجب ہے اور قیمت کا تعین ان کی مالیت سے کیا جائے گا۔

## محورثانی - نصاب زکوٰۃ

۱- چاندی اور سونا دونوں نصاب میں اصل ہیں، تجارتی اموال میں جس کے حساب سے نصاب پورا ہوتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔

## محورثالث - مصارف زکوٰۃ

۱- طالب علموں کے سلسلہ میں ادائیگی زکوٰۃ کی جو صورت سوالنامہ میں درج ہے وہ مستحسن ہے۔

۲- مہتمم مدرسہ زکوٰۃ و ہندگان کا وکیل ہے اور طلبہ کا نائب اور قیم۔

۳- مدرسہ کے سفراء و عاملین شرعی نہیں ہیں، اس لئے مد زکوٰۃ سے نہ ان کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور نہ کمیشن، ہاں اگر فقر کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہوں تو زکوٰۃ انہیں دی جاسکتی ہے۔

۴- فی سبیل اللہ کے مصداق اصالتاً تو مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، اگر ان کے ذیل میں منقطع الحاج کو داخل کیا جائے تو گنجائش ہے۔

۵- فی سبیل اللہ کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں فقر بنیادی شرط ہے۔

۶- مصارف زکوٰۃ آٹھ اصناف میں منحصر ہیں، ان پر قیاس کر کے دوسروں کو مصارف کے دائرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔

۷- فی سبیل اللہ یا کسی بھی مصرف زکوٰۃ کے دائرے میں ایسی کوئی صورت نہیں آسکتی جس میں زکوٰۃ کی تملیک نہ ہوتی ہو۔

## اسلام میں زکوٰۃ کا مصرف

مفتی شبیر احمد قاسمی ✽

### ملک تام کی تعریف

جس شے میں مالک کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہو جائے اس پر ملک تام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اور اگر صرف ملکیت حاصل ہو جائے، لیکن قبضہ حاصل نہ ہو، جیسا کہ قبضہ سے قبل طے شدہ مہر کی عورت مالک ہو جاتی ہے، لیکن مہر پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت تامہ عورت کو حاصل نہیں ہوتی ہے، اسی طرح اگر مال پر قبضہ تو ہو جائے، لیکن ملکیت درحقیقت اپنی نہ ہو، بلکہ کسی اور کی ہو تو ایسی صورت میں بھی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ قرض دار شخص جو مال کما کر قبضہ کرتا ہے یا بہہ وغیرہ کے توسط سے اس کے قبضہ میں آتا ہے تو ایسی صورت میں قرض دار کے قبضہ میں تو مال آ گیا ہے، لیکن مال کے ساتھ قرض خواہ کا بھی حق لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قرض ادا کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے، لہذا اس مال کا مالک درحقیقت قرض خواہ ہی ہوا کرتا ہے، اس لئے مقروض کے حق میں اس مال میں ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے مقروض پر اس مال کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوتی ہے۔

”ملک تام وہ ہے کہ جس میں قبضہ و ملکیت دونوں جمع ہو جائیں اور بہر حال جب صرف ملکیت حاصل ہو اور قبضہ نہ ہو، جیسا کہ قبل القرض عورت کا مہر، یا قبضہ حاصل ہو، لیکن ملکیت



نہ ہو، جیسا کہ مکاتب اور مدیون کی ملکیت تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے“ (فتاویٰ ہندیہ ۱/۷۲، و مظہر فی الجہود ۱/۱۳۹)۔

### قیمت ادا کر کے قبضہ نہیں کیا اس کی زکوٰۃ

جس مال تجارت کی خریدار نے قیمت ادا کر دی ہے، لیکن ابھی قبضہ نہیں کیا ہے اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں ہے (عزیز الفتاویٰ ۱/۳۳۶)۔

”ولا فیما اشتراہ لتجارة قبل قبضہ“ (الدر المختار ۲/۲۶۳)۔

(جو مال تجارت کی غرض سے خریدا ہے اس پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے)۔

”المبیع قبل القبض لا تجب فیہ الزکوٰۃ“ (حاشیہ چلبی علی ہاشم الہندی ۱/۲۵۷)۔

(قبضہ سے قبل بیع میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے)۔

اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں؟ تو اس میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے، قاضی خان کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ خریدار پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

”کسی شخص کے پاس چہرہ گزارا کرنے والے جانور ہیں، ان کو دوسرے شخص نے نسل بڑھانے اور چہرہ پالنے کی نیت سے خرید کر قبضہ نہیں کیا ہے حتیٰ کہ سال گزر گیا تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ وہ بائع کی ضمانت میں ہے“ (ہاشم الہندی ۱/۲۶۳، خانہ علی ہاشم الہندیہ ۱/۲۶۰)۔

لیکن راجح اور مفتی بقول یہی ہے کہ مال تجارت میں قبضہ کے بعد مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب اور ضروری ہے، اس لئے کہ قبضہ سے قبل جو ملکیت ناقص تھی اس پر قبضہ کے بعد اصحاب حال کے قاعدے سے ملکیت تامہ کا حکم لاکو ہو جاتا ہے۔

”و أما بعده (أى بعد القبض) فيزكيه عما مضى“ (ثای ۲/۲۶۳)۔  
 (مال تجارت میں قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے)۔  
 قبضہ سے قبل مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لیکن قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہے جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے (البحر الرائق ۳/۲۰۳-۲۰۴)۔  
 اور مشتری نے بیع کی جو قیمت بائع کو ادا کر دی ہے اس پر بائع کی ملکیت اور قبضہ دونوں جمع ہو کر ملکیت تامہ کے دائرہ میں داخل ہو چکی ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع پر لازم ہوگا، مشتری پر نہیں ہوگا، چنانچہ ”البحر الرائق“ میں ہے:  
 ”کسی شخص نے بغرض تجارت ایسا غلام خرید جس کی قیمت دو سو درہم ہے اور ثمن ادا کر دیا لیکن قبضہ نہیں کیا حتیٰ کہ سال گذر گیا، اب اگر غلام بائع کے یہاں بلاک ہو جائے تو دو سو درہم کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے، اس لئے کہ وہ اس ثمن کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری پر زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملکیت میں داخل ہو کر سال گذر چکا ہے“ (البحر الرائق ۳/۲۰۳-۲۰۴، خانہ ۲۵۹)۔

### کرایہ کی پیشگی رقم اور پگڑی کی زکوٰۃ

کرایہ دار پیشگی رقم جو یک مشت مالک مکان اور مالک دکان کو ادا کرتا ہے، مالک مکان اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس کی زکوٰۃ بھی مالک مکان ہی پر لازم ہو کرتی ہے کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، اس لئے کہ اس رقم پر کرایہ دار کی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

”إذا عجل الأجرة لا يملك الاسترداد“ (ثای ۶/۱۰)۔

(اگر کرایہ دار پیشگی اجرت اور کرایہ ادا کر دیتا ہے تو مالک مکان اس کا مالک ہو جاتا ہے، لہذا واپسی کا حق نہیں ہوگا)۔

## ڈپوزٹ اور بیع الوفاء کی رقم کی زکوٰۃ

اگر اس طرح مکان یا دکان یا زمین وغیرہ خرید و فروخت کی جائے کہ مشتری جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بائع کے پاس مثل امانت کے ہے اور جب بائع اتنی مشتری کو ادا کر دے گا تو بیع واپس مل جائے، یا عقد کیلئے مدت متعین کی جائے اور مدت پوری ہونے یا عقد فسخ ہونے پر مشتری اور مستاجر کو اپنی دی ہوئی پوری رقم واپس مل جائے، تو ایسے معاملہ کو بیع الوفاء، الامانت اور المرہن وغیرہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، ایسی صورت میں ادا شدہ رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ اس میں حضرات فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابو بکر محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ اگر اجرت رقم کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ صرف بائع پر واجب ہوتی ہے، چنانچہ قاضی خاں لکھتے ہیں:

”شیخ ابو بکر محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ اگر اجرت درہم و دینار کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے، اس لئے کہ قبضہ کی وجہ سے اس کو ملک تام حاصل ہو چکا ہے اور فسخ اجارہ کے وقت عین مقبوض کی واپسی لازم نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ ادا کرنا لازم ہے تو یہ بمنزلہ اس دین کے ہوگا جو بعد حولان حول اس پر لازم ہوا ہے“ (قاضی خان ۱/۲۵۳)۔

اور امام زاہد علی بن محمد بزدوی اور مجد الامم سرخنگی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری دونوں پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، بائع کے اوپر اس لئے لازم ہے کہ اس کو ملک تام حاصل ہے اور مشتری پر اس لئے لازم ہے کہ وہ بمنزلہ شمن رہن ہے، لیکن علامہ ابن عابدین شامی نے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر واجب ہوگی اور اسی کو انہوں نے ”بینغی“ کے لفظ سے راجح قرار دیا ہے۔

حضرت امام الزاہد علی بن محمد ابو دوی اور مجد الامم سرخنگی فرماتے ہیں کہ اس کی زکوٰۃ مستاجر پر بھی لازم ہے، اس لئے کہ لوگ مال اجارہ کو موجر پر قرض اور دین شمار کرتے ہیں اور وہ بیع وفاق جو سمرقند میں معروف و مشہور ہے، اس میں شمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے اور امام بزدوی اور

سرخنگی کے نزدیک مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب ہے (قاضی خان ۱/۲۵۳)۔  
 اور علامہ شامی نے مشتری پر وجوب ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے: "وینبغی لزومها  
 علی المشتري فقط علی القول الذی علیہ العمل الآن من أن بیع الوفاء ینزل  
 منزلة الرهن وعلیه فیكون الثمن دیناً علی البائع" (۲/۲۶۱)  
 (مناسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر لازم ہو، اس قول کے  
 مطابق جس پر اس زمانے میں عمل ہے اور اس لئے کہ بیع الوفاء بمنزلہ رهن قرار دی جاتی ہے، لہذا  
 ثمن بائع کے اوپر بطور قرض لازم ہے)۔

حاصل یہ نکلتا ہے کہ قول راجح کے مطابق زکوٰۃ صرف مشتری پر واجب ہے لیکن احتیاط  
 اسی میں ہے کہ بائع و مشتری دونوں ایسی رقم کی زکوٰۃ ادا کر دیا کریں، بیع الوفاء کے جواز کیلئے  
 حضرت مولانا ظلیل احمد صاحب نے یہ قید لگائی ہے کہ دستاویز کے وقت بیع کو مطلق عن اشترط رکھا  
 جائے، بیع مع اشترط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے (فتاویٰ مظاہر العلوم ۱/۳۹۵)۔

### مدارس، مساجد، قومی ورفاہی فنڈ کے مال پر زکوٰۃ

مدارس اسلامیہ اور مساجد اور دیگر قومی اور رفاہی فنڈ بیت المال وغیرہ شخص حقیقی نہیں  
 ہیں، بلکہ یہ سب اشیاء اشخاص حکمی میں شامل ہیں اور اسلامی شریعت نے زکوٰۃ کا فریضہ شخص حقیقی  
 کی ملکیت تامہ پر واجب کیا ہے، شخص حکمی کی ملکیت پر واجب نہیں کیا ہے، اس لئے مساجد،  
 مدارس، قومی فنڈ اور بیت المال وغیرہ کی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

وقف کے جانور اور رفاہی گھوڑے میں شخص حقیقی کی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ  
 واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے کسی شخص کو مالک بنا دینا شرط ہے اور غیر کی  
 ملکیت میں تملیک متصور نہیں ہے (بدائع ۲/۹۲، ۲/۲۵۹، حاشیہ جلی علی البیہقی ۱/۲۵۳)۔

## رشوت اور مال حرام کی زکوٰۃ

سود اور مال رشوت اور مال حرام کا تابض شرعی طور پر مالک نہیں ہوتا ہے اور وجوب زکوٰۃ کیلئے ملکیت تامہ شرط ہے، اس لئے ایسے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (امداد الفتاویٰ ۱۱۶/۲، کفارہ المذنب ۲۲۲/۲، عزیز الفتاویٰ ۳۶۲)۔

یعنی مال حرام اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ نادار فقیر پر پورا کا پورا صدقہ کر دینا واجب ہے، اس کے بعض حصہ کا صدقہ کرنا کافی نہیں ہے (سٹا ۲۹۱/۲ مطبوعہ کراچی، ہذا زیہ ۸۶/۳)۔

اور ایسے مال کے بارے میں حکم شرعی اور واجب یہی ہے کہ پورا مال اصل مالک کو واپس کر دیا جائے اور اگر اصل مالک تک رسائی ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب نادار فقیر کو صدقہ کر دینا واجب ہے، صاحب ”بذل“ نقل فرماتے ہیں:

”یعنی حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ جو شخص بغیر حق کے کوئی مال حاصل کرے، جیسا کہ بیوع فاسدہ، اجارہ فاسدہ اور معصیت اور ممنوع الاجارہ طاعات سے حاصل کرتا ہے، یا چوری، غصب، خیانت وغیرہ سے حاصل کرتا ہے تو تمام صورتوں میں حاصل شدہ مال اس پر حرام ہے، وہ اس کا مالک نہیں ہوتا، اگر مالک مل جائے تو مالک کو واپس کرنا واجب ہے، ورنہ فقراء کو صدقہ کر دینا واجب ہے“ (بذل الجہود ۱۷۳، نیز دیکھئے سٹا ۲۹۱/۲، مجمع الانہر ۱۹۳، امداد المذنبین ۳۵۵)۔

اور اگر حاصل شدہ مال حرام کے بارے میں تابض اصل مالک کو تاوان وغیرہ دے کر بری ہو جاتا ہے، یا اس سے صلح کر کے اس کو راضی کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ تابض مقبوضہ مال کا مالک ہو جاتا ہے اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہو جاتی ہے۔

”لکن علمت أنه لا تجب زكوتہ إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالح

عنه فيزول عنه خبثه الخ“ (ثانی کراچی ۲/۲۹۱)

(لیکن آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، مگر جب قابض صاحب مال کو عوض وغیرہ دے کر برائت حاصل کرتا ہے یا اس سے صلح کر لیتا ہے تو خبث اور حرمت ختم ہو جاتی ہے)۔

اور اگر مال حرام کو قابض نے اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس کی دو شکلیں ہیں:

۱- قابض کے پاس مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب یا اس سے زائد موجود ہو تو مال حرام کو مستثنیٰ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

۲- قابض کی ملکیت میں مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب موجود نہیں تو ایسی صورت میں قابض پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس کے پاس ملکیت تامہ کے طور پر کوئی نصاب موجود نہیں ہے۔

”وإذا لم تتمیز الأموال المغصوبة عن النصاب مملوكة له لا تجب عليه بقدر المغصوب وتجب في الزائد“ (تقریرات رافعی ۱۳۲ تحت عبارة الثانی ۲/۲۹۱)

(جب مال مغصوب کے مملوک نصاب سے مخلوط ہونے کی وجہ سے امتیاز نہ کر سکے تو مقدار مغصوب کو مستثنیٰ کر کے بقیہ پر زکوٰۃ واجب ہے)۔

دین اور قرض کی زکوٰۃ کس پر لازم ہے

دیون کی زکوٰۃ سے متعلق اہم ترین تین شکلیں علی الترتیب یہاں پر درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- وہ دین جو تجارتی مال یا قرض کے طور پر لازم ہے اور مدیون اس دین کا قرا بھی

کرتا ہے، مدیون ادائیگی پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دائن بہ آسانی اس کو وصول بھی کر سکتا ہے تو ایسے دین کو دین قوی کہا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوا کرتی ہے، اس میں شریعت نے یہ رعایت دی ہے کہ وصول ہونے سے قبل ادا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جب نصاب کے پانچویں حصہ کے بقدر وصول ہو جائے تو اس وصول شدہ کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا جائے گا، اور حضرت امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوتا رہے گا اس کی زکوٰۃ چالیسویں حصہ کے حساب سے نکالنا واجب ہوگا، اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول راجح اور مفتی ہے:

”دین قوی وہ ہے جو مال تجارت وغیرہ کا بدل ہو، جیسا کہ تجارتی کپڑے اور غلام، سامان تجارت کاٹمن یا مال تجارت کی آمدنی وغیرہ اور اس میں وجوب زکوٰۃ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، لیکن سنین ماضیہ کی زکوٰۃ چالیس درہم یعنی نصاب کے پانچویں حصہ کے بقدر قبضہ ہونے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور چالیس درہم وصول ہونے پر ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوگا اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، مقبوض کی مقدار کم ہو یا زیادہ“ (بدائع ۱۰/۲، نیز دیکھئے: رسائل مجمع الاضہار ۱/۱۹۵، کاظمی خان ۱/۲۵۲، البحر الرائق ۲/۲۰۷)۔

۲- اگر مدیون دین کا اقرار کر رہا ہے مگر مفلس ہونے کی وجہ سے قرض ادا کرنے سے قاصر ہے تو ایسی صورت میں اگر حاکم نے اس کو مفلس تصور کر کے اس پر افلاس کا حکم نہیں لگایا ہے تو دین متوسط کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی دائن پر لازم ہوگا اور اگر حاکم نے افلاس کا حکم لگا دیا ہے تو مال ضمار اور دین ضعیف کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ کرنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا حضرت امام محمدؒ کے نزدیک دائن پر واجب

نہ ہوگا، اس لئے کہ قبضہ سے قبل اس کے وصول پر دائن کو قدرت حاصل نہیں ہے۔ اور حضرات شیخین کے نزدیک سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے، اس لئے کہ اس میں جانب فقراء کی رعایت پائی جاتی ہے، اور صاحب درمختار، صاحب تحفہ اور قاضی خان وغیرہ نے حضرت امام محمدؒ کے قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے اور باتانی نے کافی سے نقل کر کے شیخین کے قول کو راجح قرار دیا ہے:

”اگر تک دست اور مفلس پر قرض ہے اور حاکم اس پر مفلس ہونے کا حکم لگا دے یا منکر پر دین ہے جس پر گواہ موجود ہے تو حضرت امام محمدؒ کے نزدیک قبضہ ہونے پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ نہیں ہے، (اور شیخین کے نزدیک واجب ہے) اور اگر قاضی نے مفلس قرار نہیں دیا ہے تو بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے، اور امام محمدؒ کے قول کو ”تحفہ غایۃ البیان خانیہ“ نے صحیح قرار دیا ہے اور باتانی نے کافی سے وجوب کے قول کی تصحیح نقل کی ہے“ (درمختار مع الرد ۲/۲۶۷، نیز دیکھئے مجمع الاضہار ۱/۱۹۳، عنایہ ۱/۶۳، بدائع ۲/۹۷)۔

۳- دین کا اقرار کر رہا ہے اور اس کے پاس ادا کرنے کیلئے مال بھی ہے، لیکن مال منقول کر رہا ہے اور امر و زفر دائیں کئی سال گزر گئے اور دائن کو اس کے حاصل کرنے پر قدرت بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب نہیں ہوگا، صرف مستقبل کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ۲/۳۵)۔

”يقر المديون بالدين وبملائته ولا يقدر الدائن على تخليصه منه، فهو

بمنزلة العدم“ (۲/۳۳۳)

(مدیون دین کا اور مال داری کا اقرار کرتا ہے اور دائن اس کے چھڑانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو وہ بمنزلہ عدم کے ہے اور عدم پر شرعی حکم لاگو ہو کر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوا کرتی ہے)۔



اور اس کی زکوٰۃ مدیون پر اس لئے واجب نہیں ہے کہ وہ اتنی مقدار مال کا درحقیقت مالک نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کیلئے ملک تام شرط ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، حاصل یہ نکلتا ہے کہ ایسا مال وجوب زکوٰۃ کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا، اور دین کی زکوٰۃ مدیون پر کسی حال میں بھی لازم نہیں ہوتی اور دائن پر ہی دین کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

### پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

سرکاری محکموں اور دیگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ فنڈ کے نام کاٹ کر جمع کر لیا جاتا ہے اور اس پر مزید اضافہ کے ساتھ محفوظ کر لیا جاتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اصل رقم اور اضافہ دونوں ملازم کو مل جاتے ہیں تو ایسی صورت میں فنڈ کی زکوٰۃ ملازم پر واجب ہوگی یا نہیں؟

اس میں تفصیل یہ ہے کہ فنڈ کی مذکورہ رقم بالاتفاق دین قوی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی، اور دین ضعیف کے دائرہ میں داخل ہونا زیادہ رائج ہے، اس لئے کہ اس رقم پر کبھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے اضافہ شدہ رقم کو سود کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاتا ہے اور دین ضعیف میں قبضہ کے بعد بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ہے، اور اس رقم کا دین متوسط کے دائرہ میں داخل ہونا امر مترد فیہ ہے، لیکن اگر دین متوسط میں داخل کر لیا جائے تو بھی صحیح، رائج اور مفتی بہ قول کے مطابق اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اس لئے پراویڈنٹ فنڈ پر ماضی کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (امداد الفتاویٰ ۳۹/۲، فتاویٰ محمودیہ ۵۱/۳، کلمات المفتی ۲۳۶/۳، ۲۸۸، جوہر الفقہ ۳۸۵/۱، فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۳، عزیز الفتاویٰ ۳۶۸)۔

نیز ”بدائع الصنائع“ میں علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

”بہر حال دین متوسط وہ ہے جو اس کے ایسے مال سے واجب ہے جو مال تجارت نہیں ہے اور اس کے وجوب کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ سے نقل فرماتے ہیں کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے حتیٰ کہ دو سو درہم قبضہ کر لے اور اس پر قبضہ کے بعد سال گزر جائے اور یہی امام صاحب کی دونوں روایتوں میں سے صحیح اور راجح روایت ہے“ (بدائع ۱۰/۲، مجمع الخلق علی البحر ۲/۲۰۷، ۳۰۶/۲)۔

### نمو کی تعریف اور وجوب زکوٰۃ کی شرط

نمو کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور باب زکوٰۃ میں اس کی دو قسمیں ہیں:

۱- نمو حقیقی: اس کا مطلب یہ ہے کہ مال تو والد و تناسل اور تجارت کی شکل میں بڑھتا رہے۔

۲- نمو تقدیری: اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از خود یا اپنے نائب وغیرہ کے ذریعہ سے مال کو بڑھانے اور ترقی کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ وجوب زکوٰۃ کیلئے مال نامی کا ہونا شرط ہے چاہے نمو حقیقی ہو یا تقدیری۔

اور اصطلاح شرع میں نمو کی دو قسمیں ہیں: نمو حقیقی اور نمو تقدیری: حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ تو والد و تناسل اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ اضافہ ہو، اور تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کو بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو (نمای ۲/۲۶۳، بحر ۲/۲۰۶، تمیز ۱/۲۵۵)۔

### حوائج اصلیہ کی شرط

حوائج اصلیہ میں وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جائے، آج کل کے دور میں بہت سی غیر ضروری اشیاء کو لوگوں نے اپنے لئے یوں ہی ضروری

کر لیا ہے جو درحقیقت حوائجِ اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں۔ حوائجِ اصلیہ کی دو قسمیں ہیں:

۱- حاجتِ اصلیہ حقیقیہ۔ اس کے اندر وہ اشیاء شامل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسان کو بلاکت کا خطرہ ہے، مثلاً ضروری نفقہ اور اخراجات اور رہائشی مکانات اور آلات جنگ اور سردی اور گرمی کے وہ کپڑے جن کی اپنے موسم کے اعتبار سے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

۲- حاجتِ اصلیہ تقدیریہ۔ اس کے اندر وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں، انسان جن کے بارے میں ہر وقت صحیح معنی میں متفکر رہتا ہے، مثلاً واجب الادا قرض، پیشہ اور کارگیری کے اوزار و آلات اور گھر کے ضروری اثاث و سامان اور سواری کے جانور اور علماء کے لئے دینی کتابیں یہ سب حوائجِ اصلیہ میں شامل ہیں، لہذا اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہے، لیکن اس پر قرض بھی ہے یا کسی عالم نے ضروری کتابیں خریدنے کیلئے کچھ رقم الگ کر رکھی ہے یا کسی کارگیر نے اوزار کیلئے کسی کو رقم دے رکھی ہے یا گھر کے سامان اور سواری کیلئے کچھ پیسہ دے رکھا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چنانچہ علامہ شامی نقل کرتے ہیں:

”حوائجِ اصلیہ میں ہر وہ شئی شامل ہوتی ہے جو انسان سے حقیقی معنی میں اسبابِ بلاکت کو دور کرتی ہے، جیسا کہ نفقہ، رہائشی مکان، جنگی آلات، گرمی سردی کے ضروری کپڑے وغیرہ تقدیراً اور باطناً بلاکت کو دور کرتے ہیں، جیسے کہ واجب الادا قرض، جو اس کے قبضہ میں بقدر نصاب مال کے ذریعہ ادا کیا جائے گا اپنے سے قید وغیرہ کو دور کرنے کیلئے اور قید بھی بلاکت کے درجہ میں، صناعت کے اوزار اور گھر کے اثاث اور سواری کے جانور اور علماء کیلئے دینی کتابیں، اس لئے کہ جہالت ان کے نزدیک بلاکت ہے، لہذا ان ضروریات میں خرچ کیلئے جو رقم موجود ہے وہ کالعدم ہوگی، جیسا کہ پیاسے کے حق میں پینے کے پانی کو کالعدم قرار دے کر اس پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے“ (مشائی ۲/۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵)۔

شامی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی حقیقت، علاقہ اور ہر دور کے اعتبار سے حاجاتِ اصلیہ میں تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عوام کیلئے کتب حدیث، کتب فقہ وغیرہ

حاجات اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتیں اور علماء کیلئے حاجات اصلیہ میں سے ہیں، اور ایسی جگہ جہاں جانوروں کو سواری کے کام میں لایا جاتا ہے اور وہاں اسکوٹر، سائیکل وغیرہ چلانے کے لئے کوئی راستہ بھی نہیں ہے، وہاں سواری کے جانور حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گے، اور گاڑی، اسکوٹر وغیرہ شامل نہیں ہوگی، اور شہر والوں کیلئے یہ سب اشیاء حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گی، نیز ایسی جگہ جہاں گاڑی وغیرہ چلانے کا راستہ نہیں ہے وہاں کے لوگ اگر گاڑی وغیرہ رکھ لیں تو وہ اشیاء حوائج اصلیہ سے اگر چہ زائد ہیں، لیکن مال نامی نہ ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

### طویل الاجل قرض اور کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟

وہ تمام دیون جو مدیون پر واجب الادا ہوتے ہیں وہ سب وجوب زکوٰۃ کو مانع ہیں، اس لئے موجودہ دور میں تجارت کفر وغ دینے کے لئے اور فیکٹری اور فرم وغیرہ قائم کرنے کے لئے پبلک حکومت سے جو قرض لیتی ہے اور ادائیگی کے لئے سالانہ یا ماہانہ قسط مقرر کی جاتی ہے اور طویل الاجل قرض کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ مفاد قرض کو منہا کرنے کے بعد ما بقیہ مال اگر نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا، اور اگر نصاب کو نہیں پہنچتا ہے تو زکوٰۃ ہی اس مدیون پر واجب نہ ہوگی۔

نیز اگر ایک کروڑ روپیہ قرض میں لے رکھا ہے اور سالانہ پانچ لاکھ کے حساب سے بیس سال میں ادا کرتا ہے تو سالانہ قسط کے لحاظ سے تجزی نہ ہوگا، بلکہ پورے ایک کروڑ کو منہا کیا کرے گا۔

مال نصاب قرض سے بری ہو اور قرض سے ایسا قرض مراد ہے کہ منجانب العباد اس کا مطالبہ ہو، چاہے وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا، اور مطالبہ فی الحال اور بالفعل ہو یا مدت اور زمانے کے بعد، لہذا دین موصول بھی مانع زکوٰۃ میں شامل ہوگا (مجمع الاضہار، ۱/۱۹۳، نیز دیکھئے: عنایہ ۲/۱۶۰، خانہ ۱/۲۵۵، ہندیہ ۱/۱۷۳، درمختار ۲/۲۶۰، البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

### کمپنی اور مشترک کاروبار کے حصہ داروں کی زکوٰۃ

مشترکہ تجارت، کمپنی اور فیکٹری وغیرہ کے حصہ داروں کی زکوٰۃ مجموعی رقم اور مال پر واجب نہیں ہوتی ہے، بلکہ ہر حصہ دار کی زکوٰۃ اس کے حصہ کے حساب سے واجب ہوگی، لہذا جس کا حصہ نصاب کو پہنچے گا، اس پر اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا اور جس کا حصہ نصاب کو نہیں پہنچتا ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اتنا مال نہیں ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو سکتا ہو، تو ایسے حصہ دار پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہے، اور جس کے پاس شرکت کے حصہ کے علاوہ اتنا مال ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو جاتا ہے اس پر زکوٰۃ تو واجب ہو جاتی ہے، لیکن وہ اپنے حصہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر نکالا کرے گا (مستفاد فتاویٰ دارالعلوم ۶/۶۷)۔

”ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترک من سائمة و مال تجارة، و ان صحت الخلطة (الی قوله) و ان تعدد النصاب تجب إجماعاً و یتراجعان بالحصص فان بلغ نصیب أحدهما نصاباً زکوٰۃ دون الآخر الخ“ (درمختار ۲/۳۰۴)

(ہمارے نزدیک جانوروں اور مال تجارت کے ایک مشترک نصاب پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اگر اس میں اختلاط و اشتراک صحیح ہو چکا ہے اور اگر نصاب متعدد ہو جائے تو ان نصابوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا، اور حصہ دار حضرات اپنے اپنے حصوں کے حساب سے ایک دوسرے سے مراجعت کریں گے، اور اگر کسی کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہے اور کسی کا نہیں پہنچتا ہے تو جس کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسرے پر نہیں)۔

### ہیرے، جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر تجارت کے لئے نہیں ہیں، بلکہ گھر میں برائے زینت یا کسی اور مقصد سے جمع کر رکھا ہے تو ہیرے و جواہرات

پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ ہیرے جوہرات اگرچہ حوائجِ اصلیہ سے زائد ہیں، لیکن وجوبِ زکوٰۃ کے لئے مال نامی ہونا بھی شرط ہے اور ان میں نمو اور بڑھوتری کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، اس لئے ہیرے جوہرات چاہے کتنے ہی مقدار میں ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

”یا قوت، موتی، جوہرات اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ زیور کی شکل میں کیوں نہ ہوں“ (مائگیری ۱/۱۸۰، ۱۸۵ و مثلہ کتاب الفقہ ۱/۶۱۳، ۶۱۴)۔

”یا قوت و جوہرات میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لئے کہ حوائجِ اصلیہ میں دین بھی شامل ہے اور نمو بھی دین کو شامل ہے اور اسی نمو کی قید کی وجہ سے غیر اہل کے لئے کتب و بیہ نصاب کے دائرہ سے خارج ہو جاتی ہیں، حالانکہ وہ غیر اہل کے لئے حوائجِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں“ (۲۶۳/۲)۔

غیر نامی اشیاء اگر بقدر نصاب یا نصاب سے زیادہ حوائجِ اصلیہ سے زائد ہوں تو مالک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اس کی وجہ سے صرف مستحق زکوٰۃ بننے سے محروم ہوتا ہے، اس لئے ہیرے و جوہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”و کذا الکتب، وإن لم تكن لأهلها إذا لم تنو للتجارة غير أن الأهل له أخذ الزكوة وإن ساوت نصاباً وتحتته في الشامي، وأما غير الأهل، فإنهم يحرمون بالكتب من أخذ الزكوة لتعلق الحرمان بملك قدر نصاب غير محتاج إليه وإن لم يكن نامياً“ (دریختا کراچی ۲/۲۶۵)

(ایسے ہی کتابیں اگرچہ اہل کے لئے ہوں اور تجارت کی غرض اس میں نہ ہو) تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن اگر با اہل عالم کی کتابیں ہیں تو اس کیلئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہوگا، کتابیں چاہے کئی نصاب کے بقدر کیوں نہ ہوں، اور غیر اہل ان کتابوں کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہونے سے

محروم ہو جائے گا، جب کہ نامی اور تجارتی نہ ہوں)۔

تجارتی پلاٹ اور اموال تجارت میں کس نرخ پر زکوٰۃ واجب ہے

اموال تجارت میں اداء زکوٰۃ کے لئے چار قسم کے نرخ سامنے آتے ہیں:

۱- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس دن سال ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا ہے، اگر اسی روز زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور پھر بھاؤ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہو جائے تو حولان حول کے دن جو بھاؤ عمومی طور پر پایا جاتا تھا، اسی بھاؤ کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔

”عند اسی حنیفة فی الزیادة والنقصان جميعاً یؤدی قیمتھا یوم

الحول۔ الخ“ (بدائع ۲/۲۳، نیز دیکھئے: ہندیہ ۱/۱۸۰)۔

۲- امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک اگر یوم الحول میں زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو وقت گزر جانے کے بعد جس دن بھی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی اسی دن کی قوت خرید کے نرخ کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، لہذا اگر بھاؤ گھٹ جائے تو گھٹے ہوئے کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور اگر بڑھ جائے تو بڑھے ہوئے کی قیمت لگا کر ادا کرنا لازم ہوگا۔  
علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

”وعندھما فی الفصلین جميعاً یؤدی قیمتھا یوم الأداء فی النقصان

(وقوله) وفي الزیادة الخ“ (بدائع ۲/۲۳)

(اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں یوم الاداء کے نرخ کے اعتبار سے ادا کرے گا، چاہے مال کی قیمت کم ہوگی ہو یا زیادہ)۔

۳- متوقع قیمت فروخت کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کی جائے، لیکن یہ ایک امر متردد فیہ ہے، اور زکوٰۃ مال متعین اور مال یقینی اور ملکیت یقینیہ پر ہی واجب ہوا کرتی ہے، اس لئے

متوقع نرخ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

۴- رأس المال اور لاگت کی قیمت کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے، یہ ایک امر یقینی اور متعین ہے، اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو ملکیت نامہ اور ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ ادا کرنا پایا جاتا ہے، اور شریعت اسلامی نے ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ واجب کی ہے ملکیت متردنیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے، اس وجہ سے اس شکل کا اعتبار کرنے میں اگرچہ عبارات فقہیہ زیادہ ساتھ نہیں دیتی ہیں، لیکن وجوب زکوٰۃ کی اصل علت اور بنیاد پر غور کرنے سے اس شکل کی قوت نظر آتی ہے، اس لئے اس صورت کو اگر جائز کہا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور کتب فقہ کی عبارات اول الذکر دونوں شکلوں کی مؤید ہیں، لہذا حاصل یہ نکلے گا کہ تیسری شکل کے جواز کے دائرہ میں آنے کیلئے کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ہے، اور چوتھی شکل اصل بنیاد و علت کے لحاظ سے جواز کے دائرہ میں آسکتی ہے، اور اول و دوم کے لئے کتب فقہ کی صریح عبارات موجود ہیں، اس لئے ان تینوں شکلوں میں سے کسی بھی ایک کو معمول بہ بنایا جاسکتا ہے، مگر امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق یوم الحول کے نرخ کا اعتبار کرنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے، اور تجارتی پلاٹ پر بھی مذکورہ تفصیل اور احکام لاگو ہوں گے، اگر چھٹکر فرز و خٹگی کا مال ہے تو زکوٰۃ میں چھٹکر بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا، اور تھوک فرز و خٹگی کا مال ہے تو تھوک بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا۔

### کمپنی کے حصص اور شیئرز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص اور شیئرز میں تجارتی سرمایہ ہونے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں لاگت اور منافع دونوں کا اعتبار کر کے دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے، اور اس کے سرمایہ میں سے جتنی مقدار کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں خرچ ہوئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جو مقدار نامی اثاثوں میں لگی ہے اس کی اور اس کے منافع کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کا پورا حصہ نامی اثاثہ میں لگایا گیا ہے تو پورے حصہ رأس المال اور منافع



دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔

اور اگر شیر زما کیٹ میں شیر زکوٰۃ خرید کر فروخت کیا کرتا ہے اور فروخت کی غرض سے حصص خرید کرتا ہے تو کل لاگت مال تجارت کے دائرہ میں آکر کل پر زکوٰۃ واجب ہو کرے گی۔

(مستفاد فتاویٰ رضویہ ۱۴/۲، جدید فقہی مسائل، ۳۲، اسلامی فقہ ۳۱/۱، جوہر الفقہ ۵/۱، امداد الفتاویٰ ۲/۳،

فتاویٰ دارالعلوم ۳/۶)

### بونڈ ز اور حکومت کو بطور قرض دی گئی رقم کی زکوٰۃ

حکومت اور کمپنی وغیرہ کو طے شدہ مدت اور معاہدہ کے تحت جو رقم بطور قرض دی جاتی ہے، وہ شرعی طور پر دین قوی کے حکم میں ہوتی ہے، اس لئے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو کرتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ کی ”البحر الرائق“ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

قرض اور دین کی تین قسمیں ہیں، دین قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے، تو دین قوی کے اندر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، لیکن ادائیگی چالیس درہم کے قبضہ کرنے تک موقوف رہے گی اس کے بعد جتنا وصول ہوتا رہے گا اس کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کیا کرے گا (البحر الرائق ۲/۲۶۰، نیز دیکھئے ۱۵/۵۳)۔

### مصارف زکوٰۃ

#### مد زکوٰۃ سے طلبہ کی فیس ادا کرنا

اگر طلبہ کے اخراجات کا حساب لگا کر فی کس جتنا بنتا ہے اتنے کا چیک بنا کر مہتمم مدرسہ کے قبضہ میں دے دیا کرے اور طلبہ اپنے قیام و طعام کی فیس کے نام سے مدرسہ کو دے دیا کریں تو بلاشبہ جائز و درست ہوگا اور یہ مدارس اسلامیہ میں مال زکوٰۃ کی تملیک کے لئے بہت بہترین اور

مناسب شکل ہے، اور یہ حیلہ تملیک نہیں بلکہ تملیک کے دائرہ میں داخل ہو جائے گی، اور اگر مالدار اور مستطیع طلبہ سے فی کس کے تناسب سے فیس لیا کرے تو یہ بھی جائز اور درست ہے، البتہ وہ غنی طالب علم جس کی ملکیت میں نصاب سے زائد مال اور رقم ہے، رائج قول کے مطابق اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا یا مد زکوٰۃ سے اس پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے (امداد الفتاویٰ ۱۹/۲، احسن الفتاویٰ ۲۳/۲۵۲)۔ اور صاحب ”در مختار“ نے جو غنی طالب علم کے لئے اخذ زکوٰۃ کو جائز لکھا ہے اس کو علامہ شامی نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ یہ اس قول کے خلاف ہے جس میں مطلقاً غنی کے لئے حرمت زکوٰۃ کو ثابت کیا گیا ہے اور جواز کے قول کا کسی نے اعتبار نہیں کیا۔ ”وہذا الفرع مخالف لإطلاقہم الحرمة فی الغنی ولم یعمدہ أحد“ (فتاویٰ ۲۳/۳۲۰)۔

اور اگر فقیر طلبہ کو مہتمم اور ذمہ داران مدرسہ چیک یا رقم پر قبضہ نہ دیں اور خود مہتمم یا دیگر ذمہ دار طلبہ کے نام سے اپنے طور پر جمع کر لیں، پھر اس رقم کو تنخواہ وغیرہ میں صرف کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا، بلکہ اس کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ طلبہ صراحتاً ذمہ دار کو اس کام کے لئے وکیل بنادیں، اس کے بغیر یہ جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔

### اداء زکوٰۃ میں ضم نصاب کا حکم

وجوب زکوٰۃ کے لئے شریعت اسلامی نے مال نامی ہونے اور حوائجِ اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ نصاب مال کے مالک ہونے کی شرط بھی لگائی ہے، تاکہ ”لا ضرر ولا ضرار“ کے قانون کے تحت کسی کو کوئی نقصان نہ ہو، اور اسلامی شریعت نے سونا اور چاندی کو الگ الگ معیار قرار دیا ہے، اسی وجہ سے دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اصلیت کا حکم رکھتے ہیں، اس لئے بلاوجہ کسی ایک کو ہی اصل ٹھہرانا بے اصل اور بے دلیل بات ہوگی، اس لئے جب دونوں الگ الگ اپنے نصاب کو پہنچ جائیں تو الگ الگ زکوٰۃ نکالنا بھی واجب ہوتا ہے اور جب تفاوت

ہو جائے اور ایک کا نصاب مکمل ہو جائے اور دوسرے کا مکمل نہ ہو، یا کسی کا نصاب کامل نہ ہو تو شریعت نے نفع للفقراء کو پیش نظر رکھ کر، ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر دونوں کو ایک کے حکم میں قرار دے کر نصاب مکمل کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے، اور اس طرح ضم نصاب کی صورت میں نفع للفقراء کو ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور نفع للفقراء اسی میں ہے کہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملا کر پورے کو چاندی کا نصاب بنا دیا جائے (مستفاد فتاویٰ محمودیہ ۳۹/۱۱، کفاہت المختص ۳۵/۳، امداد الفتاویٰ ۳۹/۲، فتاویٰ رحیمیہ ۱/۱۵۰)۔

”وجوب الضم إذا لم یکن کل واحد منہما نصاباً، بأن یكون کان أقل فلو کان کل واحد منہما نصاباً تاماً بدون زیادة لا یجب الضم بل ینبغی أن یؤدی من کل واحد زکوٰتہ فلو ضم حتی یؤدی کلہ من المذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا ولكن یجب أن یكون التقویم بما هو أنفع للفقراء“ (فتاویٰ ۳۰۳/۲، نیز دیکھئے ہندیہ ۱/۱۷۹)

(سونا چاندی میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ضم کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ دونوں کا نصاب مکمل نہ ہو اور نصاب سے کم ہو، اور اگر دونوں کا نصاب مکمل ہو تو انضمام واجب نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ دونوں کی زکوٰۃ الگ الگ ادا کی جائے، اور اگر ملا کر ادا کی جائے تو بھی حنفیہ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے لیکن واجب یہی ہے کہ اس کے ساتھ قیمت لگائی جائے جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ اور نفع ہو)۔

### مہتمم معطیان و طلبہ دونوں کا وکیل

مہتمم اور سفراء بالاتفاق معطیان کے وکیل ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ طلبہ اور فقراء کے بھی وکیل ہیں یا نہیں؟ تو اگر ان کو صرف زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے وکیل تسلیم کیا جائے اور طلبہ

کی طرف سے وکیل تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک کہ یہ لوگ مصرف میں خرچ نہ کر دیں، لہذا اگر مصرف میں خرچ ہونے سے قبل ضائع ہو جائے تو معطیان کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، ان پر فریضہ زکوٰۃ بدستور باقی رہے گا، لیکن مہتمم اور سفراء کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے تو ان پر تاوان بھی لا کونہ ہوگا، نیز ایسی صورت میں جن مدارس میں زکوٰۃ کی رقم کئی کئی سال خرچ ہوئے بغیر جمع رہتی ہے اگر بقدر نصاب ہو تو ان کے معطیان پر ان سالوں کی زکوٰۃ بھی دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اس کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے (معارف القرآن ۱۶۹/۳)، لیکن ہمارے اکثر اکابر اہل فتاویٰ نے مہتمم کو طلبہ اور معطیان دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحت لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اسی وقت ادا ہو جاتی ہے، لہذا اگر طلبہ پر خرچ ہونے سے قبل بلا تعدی ہلاک ہو جائے تو معطیان کے وکیل اور امین ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی تاوان لازم نہ ہوگا، اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے معطیان کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، نیز کئی سال سے جمع شدہ رقم پر کسی شخص حقیقی کی ملکیت تامہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا لازم نہ ہوگا، حضرت اقدس مولانا ظلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطیان کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطیان زکوٰۃ واپس لے سکتے ہیں (مستفاد فتاویٰ خلیلیہ ۳۱۹/۱)۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا ہے جس میں طلبہ کی طرف سے وکیل ہونے کا انکار کیا ہے، رجوع کا تفصیلی فتویٰ جوہر الفقہ (۳۸۷/۴) میں امین اشرف معتمد درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء دارالعلوم کراچی کے ۱۴/ ذیقعدہ ۱۳۹۵ کے سوال کے جواب کے

تحت موجود ہے (جو امر الفہم ۱۲/۳۸۷)۔

اور یہی مضمون حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم نے فتاویٰ محمودیہ میں نقل فرمایا ہے کہ جب طلبہ نے مہتمم کے اہتمام اور انتظام اور قوائین کو تسلیم کر کے داخلہ لیا ہے تو کو کیا کہہ دیا کہ آپ ہمارے وکیل ہیں (فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۲۱۸)۔

قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے بھی صاف اور واضح الفاظ میں مہتمم کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے، اور قوی دلائل کی روشنی میں اگرچہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل نہیں قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے معارف القرآن میں نقل فرمایا ہے، لیکن اساطین امت اور اہل فتاویٰ کی ایک بڑی جماعت نے مہتمم اور اہل مدرسہ کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے، اس لئے یہی مسلم ہوگا کہ مہتمم، اہل مدرسہ اور سفراء معظیان اور طلبہ دونوں کی طرف سے وکیل ہوں گے، نیز حضرت تھانویؒ نے بھی ”امداد الفتاویٰ“ ترتیب قدیم مطبوعہ رحیمیہ، میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے مذکورہ جواب کو تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ اور تردد بالکل رفع ہو جاتا ہے (امداد الفتاویٰ ۱۲/۲۱۸، ترتیب قدیم)۔

### مد زکوٰۃ سے سفراء کی تنخواہ

مدارس کے سفراء کو ”العاملین علیہا“ کے حکم میں قرار دے کر ان کو زکوٰۃ کی رقم میں سے بلا تملیک تنخواہ دینا درست ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ہمارے اکابر میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے سفراء کو عاملین علیہا کے دائرہ میں داخل کر کے مد زکوٰۃ سے ان کو تنخواہ دینا جائز قرار دیا ہے، اور صرف یہ قید لگائی ہے کہ ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زائد تنخواہ دینا جائز نہیں ہے (کتابت الہندی ۱۲/۲۶۹)، نیز مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے امداد المقتضیین میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہی نقل فرمایا ہے کہ سفراء کو عاملین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مد زکوٰۃ سے تنخواہ دی

جاسکتی ہے (امداد المغتیبین ۱/۲۵۸)، لیکن مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں کافی تفصیل کے ساتھ مختلف دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مدارس کے سفراء کو عالمین کے حکم میں قرار نہیں دیا جاسکتا اور ان کو عالمین کے حکم میں قرار دے کر مد زکوٰۃ میں سے ان کو زکوٰۃ دینا ہرگز درست نہیں ہو سکتا (معارف القرآن ۱/۱۶۹، سورہ توبہ آیت ۷)۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے جواز کے فتویٰ سے رجوع کر کے عدم جواز کو اختیار فرمایا ہے، اس لئے کہ یہ مسلم بات ہے کہ ”امداد المغتیبین“ بہت پہلے مرتب ہو گئی تھی اور اس کے طویل عرصہ کے بعد ”معارف القرآن“ تحریر فرمائی ہے، تو اب اکابر میں سے جواز کے قائل صرف حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ تبارہ جاتے ہیں اور قریب قریب تمام اکابر اہل فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ سفراء کو امیر کی طرف سے مقرر کردہ عالمین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مد زکوٰۃ سے بلا تملیک تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہے، ”امداد الفتاویٰ، عزیز الفتاویٰ، احسن الفتاویٰ“ وغیرہ سب میں عدم جواز کا حکم موجود ہے۔ (امداد الفتاویٰ دیوبند، عزیز الفتاویٰ کراچی ۱/۳۶۰، احسن الفتاویٰ ۳/۲۸۳) اور یہی حکم دفتر محاسبی اور دیگر دفتر کے ملازمین کی تنخواہ کے بارے میں بھی ہوگا، خصوصاً جب وہ لوگ حساب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہوں، لہذا مد زکوٰۃ سے سفراء و دیگر ملازمین کو تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ با تنخواہ ملازمین کو حسن کارکردگی پر کچھ شرح فی صد متعین کر کے بطور انعام ملے شدہ تنخواہ سے زائد دینا شرعاً جائز اور درست ہے، لیکن یہ انعام وصول شدہ چندہ کے نصف سے کم ہی ہونا شرط ہے اور نصف سے کم میں کوئی بھی مقدار حسب صواب متعین کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نصف یا اس سے زائد امیر کی طرف سے مقرر کردہ عالمین کو دینا بھی جائز نہیں ہے، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔ لکن لا یزاد علی نصف ما یقبضہ (لیکن وصول شدہ کے نصف سے زائد ان کو نہ دیا جائے) (مٹا ۳/۳۳۰)۔

اور اس کا لحاظ بھی لازم ہوگا کہ سفراء زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے تملیک سے قبل اس میں سے خرچ نہ کریں، بلکہ خرچ کے لئے مدرسہ سے علی الحساب پیشگی رقم لے لیا کریں اور زکوٰۃ کی وصول شدہ رقم اولاً مکمل مدرسہ میں جمع کر دیں، پھر مدرسہ کے فنڈ سے اپنا حساب صاف کر لیا کریں ورنہ تملیک فقراء کی شرط فوت ہو جاتی ہے اور تملیک اداء زکوٰۃ کے لئے شرط ہے، ”ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً“ (دریختار ۲/ ۳۲۳)۔

اور اگر با تنخواہ ملازم نہیں ہے تو اجارہ فاسدہ ہونے کی وجہ سے شرح فیصد متعین کر کے صرف کمیشن کو اجرت قرار دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ صحت اجارہ کے لئے اجرت کا تعین شرط ہے، لہذا کمیشن کا یہ طریقہ جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا (فتاویٰ محمودیہ ۱/ ۵۲۲، فتاویٰ اجیاء علوم ۱/ ۳۳۳)۔

”وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتین الخ“ (دریختار ۵/ ۵)۔

(صحت اجارہ کے لئے منفعت اور اجرت دونوں کا متعین ہونا شرط ہے)۔

”ولا یصح حتی تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة“

(ہدایہ ۳/ ۲۷۷)۔

(اجارہ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک منفعت اور اجرت متعین نہ ہو)۔

لہذا حاصل یہ نکلتا ہے کہ با تنخواہ کے لئے بطور انعام کمیشن متعین کرنا جائز ہے اور

بے تنخواہ کے لئے جائز نہیں ہے۔

## مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ

مفتی انور علی اعظمی ☆

۱۔ جس مال کی قیمت ادا کر دی گئی، لیکن اب تک مال کی وصولی نہیں ہوئی اگر بیع مکمل ہے تو قبضہ سے پہلے بیع کو اپنے اموال زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا اور مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ ”محیط سرحسی“ کے حوالہ سے ”عالمگیری“ میں مذکور ہے:

”و أما المبیع قبل القبض لا یكون نصابا والصحيح أنه یكون نصابا“

(محیط سرحسی)۔

اور جو رقم بطور ثمن کے بائع کے حوالہ کی جا چکی ہے اس کا ذمہ دار بائع ہے، اگر بائع صاحب نصاب ہے تو زکوٰۃ میں اس قیمت کو بھی شامل کرے گا، کیونکہ یہاں ملکیت اور قبضہ دونوں موجود ہیں۔

### ڈپازٹ کی زکوٰۃ کا حکم

۲۔ کرایہ کے مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ فتح ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں، نہ کرایہ دار پر نہ مالک مکان پر، بلکہ وہ مثل رہن کے ہے، رہن کی زکوٰۃ راہن پر بھی نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا قبضہ نہیں اور مرہن پر بھی نہیں، اس لئے کہ اس کی



ملک نہیں، تو ملک تام جو ملکیت اور قبضہ کے مجموعہ سے وجود میں آتی ہے وہ کسی کے حق میں موجود نہیں، لہذا زکوٰۃ کا وجوب کسی پر نہیں ہوگا:

”ولا فی مرہون بعد قبضہ اى لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد و إذا استرده الراهن لا يزكى عن السنين الماضية“ (رد المحتار)۔

### مال حرام کی زکوٰۃ کا حکم

۳- سود اور رشوت کے مال کا صدقہ بلا نیت ثواب واجب ہے، یا اگر مالک اصلی کی طرف لوٹنا ممکن ہو تو لوٹنا واجب ہے، اس لئے ایسے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے جس کو ثواب ہی کے لئے کیا جاتا ہے۔

حرام مال حلال میں اس طرح گھل مل گیا کہ تمییز مشکل ہے تو اس صورت میں بھی صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ملکیت ثابت نہیں ہوگی، لہذا زکوٰۃ کا وجوب اور وراثت اصل مالک ہی سے متعلق ہوں گے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں حق غیر کا تعلق ذمہ سے ہوگا، عین مال سے نہیں، لہذا عین مال حرام کا امتیاز ختم ہو جانے کی بناء پر پورے مال پر ملکیت ثابت ہوگی، اور زکوٰۃ کا تعلق مجموعہ مال سے ہوگا، علامہ حسکفی فرماتے ہیں: امام صاحب کا قول قول ارفق اور قابل عمل ہے (نہج ۲۷۳)۔

### دین کی زکوٰۃ کا حکم

۴- دین کی زکوٰۃ دائن ہی پر واجب ہوگی، مدیون پر نہیں، مدیون غنی ہونے کے باوجود ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے تو وہ اپنے اس رویہ میں بلاشبہ ظالم ہے، لیکن وہ اس مال کا مالک نہیں، البتہ اس کے ذریعہ جو نفع کما رہا ہے اس کی زکوٰۃ کا وہ ذمہ دار ہے۔

موجودہ تجارتی نظام میں بڑے چھوٹے ہر طرح کے تاجر کے مال کا بڑا حصہ ادھار رہتا ہے، بغیر ادھار کے اس زمانہ میں تجارت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، تجارتی قرض جو فقہاء کے یہاں دین قوی کہا جاتا ہے، اس کی زکوٰۃ واجب ہے، امام ابوحنیفہؒ قبضہ کے بعد وجوب کے قائل ہیں، لیکن اگر متوقع قرض کی زکوٰۃ مالک اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ادا کر دے تو اس میں اس کے لئے بڑی آسانی ہے، اس لئے کہ تجارتی قرض وقفہ وقفہ سے وصول ہوتا ہے تو ہر قرض کے وصول ہونے پر زکوٰۃ کا اہتمام کرنا ایک مشکل امر ہے، ابو عبید نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور جابر بن عبد اللہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، اور تابعین میں سے حضرت جابر بن زیدؓ، مجاہدؓ اور ابراہیمؓ بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن اگر قرض دو چار سال تک وصول نہیں ہوتا اور مالک اس کی زکوٰۃ بھی نہیں دیتا، تو ملنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دے گا، البتہ ایسا قرض جس کے ملنے کی امید نہیں ہے جو شریعت کی اصطلاح میں مال ضمار کہلاتا ہے، اس کی زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ احناف کے نزدیک واجب نہیں۔

### پراویڈنٹ فنڈ

۵- پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی، مدت ملازمت میں جب کہ وہ رقم ہماری ملک نام میں نہیں آئی اور اس کا کوئی فائدہ بھی ہم کو نہیں پہنچ رہا ہے تو اس کی مالی ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد نہیں ہوتیں، اور اس رقم کی مثال مال ضمار کی ہی ہے، اس مال پر صاحب مال کی ملکیت ہے، لیکن اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، اس کی زکوٰۃ بھی وصولیابی اور حوالان حول کے بعد واجب ہوتی ہے۔

”ولا زکوٰۃ فی مال الضمار وهو ما لا يمكن الانتفاع به مع بقاء

الملک“ (در مختار)۔

## مانع زکوٰۃ دیون

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ جس دین کا مطالبہ من جہتہ العباد ہو وہ دین مانع زکوٰۃ ہے، مہر مؤجل جس کا عورت کی طرف سے سالہا سال تک کوئی مطالبہ نہیں ہوتا وہ مانع زکوٰۃ نہیں، اس کے علاوہ دوسرے دیون مؤجلہ کے مانع زکوٰۃ ہونے میں مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ تینوں مسلک کے جمہور فقہاء کی آراء اثبات میں ہیں، ”معراج“ میں ”شرح طحاوی“ کے حوالہ سے منقول ہے کہ مانع نہیں، امام ابوحنیفہ سے یہی مروی ہے، لیکن صدر الشہید کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صاحب مذہب سے کوئی روایت نہیں، اور مانع ہونے اور نہ ہونے میں دونوں کی وجہ موجود ہے، اور ہستانی نے جوہر کے حوالہ سے یہ اضافہ کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دین مؤجل مانع نہیں ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والے طویل المیعاد قرضے بھی مؤجل ہوتے ہیں، لہذا ایک سال میں جو واجب الادا غنط ہے وہ زکوٰۃ سے مانع ہوگی، اور بقیہ اقساط مانع نہیں ہوں گی۔

## کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی حالت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ شرکاء کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، ایک مسلمان کے حصہ میں کمپنی کا جو حصہ آتا ہے اس میں جو مقدار محل زکوٰۃ ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ دی جائے گی، اور اگر وہ تنہا نصاب کو نہیں پہنچتی، لیکن حصہ دار کے پاس الگ سے نصاب موجود ہے، یعنی دونوں مل کر نصاب کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ زکوٰۃ دے گا، ورنہ نہیں، الغرض کمپنی کی زکوٰۃ اس کے ڈائریکٹرز کو نہیں نکالنی چاہئے، بلکہ حصہ داروں کو اپنا حصہ معلوم کر کے خود اس ذمہ داری پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔

## ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

۱- خواتین جو آرائش کے لئے ہیرے اور جواہرات استعمال کرتی ہیں، اس کی ان پر

زکوٰۃ نہیں، اسی طرح مرد جو سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جوہرات خرید کر اکٹھا کرتے ہیں، اصولی طور پر ان پر بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کہا جاسکتا، لیکن ظاہر ہے اگر ان کا مقصد زکوٰۃ سے فزا حاصل کرنا ہوگا تو چاہے وہ اس حیلے سے اپنی زکوٰۃ بچالیں، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ سے نہیں بچ سکتے۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

۲- اموال تجارت کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ مال جو تاجر خود تیار کرتا ہے اور دوسرے وہ مال جو بازار سے خریدتا ہے، دونوں قسموں پر حوالان حول کے بعد تھوک قیمت فروخت کو بنیاد بنا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی، یعنی زکوٰۃ نکالنے میں اصل سرمایہ اور اضافہ شدہ مال، یعنی منافع دونوں ہی جوڑے جائیں گے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے، اگرچہ ابن عباسؓ کی رائے میں فروخت ہونے تک انتظار کریں گے اور بقول ابن رشد قیمت خرید کا اعتبار ہوگا، لیکن جمہور فقہاء کی رائے وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

### شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ شیرز کمپنی میں لگے ہوئے مال تجارت کا ہی حصہ ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اموال تجارت زکوٰۃ کا محل ہیں اسی طرح سے یہ شیرز بھی ہیں، ان پر بھی زکوٰۃ نصاب کی مقدار کو پہنچنے کے بعد یا اپنے دوسرے مالوں کے ساتھ مل کر واجب ہوگی، شیرز کی مالیت کا تعین ادائیگی کے وقت بازار کے بھاؤ سے ہوگا، کیونکہ زکوٰۃ اصل مالیت اور منافع کے مجموعہ پر جاری ہوتی ہے۔

بونڈس ایک قرض ہے جو مالک اپنے اختیار سے کسی کمپنی یا حکومت کو دیتا ہے اور یہ قرض دین قوی کے قبیل سے ہے، اس لئے تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی، چاہے تو اپنے

دیگر مالوں کے ساتھ سال بسال دیتے رہیں یا بونڈ کیش کرانے کے بعد سبھی گزرے ہوئے سالوں کی اکٹھا دیں۔

### نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں وہی نصاب بنیادی طور پر تسلیم کیا جائے گا جو نفع لائفقراء ہو، بعض عرب علماء جیسے علامہ یوسف قرضاوی اور احمد عبد العزیز المرینی اور دوسرے لوگوں نے بھی اس زمانہ میں سونے کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، استاذ ابو زہرہ، خلاف ابو حسن کی بھی یہی رائے ہے، علامہ یوسف قرضاوی تحریر فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں سونے کے نصاب کو اصل بنانا معنی براعتدال و بلحاظ حجت قوی ہے، ہم دیگر اموال کے نصاب کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں تو موجودہ زمانہ میں ہمیں سونے کا نصاب ہی ان سے قریب تر دکھائی دیتا ہے، آج پانچ اونٹ یا چالیس بکریوں کی قیمت تقریباً چار سو دینار ہوتی ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ نقدی کی اتنی قلیل مقدار پر زکوٰۃ عائد کی جائے کہ جس سے ایک بکری بھی نہ خریدی جاسکے، علامہ یوسف قرضاوی کی اس دلیل سے ہمیں اتفاق نہیں، ممکن ہے کہ ان کے ملک میں چاندی بہت سستی ہو، اور بکریاں بہت مہنگی ہوں، لیکن ہمارے ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی تقریباً پانچ ہزار روپے کے برابر ہوتی ہے اور اتنے روپے میں دس بکریاں باسانی خریدی جاسکتی ہیں، لہذا چاندی کو نصاب زکوٰۃ کے مسئلہ میں اصل حیثیت آج بھی حاصل ہوگی۔

### مصارف زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے جو شکل سوال میں تحریر کی گئی ہے وہ بہت موزوں اور واقعہ کے مطابق ہے، صحیح ہے کہ مدرسہ کا سارا خرچ طلبہ کی خدمت یا متعلقہ انتظامی امور پر ہوتا ہے، اس لئے سارے خرچ کو ماہانہ طلبہ پر تقسیم کر دیا جائے اور نقد رقم یا چیک دے کر ان سے وصول کر لیا

جائے، بہتر یہ ہے کہ وصول کی جانے والی رقم سے دس بیس روپے زیادہ ہی ان کو دیا جائے تاکہ مکمل طور پر تملیک کا اظہار ہو اور حیلہ تملیک سے نجات مل جائے، اگر یہ طریقہ اہل مدارس قبول کر لیں تو زکوٰۃ دینے والوں اور مدارس کے ارباب اہتمام دونوں ہی صحیح طور پر اپنے اپنے فرائض منصبی سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

۲- مدارس کے سفراء ”و العاملین علیہا“ کا مصداق نہیں ہیں، عامل وہ شخص ہے جس کو مسلمانوں کا امیر وصول صدقات کے کام پر مامور کرے، بھلا اس کی احکام القرآن میں اس بات کی صراحت ہے: ”هو الذي يبعثه الامام لأخذ الصدقات“۔

مدارس کے ذمہ داران امام نہیں اور ان کے متعین کئے گئے ہر شخص کو جبری وصولی کا اختیار بھی نہیں ہے، سفراء کے تقرر اور تنخواہ کے سلسلہ میں دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ کہ دیگر کام کرنے والے ملازمین کی طرح باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پر سفیر رکھے جائیں، یا اگر مدرسین ہی سے چھٹیوں میں کام لیا جا رہا ہے تو ان کی تنخواہ ڈبل کر دی جائے، پھر ادارہ اپنے حالات کے اعتبار سے ان میں نشاٹ پیدا کرنے کے لئے مزید سہولیات، مثلاً سفر خرچ اور انعام و اکرام وغیرہ دے سکتا ہے، اس سے آمدنی میں اضافہ کا امکان بھی بحال رہے گا، اور بے اعتدالی نہیں پیدا ہوگی، کمیشن پر چندہ کرنے سے ہمیں اتفاق نہیں، اگرچہ موجودہ حالات میں ہر کاروبار میں کمیشن کا رواج ہو جانے کی وجہ سے اسے جہالت اجرت مفصی ولی النزاع کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، لیکن اس صورت میں دوسری بے اعتدالیاں پیدا ہونے کے شدید امکانات ہیں، کمیشن کی اجازت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اس کی تحدید کا پیدا ہوگا، بعض چھوٹے مدارس میں پچاس فیصد کمیشن طے کر کے سفراء کا کام نہیں چلے گا اور بڑے مدارس میں پانچ فیصد کمیشن پا کر ایک مہینہ میں پچاس ہزار کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

## زکوٰۃ سے متعلق بحث و تحقیق

مولانا محمد صدر الحسن ندوی ☆

”فتاویٰ عالمگیری“ میں ملک تام کی تعریف یوں کی گئی ہے:

”الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك واليد، وأما إذا دون اليد كالصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والديون لا تجب فيه الزكاة“ (فتاویٰ عالمگیری ۱۶۹/۱)۔

”شامی“ میں ہے:

”المراد بالتام المملوك رقبته ويدا“ (رد المحتار ۲۳۵/۲)۔

اس لئے وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہ ہوئی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”لا تجب (الزكاة) على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض“ (البحر الرائق ۲۰۳/۲)۔

اور اسی طرح وہ قیمت جو ادا کی جا چکی اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب نہ ہوگی، کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس نقد کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی۔

جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مال فتنے اور مال غنیمت کے خمس پر قیاس کرتے ہوئے، کیونکہ یہ مصالِح مسلمین پر صرف کرنے کے لئے ہے۔

وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بہ طور حرام آئے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر یہ اموال حرام، حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے ہوں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو تو اگر اموال حلال بقدر نصاب نہیں ہیں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

”من ملک أموالاً غیر طیبۃ أو غصب أموالاً و خلطها ملکها بالخلط یصیر ضامناً، وإن لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیہ، وإن بلغت نصاباً، لأنه مدیون و مال المدیون لا ینعقد سبباً لوجوب الزکوٰۃ عندنا“ (رد المحتار ۲/۲۹۱)۔

مال حرام میں زکوٰۃ واجب ہونے یا نہ ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کے پاس دوسرا مال حلال بھی ہے اور اس میں حرام کو ملا دیا تو امام صاحب کے نزدیک زکوٰۃ اس پر لازم ہے اور اگر دوسرا مال حلال بہ قدر نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ اس پر لازم نہیں، بلکہ وہ کل مال واجب التصدق ہے (فتاویٰ دارالعلوم ۶/۸۶)۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں:

”وجملة القول فی الدیون أنها علی ثلاث مراتب فی قول أبی حنیفة، دین قوی و دین ضعیف و دین متوسط“ (بدائع الصنائع ۲/۱۰۷)۔

دین قوی وہ مال ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذریعہ عائد ہو۔  
دین متوسط وہ ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا، چاندی نہ ہو، بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو۔

دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بہ ذمہ مدیون عائد نہ ہو، جیسے دین مہر



وغیرہ۔

دین قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی ہر سال زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوگا جب چالیس درہم یا اس کی مقدار وصول ہو جائے، اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا، اگر ہر سال ادا نہیں کیا تو تمام گزرے ہوئے سالوں کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد جب تک سال بھر نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

دین متوسط کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ دین قوی کے حکم میں ہے اور اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی، مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہ ہوگا، بلکہ پورا نصاب، یعنی دو سو درہم جب وصول ہو اس وقت ادا کرنا لازم ہوگا، مگر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط بھی دین ضعیف کی طرح ہے، صاحب ”بدائع“ نے اسی آخری روایت کو ترجیح دی ہے۔

اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں نال منول کرے اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو، پھر بھی اس مدیون پر زکوٰۃ واجب قرار دینا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے، ہاں دین کی ادائیگی کے لئے اسے شرعی دائرہ میں مجبور کیا جاسکتا ہے۔

وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ ایک وہ قرض جس کی ادائیگی کی توقع ہو، اس قرض کی زکوٰۃ ہر سال ادا کی جائے

گی۔

ایک وہ قرض جس کی ادائیگی کی توقع نہ ہو یا امید ضعیف ہو، اس سلسلہ میں قول مختار یہ ہے کہ قبل وصول اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور وصول کے بعد جس قدر وصول ہوگا بعد حوالان حول

آئندہ صرف اسی قدر زکوٰۃ واجب ہوگی (امداد الفتاویٰ ۲/۳۳)۔

سرکاری محکموں اور مختلف پرائیویٹ کمپنیز میں جو لوگ ملازم ہوتے ہیں ان کی ماہانہ یافت میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکار یا کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے، بعض اوقات ہر دو قسم کی مذکورہ رقم پر سرکار یا کمپنی انٹرسٹ کے نام سے بھی کچھ اضافہ جوڑ کر آخر میں وہ مجموعی رقم ملازمین کو ادا کرتی ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پرائیڈنٹ فنڈ کہلاتی ہے، پرائیڈنٹ فنڈ کی مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔

زکوٰۃ کے وجوب یا عدم وجوب کے مسئلہ کو ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیون کی تین قسموں کے دائرہ میں رکھ کر اگر دیکھا جائے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس پر دین قوی کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ کسی مال تجارت کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے، جیسا کہ (المحررات ۲/۲۰۸) کی عبارت ”ان لم تکنوا للتجارة لا تجب“ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلام اور مکان تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت واجرت کو مال تجارت نہیں قرار دے سکتے، اب دو احتمال باقی ہیں کہ اگر خدمت کو مال قرار دیا جائے تو دین متوسط میں داخل ہے، اور اگر مال ہی قرار دیا تو دین ضعیف میں داخل ہے، امام اعظمؒ سے دونوں احتمالوں پر دونوں روایتیں منقول ہیں۔ منحة الخالق علی البحر (۲/۲۰۸) کی تصریح کے مطابق ان دونوں میں ظاہر الروایت یہ ہے کہ مال قرار دے کر دین متوسط میں شامل کیا جائے، اور ایک تیسری روایت مبسوط میں ہے (۲/۱۹۵-۱۹۶) کہ اس کی تفصیل کی جائے کہ اجرت و خدمت نہ علی الاطلاق مال ہے نہ غیر مال، بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا دار تجارت کی اجرت ہے تو مال ہے ورنہ غیر مال، پہلی صورت دین قوی میں داخل ہے اور دوسری دین ضعیف میں اور

اسی تیسری روایت کو مبسوط نے اصح قرار دیا ہے، ان ساری روایات کا اختلاف عبد کی خدمت کے بارے میں ہے جو من و چہ مال ہے، حر کی خدمت فقہاء کی تصریح کے مطابق مال نہیں ہے۔ تو بات یہاں تک منہج ہوئی کہ دین قوی میں داخل ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ عبد تجارت کی خدمت یا تجارت کا معاوضہ یا ارض تجارت کا معاوضہ ہو، اس کے علاوہ کوئی دین اجرت دین قوی میں بہ اتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں ہے، اس لئے اس میں دینی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دین متوسط ہو یا دین ضعیف، اور دین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لئے مشکل ہے کہ امام اعظم سے جو روایتیں ہیں وہ دونوں عبد کی خدمت کے متعلق ہیں، حر کی خدمت کا وہاں ذکر نہیں ہے، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ دین دین ضعیف میں داخل ہے اور اگر اس کو دین متوسط بھی فرض کر لیا جائے تب بھی اصح روایت کے مطابق امام اعظم کے نزدیک دین متوسط بھی دین ضعیف ہی کے حکم میں ہے۔

اس لئے پراویڈنٹ فنڈ پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، امام اعظم کے مسلک کے مطابق۔ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک دیون میں قوی، متوسط اور ضعیف کی کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے دین پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

### حاجت اصلیہ

”قنوی عالمگیری“ میں حاجت اصلیہ کے ضمن میں حسب ذیل صراحت ملتی ہے:

”منها فراغ المال عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخلمة وسلاح الاستعمال، وكننا طعام أهله وما يتحمل به من الأواني إذا لم يكن من الذهب والفضة، وكننا الجواهر واللؤلؤ والياقوت والبلخس والزمرد ونحوها إذا لم يكن

للتجارة و كذا كتب العلم“ (فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۷۷)۔

اس مسئلہ کو مہر مؤجل اور مہر معجل پر قیاس کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں کتب فتاویٰ میں دو روایتیں ملتی ہیں۔

پہلی روایت ”فتاویٰ عالمگیری“ میں ملتی ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ مہر چاہے مؤجل ہو یا معجل دونوں مانع زکوٰۃ ہیں۔

”و كذلك المهر يمنع مؤجلا كان أو معجلا لأنه مطالب به كذا في محيط السرخسي وهو الصحيح على ظاهر المذهب“ (فتاویٰ عالمگیری)۔  
اس پر قیاس کرتے ہوئے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا، صرف سالانہ واجب الاداء قسطوں کو وضع کرنا کافی نہ ہوگا۔

لیکن علامہ شامی نے معجل اور مؤجل میں فرق کیا ہے اور مہر مؤجل کو صحیح مذہب کے مطابق غیر مانع زکوٰۃ بتایا ہے۔

”و الصحيح أنه غير مانع“ (رد المحتار ۶/۶۲-۷)۔

اسی طرح ”فتاویٰ عالمگیری“ میں ایسے شخص کے بارے میں جس پر بیوی کا مہر مؤجل ہو اور اس کی نیت ادا کرنے کی نہ ہو، ایسے مہر کو غیر مانع زکوٰۃ بتایا ہے۔

”قال مشانخنا رحمهم الله تعالى في رجل عليه مهر مؤجل لامرأته وهو لا يريد أدائه لا يجعل مانعا من الزكوة لعدم المطالبة في العادة“ (فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۷۰)۔

درج بالا مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے سالانہ واجب الاداء قسط کو وضع کر کے بقیہ اموال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

اس طرح ہمارے سامنے دو صورتیں آئیں، ایک صورت میں پوری رقم قرض کی منہا کی جائے گی اور دوسری صورت میں صرف سالانہ واجب الاداء، میرے نزدیک علامہ شامی کی مہر

مؤجل میں صحیح مذہب کی تصریح کے مطابق صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

چونکہ کمپنی کا مجموعی اثاثہ کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ متعدد شرکاء کا وہ مجموعی اثاثہ ہوتا ہے، اس لئے وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر فرد کا انفرادی حصہ اگر مع منافع بقدر نصاب پہنچتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

### ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

جولوگ اگم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لئے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں وہ اگرچہ حوائجِ صلیہ میں داخل نہیں ہیں، پھر بھی ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

جن چیزوں میں زکوٰۃ نہیں ہے ان کی تفصیلات ذکر کرتے ہوئے ”فتاویٰ عالمگیری“ میں یہ صراحت کی گئی ہے: ”لا تجب الزکوٰۃ فی الجواہر واللؤلؤ والیاقوت والبلخس والزمرد ونحوها إذا لم تكن للتجارة“ (فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۷۰)۔  
(تزئین و آرائش کے لئے جو جواہرات عورتیں استعمال کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ نہیں ہے)۔

”و أما الیواقیت واللآلی والجواہر فلا زکوٰۃ فیہا وإن كانت حللیا إلا أن تكون للتجارة“ (فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۷۷)۔

”لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواہر وإن ساوت ألفا إلا أن تكون للتجارة“ (الدر المختار ۲/۱۸)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت، جو تاجر کے قبضہ میں ہے، کی ادائیگی زکوٰۃ کے دن اس وقت بازار کا جو نرخ اشیاء کی فروخت کے لئے ہو، اس کے حساب سے قیمت لگائی جائے گی، یہ جمہور فقہاء کا قول ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے قیمت خرید پر زکوٰۃ ادا کرنے کو راجح قرار دیا ہے۔ راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ بازار کے نرخ کا اعتبار کیا جائے اور بازار کے نرخ میں تھوک مال کے نرخ کا اعتبار کیا جائے گا۔

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگا۔

### شیراز اور بونڈ زکی زکوٰۃ

شیراز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ادائیگی زکوٰۃ کے وقت مارکیٹ میں شیراز کی جو قیمت ہوگی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ بونڈ اپنی قانونی حیثیت کے پیش نظر دین مر جو (ایسا دین جس کی وصولیابی کی توقع ہو) کی طرح ہے، لہذا جمہور فقہاء کے قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ ہر سال ادا کی جائے گی۔

### نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں کون سا نصاب اصل تسلیم کیا جائے۔ فقہ الزکوٰۃ میں علامہ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ اکثر علماء معاصرین کی رائے یہ ہے کہ چاندی کو اصل نصاب تسلیم کر لیا جائے، ایک تو اس بنا پر کہ چاندی کے نصاب پر اجماع ہے اور صحیح اور مشہور احادیث سے چاندی کا نصاب ثابت ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ چاندی کا

نصاب غریبوں کے مفاد میں ہے، کیونکہ چاندی کے نصاب کا اعتبار کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی بڑی تعداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لیکن دیگر علماء سونے کے نصاب کو معیار بنانے کے قائل ہیں کیونکہ دو روہی کے بعد چاندی کی قیمت میں کافی تبدیلی ہوتی، بہ خلاف اس کے کہ سونے کی قیمت ہر زمانہ میں برقرار رہی۔ استاذ ابو زہرہ خلاف اور حسن کی یہی رائے ہے (ھد الزکوٰۃ ۱۵۳)۔

علامہ یوسف القرضاوی نے سونے کے نصاب کو معیار بنانے کی رائے کو مبنی بر اعتدال اور بہ لحاظ حجت قوی قرار دیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ہم دیگر اموال کے نصاب کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں تو موجودہ زمانہ میں ہمیں سونے کا نصاب ہی ان سے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔

چاندی کے نصاب کو معیار قرار دینے میں جہاں غریبوں کا فائدہ ہے وہاں ارباب مال کے ساتھ انسانی بھی ہے اور زکوٰۃ کے معاملہ میں ارباب مال بڑے بڑے سرمایہ دار اور خوش حال لوگ نہیں بلکہ امت کے عوام ہی ہیں۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ چاندی کو اصل نصاب تسلیم کیا جائے دو بنیادوں پر، ایک تو اس لئے کہ چاندی کے نصاب پر اجماع ہے اور صحیح اور مشہور احادیث سے چاندی کا نصاب ثابت ہے، دوسرے اس لئے بھی کہ چاندی کا نصاب غریبوں کے مفاد میں ہے۔

لیکن اس کے ساتھ میری اپنی رائے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص سونے ہی کو اصل نصاب تسلیم کرتے ہوئے زکوٰۃ نکالے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس کا یہ عمل قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

### مصارف زکوٰۃ

کیا یہ صورت درست ہوگی کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ ہے ادارہ اس کے طعام و قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا نظم کرتا ہے، اس طرح ایک طالب علم پر کل اخراجات ماہانہ ڈھائی

سورپے آتے ہیں، مستطیع طلبہ اپنے پاس سے یہ رقم ادا کریں اور غیر مستطیع طلبہ کی طرف سے یہ مقررہ فیس مدرسہ مذکوٰۃ سے ادا کرے یا مدرسہ اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دیدے اور وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کر دے۔

یہ صورت جائز ہوگی، لیکن عملاً اس میں کسی بھی مرحلہ میں دشواری پیش آسکتی ہے، خصوصاً چیک کے معاملہ میں، اس لئے مدارس کا اس سلسلہ میں ابھی تک جو نظام ہے اسی کو باقی رکھا جائے تو مناسب ہے۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا بھی وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ کا بھی۔ فتاویٰ محمودیہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

”مہتمم مدرسہ کو ارباب اموال نے صراحتاً وکیل بنایا ہے کہ ہمارا مال حسب صوابدید مصارف میں صرف کریں، وہ غرباء کا بھی وکیل ہے اس طرح کہ طلبہ نے اس کے اہتمام کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ کہہ دیا کہ آپ ہمارے واسطے ارباب مال سے زکوٰۃ وغیرہ وصول کر کے ہماری ضروریات (کھانا، کپڑا وغیرہ) میں صرف کریں (فتاویٰ محمودیہ ۳۸/۳)۔“

کمیشن پر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کرنا جائز ہے، کیونکہ اس سے دینی مدارس کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے، کمیشن میں شرح فیصد کے تعین کی کوئی حد نہیں ہے، جیسا کہ مزارعت اور مضاربت میں کوئی خاص حد مقرر نہیں ہے، لیکن بہر حال یہ بات یقیناً پیش نظر رہنی چاہئے کہ کمیشن کو آمدنی میں اضافہ کی غرض سے اختیار کیا جا رہا ہے۔

رہا اس سوال کا جواب کہ مدارس کے سفیر عاملین کے حکم میں ہیں یا نہیں، تو میرے نزدیک اگرچہ سفراء حقیقتاً عاملین کے حکم میں نہیں ہیں، جیسا کہ مولانا تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے (امداد الفتاویٰ ۲۲/۲) لیکن ہندوستان میں چونکہ نظام حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اور زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی وصولی کا کام مدارس وغیرہ کے سفراء ہی عموماً انجام دیتے ہیں، اس لئے ان کو



”العاملین علیہا“ کے تحت مانا جائے گا۔

حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر کیا جاتا ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کے ساتویں مصرف میں مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے کے بعد میری ذاتی رائے میں رائج بات یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا مفہوم اور اس کا مصداق صرف ”غازی“ ہے۔ اور جو لوگ بھی یہ حیثیت غازی فی سبیل اللہ کے مفہوم میں داخل ہوں گے ان کے لئے فقر کی شرط باقی رہے گی۔

مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل نہیں ہیں، اس لئے جن حضرات نے فی سبیل اللہ کا مصداق جہاد عسکری کفر اردینے کے باوجود جہاد فکری، جہاد فکری وغیرہ کو جہاد عسکری پر قیاس کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق اگرچہ جہاد عسکری ہی ہے لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے جہاد فکری، جہاد ثقافتی وغیرہ پر بھی زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز ہوگا۔ میری نظر میں یہ نقطہ نظر قابل قبول نہیں ہے اور نہ اصولاً میری نظر میں اس کی گنجائش ہے کہ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کرتے ہوئے کچھ اور قسموں کو مصارف زکوٰۃ میں شامل کیا جائے۔

اس حقیقت سے مطلقاً انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ آج کل مسلمان دینی کاموں کے لئے جو سرمایہ دیتے ہیں اس کا کم و بیش اسی، نوے فیصد زکوٰۃ ہی کی رقم سے ہوتا ہے، لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جو دینی کام کرنے والے اداروں کو پیش آتی ہیں، میرے نزدیک متاخرین یا معاصر علماء کے قیام کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان کی یہ بات مرجوح معلوم ہوتی ہے۔

## زکوٰۃ سے متعلق چند مسائل کا جائزہ

مولانا عبداللہ قاسمی ☆

موجودہ زمانے میں ملکی و عالمی تجارتوں کی کچھ ایسی نئی شکلیں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر معاملات کے علاوہ باب زکوٰۃ پر بھی پڑا ہے، خصوصاً ان شرائط اور اوصاف پر جن کا تعلق مال سے ہے، بسا اوقات یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ واجب بھی ہوئی یا نہیں، پیش نظر مقالہ میں سول نامہ کے اسی جزء کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جبکہ محور ثالث ”مصارف زکوٰۃ“ کے بعض پہلوؤں پر بھی کچھ گفتگو کی کوشش کی گئی ہے۔

محور اول: پہلی شرط ملک تام

ملک تام کا مطلب

کسی بھی مال میں زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے اس کا مملوک ہونا ضروری ہے، چنانچہ جس مال کا کوئی شخص حقیقی (شخص حقیقی اور شخص اعتباری کی تفصیل آگے آرہی ہے) مالک نہ ہو، اس میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، پھر علاوہ امام زفرؒ سبھی ائمہ حنفیہ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اس مال پر شخص حقیقی کو ملکیت کامل طور سے حاصل ہو، کامل کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسباب تملک میں

سے کسی سبب کے ذریعہ شئی کی ذات پر ملکیت قائم ہونے کے ساتھ ساتھ قبضہ وتصرف میں بھی وہ شئی آجائے، شیخ الاسلام ابو بکر بن علی الحداد (متوفی ۸۰۰ھ) ”الجوہرۃ النیرۃ“ میں فرماتے ہیں:

”ملک تام کی قید سے مکاتب اور مدیون کا مال خارج ہو جائے گا، نیز وفتر وخت شدہ سامان جس پر قبضہ نہ ہوا ہو، کیونکہ ملک تام اسے کہتے ہیں جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں اکٹھا ہوں، چنانچہ اگر ملکیت تو ہو، لیکن قبضہ نہ ہو، جیسے کہ بیع قبل القبض اور عورت کا وہ دین مہر جس پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہے یا قبضہ ہو اور ملکیت نہ ہو، مثلاً مکاتب کا مال اور مدیون کا دین جو کسی کا اس کے ذمہ ہے، ان سب میں زکوٰۃ معرض نہ ہوگی“ (الجوہرۃ النیرۃ ۱/۱۳۳)۔

قبضہ وتصرف میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مال مقدور الانتفاع ہو، بایں معنی کہ اس شئی پر بالفعل قبضہ وتصرف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کوئی چیز بالفعل قبضہ میں نہ ہونے کے باوجود بھی مالک کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو تب بھی کہا جائے گا کہ اسے ملکیت تام حاصل ہے۔ ملک العلماء علاء الدین ابو بکر بن مسعود کا سانی (متوفی ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

”مجملة شرائط میں سے ایک ملک تام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات اور قبضہ ہر دو اعتبار سے اس کا مملوک ہو، یہی ہمارے تینوں ائمہ کا مذہب ہے۔ امام زفر اور امام شافعی کے نزدیک قبضہ شرط نہیں، چنانچہ مال ضار میں ہمارے نزدیک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، برخلاف ان کے۔ آگے اس حکم کی نلت بتاتے ہیں کہ مال جب مالک کے حق میں مقدور الانتفاع نہ ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ غنی نہ ہوگا اور غیر غنی پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، آگے فرماتے ہیں: مسافر کا مال جو اس کے گھر ہے اس کے حق میں مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کا قائم مقام اس پر قابض ہے۔ آگے فرماتے ہیں: اسی طرح وہ دین جس کا قرا کر لیا گیا ہو اور قرا کرنے والا مال منول کرتا ہو، وہ بھی مقدور الانتفاع ہے کہ اس تک پہنچنا ممکن ہے“ (بدائع الصنائع ۲/۹۷ طبع مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ بیع قبل القبض (وہ عین جو بیع مکمل ہو کر خریدار کی ملک بن

چکی ہے، لیکن ابھی تک بائع کے قبضہ میں ہے) اور جملہ دیون جو کسی کے ذمہ واجب الاداء ہوں، خواہ قرض ہو یا عورت کا مہر یا تلف کی ہوئی شئی کا ضمان یا زخم کا تاوان سب کی زکوٰۃ مالک پر عائد ہونی چاہئے۔ اگرچہ ادائیگی فی الحال واجب نہ سہی، لیکن قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔ صاحبین کا یہی مسلک ہے، (دیکھئے بدائع الصنائع ۱۰/۲)۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیون کے سلسلہ میں اتنا عموم نہیں ہے جو صاحبین کے نزدیک ہے۔ بلکہ آپ دیون کی تین قسمیں قرار دے کر صرف ایک قسم میں قبضہ سے پہلے وجوب زکوٰۃ کی تصریح فرماتے ہیں اور وہ دین قوی ہے جس کی ادائیگی کم از کم خمس نصاب (نصاب کا پانچواں حصہ) پر قبضہ کرنے کے بعد عمل میں آئے گی، بقیہ دو قسمیں دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے مطابق دین وسط میں قبضہ کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور قبضہ سے پہلے ان پر گزرے ہوئے ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، دین قوی آدمی کا وہ بقایا ہے جو کسی نے قرض کے طور پر لیا ہو یا کسی سامان تجارت کے عوض کسی شخص پر لازم الاداء ہو، اور دین وسط وہ بقایا ہے جو سامان تجارت کے علاوہ اشیاء ضروریہ کے عوض پر لازم ہو، مثلاً اپنا خدمت کا غلام بیچا جس کی قیمت وصول نہ ہوئی یا استعمالی کپڑوں اور رہائش کے گھر کی قیمت جو وصول نہ ہو سکی اور دین ضعیف وہ بقایا ہے جو سرے سے کسی شئی کے عوض میں نہ ہو، مثلاً وہ دین جو وراثت یا اس کے حق میں وصیت کی وجہ سے اس کی ملک بن جائے یا ایسی شئی کا عوض جو از قبیل موال نہیں ہے جیسے عورت کا دین مہر اور مرد کا دین خلع وغیرہ (بدائع الصنائع ۱۰/۲، الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۳/۵، مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند)۔

دیون کے سلسلہ میں آج تک فتویٰ امام صاحبؒ ہی کے قول پر دیا جاتا ہے، کیوں کہ اسی میں لوگوں کی سہولت ہے۔

اب آئیے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جائزہ لیتے ہیں:

### خرید کردہ مال تجارت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ

مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو کیا قیمت جس پر بائع قبضہ کر چکا ہے اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی؟ اس طرح کا مال جس پر عقد تام ہو چکا ہے، لیکن قبضہ نہیں ہوا آیا اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر ہوگی تو کس پر؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک تام کی جو حقیقت اوپر ذکر کی گئی ہے اس کی روشنی میں ثمن پر بائع کا ملک تام ہو گیا، لہذا سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ کا واجب الاداء ہونا یقینی ہے۔ البتہ مبیع قبل القبض کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہے، اگر صرف اس قدر دیکھا جائے کہ اس پر خریدار کو بالفعل یہ اور تصرف حاصل نہیں ہے، تو گویا اس پر خریدار کی ملکیت تام نہیں ہے، لہذا اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ صاحب جوہرہ کی عبارت سے ظاہر ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت میں یہ مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کے عوض پر اسے قبضہ حاصل تھا اور عوض دے کر معوض پر قبضہ کرنا اس کے لئے ممکن ہو چکا ہے تو پھر یہ اس کا مملوک تام ہے جس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم الاداء ہونی چاہئے، فقہاء متاخرین کی عبارتیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں، محقق ابن نجیم کی رائے وہی ہے جو دوسرے نمبر پر ذکر کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہم بیان کر آئے ہیں کہ مبیع جس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوا ہو اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم

نہیں) (البحر الرائق ۲/۲۰۳، ۲۰۸، ۲۰۹، طبع پاکستان)۔

”محیط“ میں اقسام دین کے ضمن میں لکھا ہے کہ مبیع قبل القبض کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے، جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ ہے، اس لئے وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور (ثمن دینے کے بعد) عوض پر قبضہ کرنا اس کے لئے ممکن ہو چکا ہے، لہذا ممکن شرعی کے اعتبار سے اس نصاب زکوٰۃ پر اس کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے گا، ”محیط“ کے اس بیان کی روشنی میں اب یہ تاویل

ہو سکتی ہے کہ فقہاء جو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے ادائیگی واجب نہیں، رہا قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا رہے گی جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”بہر حال قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دے گا جیسا کہ بحر میں محیط کی عبارت سے سمجھا ہے، لیکن فتاویٰ خانہ میں یہ جزئیہ ہے کہ ایک شخص کے کچھ مویشی تھے جنہیں کسی شخص نے سیامت (نما) کی غرض سے خرید لیا اور قبضہ نہ کیا، یہاں تک کہ بائع کے پاس ان پر سال گزر گیا تو خریدار پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ بائع کے پاس مضمون بائٹمن تھے، اس تغلیل کا تقاضہ یہ ہے کہ پھر تجارت کے سامانوں اور سیامت کے مویشیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، غور کر لو“ (الدر المختار وحلیقات، رد المحتار ج ۱ ص ۷۲)۔

علامہ شامی نے جس طرف توجہ مبذول فرمائی ہے وہ واقعی قابل غور ہے اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب بیع بائع کے پاس مضمون بائٹمن ہے تو خریدار کی ملک تام نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر سامان ہلاک ہو جاتا ہے تو خریدار کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اگر ملکیت تام ہوتی تو بلا تعدی اس کے ہلاک ہونے سے خریدار کا مال ضائع مانا جاتا، جب کہ ایسا نہیں ہے، اس کی نظیر مسئلہ مرہون بھی بن سکتا ہے جسے علامہ شامی نے ”ولا فی مرہون بعد قبضہ“ کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے (دیکھئے: رد المحتار ص ۷۲)۔

ہماری نظر میں صاحب بحر کی تغلیل پر علامہ شامی کی تغلیل راجح معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ محض تمکن شرعی کی وجہ سے اگر اس نصاب پر خریدار کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا مملوک تام ہونا لازم آئے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں ملک مشتری پر ہلاک ہو، جبکہ ایسا نہیں ہے، باقی اگر یہ کہا جائے کہ جب بائع کی ملکیت سے نکل گیا

تو لازماً خریدار کی ملک تام ہو جانا چاہیے تو یہ کوئی ضروری نہیں، کیونکہ مطلق ملکیت بائع سے ہٹ کر معلق رہ سکتی ہے تو تمام ملکیت بدرجہ اولیٰ معلق رہ سکتی ہے، جیسا کہ خیاب شرط میں جب کہ خیاب مشتری نے لیا ہو، بیع بائع کی ملک سے نکل کر خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی۔

الحاصل یہ کہ اس مسئلہ میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جب کہ بیع کی زکوٰۃ کسی کے ذمہ نہیں، بلکہ خریدار کے ذمہ اس وقت ہوگی جب اس پر قبضہ کرے اور اس پر سال گزر جائے، سابقہ سالوں کی زکوٰۃ نہ ہوگی۔

### کرائے کی مد میں پیشگی رقم کی زکوٰۃ

کرائے کی مد میں جو پیشگی رقم دی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: اگر یہ محض زیر ضمانت ہے تا کہ کرایہ دار اگر کرایہ کی ادائیگی میں تاہندہ واقع ہو تو اس رقم میں سے کرائے کی رقم وضع کر لی جائے گی، ورنہ اجارے کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس کر دی جائے گی تو اس صورت میں یہ کرایہ دار کا مالک مکان پر دین ہوگا اور اس کی ادائیگی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس وقت لازم ہوگی جب اس رقم میں سے کم از کم خمس نصاب کے بقدر اسے واپس مل جائے، اس وقت سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

لیکن اگر یہ پیشگی رقم بہ طور اجرت مجملہ کے ہے تو مالک مکان کی ملک ہوگی اور سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ مالک کو دینی ہوگی (بدائع الصنائع ۶/۲)۔

صاحب ”بدائع“ کی عبارت کی روشنی میں مذکور الصدر دونوں صورتوں کا حل ہو سکتا ہے، کیوں کہ اول الذکر کرائے دار کا مالک کے پاس رکھا ہو مال ہے اور ثانی مالک کی ملکیت تامہ۔

### مدارس وغیرہ کے سرمایہ میں زکوٰۃ

جس مال کا کوئی مالک معنی نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں ان

پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ یہ رقم اگر وقف ہے تو ملکیت کا نہ ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ وقف نہیں تو کسی شخص حقیقی کی ملک بھی قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ منتظم ادارہ کے اس پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ معطلی کی ملکیت سے نکل جاتی ہے مگر جب تک کسی مصرف پر خرچ نہیں ہو جاتی اس کی ملکیت موقوف رہتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کی بابت وقف کا حکم رکھتی ہے۔

”ولا زکاة فی المال الموقوف لعدم الملك“ (ابن علیٰ ابراہیم)

الاربعہ ۱/ ۵۹۲۔

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ جیسا کہ بعض صورتوں میں فقہاء بر بنائے ضرورت شخص اعتباری یا شخص قانونی کا اعتبار کر کے اس پر وہ احکام جاری کرتے ہیں جو اصلاً شخص حقیقی پر ہونے چاہئیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ مدارس اور اداروں کو شخص اعتباری مان کر یہ تمیز ان کی ملک قرار دی جائے اور پھر ان پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے؟

اس سلسلہ میں ہمارے ناقص خیال میں جو بات آتی ہے، وہ یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مدارس اور اداروں کو بعض حالات میں شخص اعتباری قرار دینا ناگزیر ہو جاتا ہے، مثلاً یہی کہ اگر مہتمم سے بلا تعدی مذکورہ قوم ضائع ہو جائیں یا ادارے کی مصالح میں کسی عقد و معاملہ کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا ضمان مہتمم پر نہیں ہوتا، بلکہ ”اس شخص اعتباری“ ادارے پر ہوتا ہے، جس کی مصلحت کی رعایت میں نقصان ہوا ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

لیکن شخص اعتباری مان لینے کے باوجود مسئلہ وجوب زکوٰۃ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ ایک خالص عبادت ہے اور محض حق اللہ جو ہر عاقل بالغ مسلم پر بہ چند شرائط فرض عین ہے، حقوق العباد اس سے وابستہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کی حد تک تو شخص قانونی کو معتبر ماننے کی ضرورت داعی ہے، تاکہ اس سے متعلق کسی بندے کا حق ضائع نہ ہو اور کما حقہ اس کا حق مل سکے اور قاعدہ ہے: ”الضرورات تقدر بقدرها“۔



شیخ عبدالرحمن الجزیری "الفقه علی المذاهب الاربعہ" میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ بچوں اور پاکوں کے مال میں صرف اس وجہ سے واجب نہیں کہ یہ ایک خالص عبادت ہے برخلاف عشر اور صدقہ نظر کے کہ یہ ملحق بحقوق العباد ہیں (الفقه علی المذاهب الاربعہ ۱۹۱/۱)۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقف کی زرعی پیداوار میں عشر "مؤنۃ ارض" ہونے کے باعث واجب ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی ناظر و متولی اس شخص اعتباری (وقف) کا قائم مقام ہو کر ادا کرتا ہے، گویا وجوب عشر اور اس کی ادائیگی چونکہ حق العبد ہے، اس لئے اس میں شخص اعتباری کا نظر یہ مجبوری ہے، برخلاف زکوٰۃ کے جو خالص عبادت ہے۔

### مال حرام کی زکوٰۃ

حرام طریقہ سے جو مال کسی شخص کے قبضہ میں آتا ہے اس پر قیام ملک کا تحقق نہیں ہوتا، بلکہ اس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو تو اس تک واپسی لازم ہے، ورنہ بلا نیت ثواب واجب التصدق ہے۔ محض قبضہ قیام ملک کے لئے کافی نہیں، اس لئے ایسے مال میں خواہ قابض کے پاس سال بھر رہ جائے اور بقدر نصاب بھی ہو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة؛ لأن الكل واجب التصديق عليه.....إلى قوله ويجب عليه تفرغ ذمته برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء" (صحیح الخالق علی ہامش البحر الرائق ۲/۲۰۵)۔

لیکن اگر حرام مال حایل میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ باہم تمیز مشکل ہو تو امام ابوحنفیہ کے نزدیک استہلاک کی وجہ سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا، البتہ جس قدر مال حرام تھا اتنے کا اس کے مالکین کے لئے مدیون ہو جائے گا، اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے: یا تو اس کے پاس اس مخلوط مال سے علیحدہ کوئی نصاب

مالی (جس میں زکوٰۃ فرض ہو) موجود ہو، تاکہ اس سے دین کی ادائیگی ہو سکے یا ان اموال حرام کے مالکین معاف کر دیں، ثانی الذکر صورت میں جس قدر اس کے پاس مال موجود ہے، سب کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور اول الذکر میں حرام مال کی مقدار جو اس کے ذمہ دین ہے وضع کرنے کے بعد باقی ماندہ اگر بہ قدر نصاب ہو تو زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں (دیکھئے: الدر المختار و رد المحتار ۲/۲۵)۔

### دین کی زکوٰۃ

دین (ایسا بقایا جو ذمہ پر ہوتا ہے) کی زکوٰۃ مدیون پر واجب نہ ہونا تو ظاہر ہے، کیوں کہ محض قبضہ مفید ملک نہیں ہوتا۔

”أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمليون لا تجب فيه الزكاة“ (الجمہورہ ۱/۱۳۳)۔

رہا دائن (جس کا بقایا ہے) کے ذمہ واجب ہونا تو ملک تام کی تشریح کے ذیل میں آچکا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس قسم کا دین ہے اسی کے مطابق حکم ہوگا، گویا دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے بموجب دین وسط میں وجوب زکوٰۃ قبضہ کے بعد حولان حول پر متعلق ہوگا، الا یہ کہ اس کے پاس پہلے سے اسی جنس کا نصاب موجود ہو جس کے ساتھ مل کر اس کی بھی زکوٰۃ حولان حول کے قبیل سے دینی پڑے گی۔

دین قوی (مال تجارت کا بدل جو مدیون کے ذمہ اس کے قمر اریا بیئہ سے ثابت ہو) میں زکوٰۃ کا وجوب فی الحال (قبضہ سے قبل) متعلق ہوتا ہے، البتہ ادائیگی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ ہو جانے تک موقوف رہتی ہے اور قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء رہتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں فقہاء اس صورت کا حکم بھی یہی لکھتے ہیں کہ اگر مدیون باوجود دین کی ادائیگی پر قدرت کے مال منول کرنا ہو تب بھی دائن پر ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ اصولی اعتبار سے یہ دین قوی ہے۔

”وكلما الدين المقر به اذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول إليه“  
(بدائع الصنائع ۹/۲۳)۔

لیکن علامہ شامی مصارف زکوٰۃ کے باب میں ”درمختار“ کی عبارت ”ومنہ ما لو كان ماله مؤجلا أو علی غائب أو معسر أو جاحد ولو له بينة فی الأصح“ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”هنا وقال: بل فی زماننا یقر المديون بالدين وبملائته لا یقدر الدائن علی تخلصه منه فهو بمنزلة العدم“ (الدر المختار رد المحتار ۶۲/۲۳)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے علامہ شامیؒ کی اسی ترجیح پر اعتماد ظاہر فرمایا ہے، چنانچہ آپ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ نادہندہ مقروض کا قرضہ دین قوی نہیں، اس لئے وصولیابی کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

”و متمسکی فیہ ما فی رد المحتار الخ“ (امداد الفتاویٰ ۳۵/۲۳)۔

### پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ جو ملازم کی ماہانہ یافت میں سے سرکار یا پرائیویٹ کمپنیز لازماً وضع کر کے رکھتی ہیں اور ختم ملازمت پر اضافہ کے ساتھ واپس کرتی ہیں، تقریباً حال اور ماضی کے علماء کرام کا اتفاق ہے کہ یہ رقم دین ضعیف یا دین وسط کے تحت آتی ہے اور صحیح ترین روایت کے بموجب ان دونوں میں قبضہ کے بعد سے سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

حضرت تھانویؒ کے اس سلسلہ میں دو متضاد فتوے صادر ہوئے تھے، ایک میں دین قوی قرار دے کر گزشتہ کی زکوٰۃ واجب قرار دی گئی تھی، دوسرے میں دین وسط یا ضعیف قرار دے کر قبضہ کے بعد تمامیت سال پر وجوب زکوٰۃ ثابت کیا گیا تھا۔ حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس تعارض کو دفع کرنے کی غرض سے ایک تحقیقی استفسار حضرت سے کیا جس میں بدائع، بحر اور منہ الخالق کی عبارات کی روشنی میں حضرت کے دوسرے فتوے کی تصویب چاہی گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

”الغرض پرائیویڈنٹ کاروبار دین قوی میں تو داخل ہو نہیں سکتا، کیونکہ وہ معاوضہ کسی مال تجارت کا نہیں، بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حرکی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل بھی مان لیں تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔“

حضرت تھانویؒ نے اس تحقیق سے اتفاق ظاہر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

”آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے، لہذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں“ (امداد الفتاویٰ ۲/۳۳۳)

۵۰۲ میں حضرت تھانویؒ کے دونوں فتوے مفتی صاحبؒ کی تحقیقی استفسار اور حضرت کی تصویب ملاحظہ کی جائے۔

چنانچہ اسی کے مطابق مفتی کنایت اللہ صاحب، مفتی عبدالرحیم صاحب، مفتی محمود الحسن صاحب اور مفتی نظام الدین صاحب وغیرہم کے فتاویٰ موجود ہیں۔

### کمپنیوں پر زکوٰۃ

فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کا مکلف شخص حقیقی ہے جو تکلیفات شرعیہ کا اصل ہو، لہذا چند شرکاء کے مشترک کاروبار سے جو ایک شخص اعتباری کا تصور پیدا ہوتا ہے (کمپنی) اس کے ساتھ فریضہ زکوٰۃ وابستہ نہیں، بلکہ کمپنی کے جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب ہیں صرف ان پر ان کے

حصوں کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر شرکاء کی تعداد اتنی بڑی ہے یا مشترک مال کی مقدار اتنی کم ہے کہ شرکاء پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنے پر ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب نہیں بچتا تو کسی پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ کمپنی کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہو، لایہ کہ کسی شریک کے پاس اپنا کوئی نصاب شرعی موجود ہو جس کی زکوٰۃ لازم الاداء ہو تو اس کے ساتھ وہ کمپنی میں سے اپنے حصہ مالیت کی بھی زکوٰۃ نکالے گا کمپنی بہ حیثیت کمپنی پر زکوٰۃ دو وجہ سے نہیں ہے۔ اولاً اس لئے نہیں کہ وہ شخص حقیقی مکلف نہیں، ثانیاً اس وجہ سے نہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک مخصوص نصاب کی شرط ضروری ہے، جس کا مدار مالکین کے لئے سہولت اور آسانی مہیا کرنے پر ہے، لہذا سہولت اسی میں ہے کہ وہ نصاب شخص واحد ہی کا ہو، متعدد اشخاص کا مشترک نہ ہو، متعدد اشخاص کی ملک سے کوئی نصاب بن گیا جس کی وجہ سے سب پر بقدر حصص زکوٰۃ واجب ہوگئی تو یہ اس علت فقہی کے منافی ہوگا، لہذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ مشترک نصاب پر زکوٰۃ نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابن رشد مالکی بدایۃ المجتہد میں مسئلہ مذکور میں اختلاف ائمہ کے ذیل میں اس علت فقہی پر زور دیتے ہوئے مالکیہ اور احناف کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، دیکھئے: (بدایۃ المجتہد ۱/۲۵۸)۔

### شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کسی بھی تجارتی کمپنی کے شیئرز (حصہ) خرید لیا درحقیقت اس کمپنی میں اس شیئر کے بقدر شرکت حاصل کرنا ہے اور خریدار اپنے حصہ (مثلاً ہزارویں) کے بقدر کمپنی کے پورے اثاثے، عمارت، تیار شدہ خام مال تجارت اور نقد روپیوں میں شریک ہو جاتا ہے اور جوں جوں کمپنی ترقی کرتی رہے گی اس حصے کے تناسب سے سرمایہ کی مقدار بھی بڑھتی رہے گی، لہذا اصل ضابطے کی رو سے ہونا یہ چاہیے کہ حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی رقم کا جتنا حصہ کمپنی کی عمارت، آلات حرفت وغیرہ غیر نامی اثاثوں میں لگا ہوا ہے اس کی تو زکوٰۃ لازم نہ ہو اور جتنا سامان تجارت یا نقد کی

صورت میں موجود ہے اگر بقدر نصاب ہے تو اس کی زکوٰۃ لازم ہو، اور ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں نہ تو شیئر کی بنیادی قیمت سے تعلق ہوگا، جس کے عوض اس نے شیئر خریدا ہے اور نہ ہی ادائیگی یا وجوب کے وقت شیئر کے بازاری نرخ سے، کیونکہ شیئر بذات خود کوئی مال متقوم نہیں ہے کہ اسے تجارتی سرمایہ قرار دیا جائے، بلکہ ایک اضافی شئی ہے جو اپنے مضاف الیہ کے اعتبار سے معنی خیز بنتی ہے، جیسے دکان کا حصہ، مکان کا حصہ وغیرہ، اسی طرح یہاں مشترک تجارت کا حصہ، چنانچہ اس مشترک تجارت میں ہر شریک کا جتنا حصہ ہے وہی اس کا اپنا مال ہے جس پر زکوٰۃ کا حکم حسب شرائط عائد ہوگا، اسی طرح ہر شریک کا یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ اپنے حصہ کا مال کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، (یہاں ان علمی اشکالات سے بحث نہیں جو شیئر کی خرید و فروخت کی بابت پیدا ہوتے ہیں، ان کا کافی وثانی حل حضرت تھانویؒ کے رسالہ ”القصص الہی“ میں ملاحظہ کیا جائے)۔

گویا ہر شریک کو کمپنی سے یہ تفصیل دریافت کرنی ہوگی کہ اس کے سرمایہ کی کل مقدار کیا ہے؟ کتنا حصہ نامی اثاثوں کی شکل میں ہے؟ اور کتنا حصہ غیر نامی کی شکل میں؟ تاکہ وہ اپنی زکوٰۃ کا حساب صحیح طور پر لگا سکے، اگر تفصیل اسے کمپنی کی طرف سے موصول ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرور اس وقت بازار میں شیئر کا جو نرخ ہو اسی کے ذریعہ مالیت کا تعین کیا جائے گا، اس لئے کہ انہی یہی ہے کہ بازاری قیمت کے مقابلہ میں شیئر کی وہ مقدار جو نامی ہے کم ہے اور شیئر کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اصل مالیت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کے تابع ہوتا ہے، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ مارکیٹ کی قیمت معیار مالیت قرار دی جائے (مستفاد از رسالہ ”القصص الہی“ امداد فقہاؤ کی ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲)۔

”بونڈس“ حقیقت میں اس کے خریدار کی طرف سے حکومت یا کمپنی کو قرض دینا ہے جس کا سرٹیفکیٹ اس کے پاس موجود ہے، ظاہر ہے کہ مدت کے اختتام پر اصل رقم کے ساتھ جو منافع ملتا ہے یقیناً ربا ہے اور اصل رقم بمنزلہ دین قوی ہے، جس کی زکوٰۃ لازم ہے اور ادائیگی کم از کم شمس نصاب پر قبضہ کرنے کے بعد سابقہ سالوں کی بھی ہوگی۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارتی سامان چونکہ نامی ہیں، اس لئے ان کی زکوٰۃ فرض ہے اور مالیت کا حساب بازاری نرخ سے لگایا جائے گا، اصل لاگت سے کوئی مطلب نہیں، صاحبین کے نزدیک ادائیگی کے دن جو بازار میں قیمت ہوگی، اس کے حساب سے مالیت کا تعین ہوگا اور امام صاحب کے نزدیک جس دن سال پورا ہوا تھا اس روز کی بازاری قیمت معیار قرار دی جائے گی۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالوا: يوم الأداء، وفي السوائم يوم الأداء إجماعاً وهو الأصح ويقوم في البلد الذي المال فيه“ (الدر المختار ۲/۲۲، البحر الرائق ۲/۲۲۱)۔  
حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ نے صاحبین کی رائے کو ترجیح دیا ہے۔

”اگر نقصان قیمت میں ہے یا نفع اس قیمت کی زکوٰۃ دیوے جو دینے کے روز اسباب تجارت کی قیمت ہے“ (تذکرہ المرشد ۱/۱۸۶)۔

رہی بات تھوک اور پھٹکر کی تو جیسا اس کا کاروبار ہوتا ہو، بایں طور کہ تھوک خریداری اور تھوک بیفروختگی ہوتی ہو تو معیار تھوک قیمت ہوگی، ورنہ پھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا۔

### اراضی تجارت کی زکوٰۃ

اموال تجارت میں وجوب زکوٰۃ کا جو کلی ضابطہ فقہاء بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے:  
”أن ما عدا الحجورين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المؤدى إلى الشئى“ (الدر المختار ۲/۱۳)۔

یعنی نقدین اور سوائم کے علاوہ میں زکوٰۃ تجارت کی نیت سے واجب ہوتی ہے بشرطیکہ نیت کی وجہ سے وجوب زکوٰۃ کی صورت میں ایک ہی مال میں دو مرتبہ زکوٰۃ نہ واجب ہو جاتی ہو، چنانچہ کبھی ایسا ہو جائے تو نیت تجارت کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مثلاً:

”خرابی یا عشری زمین تجارت کی نیت سے خرید کر اس میں کاشت کاری کیا یا تجارت

کی نیت سے بیچ خرید کر بودیا تو اس صورت میں صرف عشر یا خراج واجب ہوگا، زمین یا بیچ کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔“

لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایسی صورت میں ہوگا، جبکہ اس زمین کی بوائی کر دی جائے، نیز اس کا عشری یا خراجی ہونا معلوم ہو، دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کے وقت یہ حکم نہ ہوگا، مثلاً تجارت کی نیت سے عشری یا خراجی زمین خرید اور بوائی نہیں کی یا اس زمین کا سرے سے عشری یا خراجی ہونا معلوم نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر ہندوستان کی زمینوں کا یہی حال ہے تو بلاشبہ یہ اراضی اموال تجارت ہوں گی، اور ان کی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ان کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

### ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات جو تجارت کی غرض سے رکھے ہوں ان پر نامی ہونے کے باعث زکوٰۃ لازماً ہوگی، باقی اس مقصد سے ان کا ذخیرہ کیا گیا ہو کہ انکم ٹیکس یا دیگر سرکاری قوانین کی زد سے محفوظ رہیں گے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں، خواہ ان کی مالیت لاکھوں کی ہو، زیادہ سے زیادہ ان کے حوائج اصلیہ سے زائد ہونے کی وجہ سے حرمت زکوٰۃ، وجوب صدقہ، فطر اور وجوب قربانی وغیرہ احکام آئیں گے، البتہ ہیرے جواہرات کا ذخیرہ کرنے والوں کی نیت اگر حکم شرعی (زکوٰۃ) سے فرار اختیار کرنی ہو تو گناہ گار ہوں گے، لیکن اس صورت میں بھی زکوٰۃ ان پر واجب نہ ہوگی۔

”لا زکوٰۃ فی اللالی والجواہر وإن ساوت ألفاً اتفاقاً إلا أن تكون

للتجارة“ (الدر المختار ۲/ ۱۳)۔

یہی حکم ان جواہرات کا بھی ہے جو تزمین اور آرائش کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، بلکہ ان کے متعلق حالت اصلیہ کے تحت شامل ہونے نہ ہونے ہی میں فقہاء کا اختلاف ہے، اگرچہ صحیح یہی ہے کہ ایسے قیمتی اثاثے جن کا مقصد محض تزمین ہو، تحقق غنا کے لئے کافی ہیں، لیکن حرمت زکوٰۃ وغیرہ کی حد تک نہ کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں۔



تیسری شرط- حاجات اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجات اصلیہ - تعریف اور دائرہ

تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ (بنیادی ضرورت) سے زائد ہونا ہے، حاجت اصلیہ کی تعریف فقہاء یوں کرتے ہیں:

”ما یبلغ الہلاک عن الإنسان تحقیقاً أو تقلیباً“ (البحر الرائق ۲/۲۰۶،

الدر المختار ۲/۶۱۲)۔

(حاجت اصلیہ ہر اس ضرورت کو کہتے ہیں جس کا استعمال انسان کو ہلاکت سے

بچائے خواہ یہ ہلاکت سے بچانا حقیقتہً ہو یا حکماً)۔

پھر ہر دو کی تشریح کرتے ہیں:

تقدیر اہلاکت سے بچانے والی ضرورت مثلاً دین ہے، کہ اگر کسی شخص کا بقایا اس کے ذمہ ہو، اور ادائیگی نہ کرے تو ذلت اٹھانی پڑے گی جو ہلاکت کے مرادف ہے، بلکہ اس کی وجہ سے قید بھی ہو سکتا ہے، لہذا دین کی ادائیگی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اپنی ذلت سے ضرر کا دفعیہ، بلکہ یہ ضرورت دوسری ضروریات کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔

حقیقتہً ہلاکت سے بچانے والی ضروریات میں رہائش کا گھر، ہتھیار، استعمالی کپڑے جو سردی اور گرمی سے دفاع کے لئے رکھے جائیں، گھر کے استعمالی ساز و سامان، سواری کا جانور اور اہل علم کے لئے کتابیں وغیرہ (البحر الرائق ۲/۲۰۶)۔

ضرورت کے تحت رکھے ہوئے نقد کی زکوٰۃ

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے نقد رقم اپنی واقعی اور بنیادی ضرورت کی خاطر جمع کر رکھی ہے، مثلاً رہائش کا گھر نہیں ہے، وہ اس سے گھر خریدنا چاہتا ہے، کپڑے بنوانے

ہیں، ابھی ان ضرورتوں کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی کہ اس سے پہلے اس پر سال پورا ہو جاتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ذمہ پر واجب ہوگی؟ یا یہ رقم حاجتِ اصلیہ میں شمار کی جائے گی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں: ابن نجیم ”شرح الجمع لابن الملک“ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”جب کسی کے پاس کسی ضرورت کے پیش نظر کچھ دراہم موجود ہوں جو اس ضرورت میں خرچ ہونے ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، ابن الملک نے اس کی صراحت کر دی کہ بنیادی ضرورتوں میں خرچ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے دراہم میں خواہ ان پر سال گزر جائے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جبکہ ”معراج الدراییہ“ کی فصل ”زکوٰۃ العروض“ میں اس کے خلاف ہے، کہ نقد میں بہر حال زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، نماء (تجارت) کے لئے رکھا ہو یا خرچ کے لئے، اسی طرح بدائع میں نماء تقدیری کے تحت بھی مذکور ہے“ (البحر المرقوم ۲۰۶/۳)۔

علامہ شامی نے دونوں میں بڑی اچھی تطبیق پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ ”بدائع“ اور ”معراج الدراییہ“ وغیرہ کے بیان کا مجمل یہ ہوگا کہ نقدی میں زکوٰۃ فرض اس وقت رہے گی جب کسی نے اس ارادے سے رکھ رکھا ہو کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئے گی تو خرچ کر دوں گا، لیکن کوئی ضرورت پیش ہی نہ آئی کہ سال پورا ہو گیا، اب اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اگرچہ اس کا خرچ کرنے کا ارادہ اب بھی بدستور قائم ہے، لیکن اگر کسی متعین ضرورت کے پیش نظر رکھا تھا، مثلاً رہائش کا گھر بنوانا ہے سال پورا ہو گیا اور وہ ضرورت ہنوز باقی ہے تو اس صورت میں ان دراہم کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جیسا کہ شرح الجمع میں صراحت ہے (رد المحتار ۲۰۶/۳)۔

### حاجتِ اصلیہ کا تعین احوال و ظروف کے اعتبار سے

اس میں شک نہیں کہ حاجتِ اصلیہ کا دائرہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی تعبیر ”کتب العلم لأهلها“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کے لئے کتابیں حاجتِ اصلیہ میں ہیں جبکہ غیر عالم کے حق میں حاجتِ اصلیہ نہیں، چنانچہ کسی ماحول میں

عام طور سے پانچ چھ جوڑے کپڑے استعمال کے لئے رکھے جاتے ہوں، ایسے ماحول میں کوئی شخص پچیس پچاس یا اس سے زائد جوڑے رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ماحول کے اعتبار سے یہ اس کی پہننے کی ضرورت سے بہت زائد ہیں، لہذا اس کی حاجت اصلیہ سے باہر ہوں گے۔

لیکن اس کا اثر زیادہ سے زیادہ تحقق غناء پر پڑے گا، جس سے زکوٰۃ لینے کی حرمت، صدقۃ الفطر اور قربانی کا وجوب وابستہ ہوتا ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ پر، کیوں کہ اس میں حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کے ساتھ نامی ہونے کی بھی شرط ہوتی ہے۔

### چوتھی شرط - دین سے محفوظ ہونا

مال کا دین سے محفوظ ہونا حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کی شرط کے تحت آجاتا ہے، بایں معنی کہ یہ ایک معنوی ضرورت ہے۔ لیکن چونکہ حسی حوائج اصلیہ کی بہ نسبت اس کی تفصیلات و احکام قدرے مختلف ہیں، اس لئے فقہاء اس کو الگ سے مستقل شرط کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، کسی شخص کے مال میں جملہ شرائط وجوب، نصاب نامی وغیرہ موجود ہوں لیکن اس پر کسی قرض یا بقیہ کا بار ہو تو پہلے بقایا کی مالیت اس کے نصاب سے منہا کر لی جائے گی، اس کے بعد اگر مال بقدر نصاب بچتا ہو تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے گا، کس قسم کا دین وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں یوں ملتی ہے:

”ہر وہ دین جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے، چاہے وہ دین بندوں کا ہو جیسے قرض، بیع کا ثمن، تلف کی ہوئی شئی کا ضمان، زخم کا تاوان اور مہر یا اللہ کا مثلاً دین زکوٰۃ، کیوں کہ اس کا بھی مطالبہ کرنے والا موجود ہوتا ہے، برخلاف دین کفارہ اور دین نذر کے کہ امام المسلمین کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ پھر اس دین کا کوئی نقدی کے قبیل سے ہونا ضرور نہیں کہ جس قسم کا بھی ہو، خواہ کیلی ہو، وزنی ہو، مزروعات میں سے ہو یا عدوی کے قبیل سے ہو، اس کا ذمہ پر وجوب چاہے معاملے کے ضمن میں ہو یا عقد نکاح

کے یا خلع کے یا دم عمد (نصاص) پر عقد صلح کے نتیجے میں ہر دست واجب الاداء ہو یا ادھار۔

### دین طویل الاجل کا حکم

حنفیہ کے نزدیک دین کے وجوب زکوٰۃ سے مانع ہونے کی جو تفصیل اوپر ذکر کی گئی اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ دین خواہ مؤجل ہو یا معجل بہر صورت اس کا ذمہ پر ہونا زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع ہے، اس کی مدت لمبی ہو یا کم، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اصل چیز مطالبہ ہے اور مؤجل کا مطالبہ عاۃً معینہ مدت سے قبل نہیں ہوا کرتا، اس لئے مانع نہیں ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ عورت کا دین ہر جو مؤجل ہو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان تین اقوال پائے جاتے ہیں اور مسئلہ خاصا مختلف فیہ ہے:

۱- بہر صورت مانع زکوٰۃ ہے۔

۲- معجل مانع ہے، مؤجل نہیں۔

۳- شوہر اگر ادائیگی کا پختہ ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے، ورنہ نہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے

(بدائع ۶/۲)۔

علامہ شامیؒ نے تہستانی سے دوسرے قول کا راجح ہونا نقل کیا ہے، دیکھئے: رد المحتار ۵/۲۔ اس مسئلہ میں ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں، حضرت تھانویؒ کا تینوں قول کے مطابق فتویٰ موجود ہے (امداد الفتاویٰ ۹/۲، ۱۰)، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تیسرے قول پر فتویٰ دیا ہے (کفایت لمبھی ۲۳۶، ۲۳۷)، اور ”فتاویٰ دارالعلوم“ میں شامی پر اعتماد کر کے دوسرے قول کو اختیار کیا گیا ہے (فتاویٰ دارالعلوم ۶/۵۰، ۵۱)۔

آج کل حکومتیں جو اپنے شہریوں کو لمبی لمبی مدت پر بڑی بڑی رقمیں قرض کے طور پر دیتی ہیں جس کی ادائیگی سالانہ قسط وار کرنی ہوتی ہے ان کا حکم مذکورہ بالا فقہی فتویٰ میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سالانہ واجب الاداء قسط ہی نصاب زکوٰۃ سے منہا کی جانی چاہئے، نہ

کہ پوری مقدار قرض، اولاً اس وجہ سے کہ ان کے قرضوں میں لازماً اسی قسط کا مطالبہ ہوتا ہے جو اس سال واجب الاداء ہے، نہ کہ پورے قرض کا، دوسرے اس میں فقراء کا نفع بھی ہے، ورنہ اگر پوری مقدار قرض منہا کر لی جائے تو بسا اوقات زکوٰۃ ہی فرض نہ ہو سکے گی یا ہوگی تو بہت معمولی، جب کہ مالکین اس رقم قرض کو تجارت یا کسی دوسری نامی مد میں لگا کر اس سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

### محور ثانی - نصاب

چاندی اور سونے میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، البتہ اموال تجارت کی مالیت کا تعین نقدین میں سے کسی ایک سے کرنا پڑے گا اور اس بارے میں مسئلہ بے غبار ہے کہ جس کے ذریعہ قیمت لگانے سے مال تجارت کی مالیت نصاب کے بقدر ہو جاتی ہو وہی معیار ہوگا۔ چنانچہ فی زمانہ جب کہ سونے چاندی کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ظاہر ہے کہ معیار چاندی ہی قرار پائے گی، کہ اسی کے ذریعہ قیمت لگانے پر مال کی مقدار نصاب تک جلدی پہنچتی ہے، باقی اگر دونوں کے ذریعہ نصاب کے بقدر یا اس سے زائد مالیت قرار پاتی ہو تو جس میں فقیر کا زیادہ نفع نظر آئے اسی کو اصل تسلیم کیا جائے۔

”ولو بلغ بأحدهما نصاباً دون الآخر تعین ما یبلغ بہ وبلغ بأحدهما نصاباً وخمساً وبالآخر أقل قومه بالأضع للفقیر“ (الدر المختار ۳۱/۲)۔

یہ تفصیل تو اس نصاب شرعی کے متعلق ہے جس کا تعلق وجوب زکوٰۃ سے ہے، باقی وہ نصاب شرعی جس کا مالک شرعاً معنی کہلاتا ہے اور زکوٰۃ کا مال اس کے لئے حرام رہتا ہے، خواہ اس پر فرض ہو یا نہ ہو اس کا تعین حدیث پاک کے بموجب چاندی کے نصاب سے کیا جائے گا (دیکھئے رد المحتار ۶۵/۲)۔

## محورثالث - مصارف زکوٰۃ

ادائیگی زکوٰۃ کے لئے تملیک شرط ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں بندوں پر ان کے مخصوص اموال میں سے ایک معین حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا فرض فرارویا ہے، وہیں یہ نص قرآنی اس حصہ زکوٰۃ کے مصارف بھی واضح انداز میں بیان فرمادیئے ہیں کہ ان ہی مصارف میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جائے گا، ان کے علاوہ میں نہیں، ساتھ ہی ادائیگی کے صحیح طریقہ اور کیفیت کی بھی نشاندہی کر دی ہے، چنانچہ آیات قرآنی و احادیث نبوی کی روشنی میں امت کے جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی ادائیگی اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ان مستحقین میں سے کسی کو زکوٰۃ کے مال پر بلا کسی عوض مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیے اگر کوئی مال زکوٰۃ کی نیت سے ان ہی لوگوں کے فائدے میں خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم مدارس، مساجد، شفاخانے اور یتیم خانے وغیرہ کی تعمیر میں صرف نہیں کی جاسکتی، اگرچہ اس سے مستفید مستحقین بھی ہوں گے، کیونکہ ان صورتوں میں تملیک کا مفہوم مفقود ہے، حتیٰ کہ زکوٰۃ کی رقم سے کوئی شئی خرید کر مستحقین کو بطور باحت مستفید ہونے کا موقع دے دیا جائے، مثلاً بٹھا کر صبح و شام کھانا کھلا دیں تو فقہاء فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی (بدائع ۳۹۲)۔

ملک العلماء کا سانی نے تملیک کے ضروری شرط ہونے پر استدلال اس طرح کیا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کا حکم ہے وہاں فعل ”ایتا“ کا استعمال کیا گیا ہے، جس کی حقیقت مالک بنا دینا ہے، نیز قرآن میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنا دیا جائے۔

### طلبہ کو زکوٰۃ کیسے دی جائے؟

ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک مستحق کے شرط ہونے کی وجہ سے آج کل دینی مدارس، اداروں اور یتیم خانوں کے ارباب انتظام کو سخت آزمائش کا سامنا ہے، جہاں محتاج طلبہ علم دین اور یتامی جیسے مستحقین زکوٰۃ موجود ہوتے ہیں، جن کی خاطر وہ قوم سے زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ وصول کر کے لاتے ہیں اور ان پر حسب حکم شرعی صرف کرنے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان اداروں میں مستحقین کے علاوہ خرچ کی کچھ اور مدات بھی ہوتی ہیں جن میں صدقات واجبہ کی رقمیں صرف نہیں کی جاسکتیں اور کافی سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً ملازمین کی تنخواہیں، ادارے کی تعمیر اور ان پر آنے والے ضروری اخراجات بجلی، پانی، ٹاٹ، فرنیچر وغیرہ اور تجربہ بہ شہاد ہے کہ ان میں اکثر مدارس کو صدقات واجبہ کے علاوہ اتنی رقم فراہم نہیں ہو پاتی جس سے وہ ادارے کے دوسرے اخراجات پوری کر سکیں، اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے فقہ کی بعض جزئیات کو نظیر بنا کر نہ جانے کب سے حیلہ متعارفہ کی ایک رسم بد چلی آ رہی ہے جس پر مالکین خوش ہیں کہ ہم نے زکوٰۃ کی رقم مصرف پر خرچ کرنے کے لئے دی اور منتظمین خوش ہیں کہ ہم نے مصرف پر خرچ کر لی، جبکہ حقیقت میں رقم اپنے مصرف پر خرچ نہ ہوئی، صرف ہتھ پھیرا ہوا، حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

”قطع نظر ورع سے میرے نزدیک قاعدہ فقہیہ کی رو سے بھی یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیونکہ تملیک رکن زکوٰۃ ہے اور تملیک میں جب عائدین ہازل ہوں تو تملیک نہیں ہوتی اور صورت متعارفہ میں دونوں شہادت قرآن کو یہ معترف ہیں کہ تملیک مقصود نہیں“ (مداد الفقہ ص ۱۳۲)۔

ایک طرف اس دور جہل و ضلالت میں علم دین کی روشنی پھیلانے کے لئے اس طرح کے اداروں کا قیام عمل ضروری ہے، تو دوسری طرف ان کی بقا و دوام کی راہ میں مختلف مالی مشکلات کا سامنا ہے، ان مشکلات کے حل کی ایک راہ تلاش بھی کی گئی تو تجربہ نے بتایا کہ یہ خطرات سے

محفوظ نہیں، اس لئے ہمارے خیال میں حیلہ متعارفہ سے ہٹ کر کوئی ایسی راہ عمل تلاش کرنا ضروری ہے جس سے شریعت کی حکم عدولی سے محفوظ رہتے ہوئے احیائے دین کے ان مراکز کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاسکے، سوال نامہ میں جو دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے اول الذکر پر ہمیں اشکال ہے، جبکہ دوسری پر بحمد اللہ اطمینان ہے اور وہ حیلہ متعارفہ کا نعم البدل کہ طالب علم پر آنے والے مجموعی اخراجات طالب علم کے ذمہ واجب الاداء ہوں، اور چونکہ وہ غیر مستطیع ہے اس لئے زکوٰۃ کی مد سے اتنی نقد رقم یا اس کا چیک طالب علم کو دے دیا جائے اور وہ اپنے اوپر عائد قرض کی ادائیگی میں اس کو داخل مدرسہ کر دیا کرے۔

اول الذکر صورت کہ مدرسہ کا مہتمم خود ہی اتنی مقدار مد زکوٰۃ سے ادا کر دیا کرے، یہ محل اشکال اس وجہ سے ہے کہ اس کی بنیاد مہتمم ادارہ کو مستحقین کا ہر اعتبار سے وکیل تسلیم کرنے کے نظریہ پر قائم ہے، جو بجائے خود محل نظر ہے۔

مہتمم طلبہ کا وکیل ہے یا زکوٰۃ دہندگان کا؟

اس سلسلہ میں کل تین احتمالات ہیں: صرف زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے، صرف طلبہ کا وکیل ہے، دونوں کا وکیل ہے، عام علماء کرام کا رجحان یہی ہے کہ ہمارے ملک کے مدارس جو عوامی چندوں سے چلتے ہیں ان کے ارباب انتظام صرف مالکین اموال کی طرف سے زکوٰۃ کا مال مصرف پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں وکیل ہیں اور مستحقین کے نائب یا وکیل نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا یہی خیال ہے (دیکھئے: معارف القرآن ۲۹۹، ۳۰۰)۔

لیکن اس صورت میں کئی اشکالات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ مہتمم اس کو دوسرے اموال میں خلط کر دے تو آہٹ لاک کی وجہ سے اس کی ملک ہو جانا چاہئے اور جو کچھ خرچ کرے گا وہ اس کی جانب سے تمہرے ہوگا اور معطلی کے لئے اتنے کا ضامن۔



- ۲- معطی جب مر جائے گا اور مال مہتمم کے قبضہ میں بدستور باقی ہو تو اس مال کا اس کے ورثہ کی طرف لوٹانا واجب ہوگا جن کی تلاش و جستجو اس کی ذمہ داری ہے۔
- ۳- جب رقم ارباب اموال کی ملک ہے تو جس معطی نے زکوٰۃ کی رقم مثلاً نصاب یا اس سے زائد مقدار میں دی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ بھی مالکین پر لازم ہونی چاہیے، کیوں کہ وکیل کا قبضہ خود موکل کا قبضہ ہے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ صرف طلبہ اور مستحقین کا وکیل قرار دیا جائے تو اس صورت میں مال کا مہتمم کے قبضہ میں آجانا کو یا طلبہ کے قبضہ میں آجانا ہے اور وہ ان کی طرف سے ہر ایسے کام میں خرچ کرنے کا مجاز ہوگا، جس میں کسی بھی اعتبار سے طلبہ کا فائدہ ہو۔
- لہذا تملیک کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اسی طرح طلبہ کی خوراک، پوشاک یا نقد کی صورت میں مالک بنانے کے علاوہ تنخواہ ملازمین، مدرسہ کی تعمیر وغیرہ دوسری مدات میں صرف کرنے کا بھی جواز ہوگا اور حیلہ متعارفہ جیسے بے کار عمل سے نجات مل جائے گی۔
- لیکن اس میں ایک زبردست اشکال یہ رہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ یا آپ کے بعد اسلامی بیت المال میں جو زکوٰۃ وصول ہو کر آتی تھیں، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مصارف ثمانیہ میں خرچ کیا جاتا تھا، حالانکہ امیر المؤمنین کی ولایت عام ہونے کی وجہ سے فقراء اور مستحقین کی طرف سے امام کو یقیناً وکالت و نیابت دلائل حاصل تھی، امام کا قبضہ خود مستحقین کا قبضہ تھا، کو یا کہ مستحقین نے قبضہ کر کے امام کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار دے دیا تھا پھر بھی عہد نبوی ﷺ، عہد خلفاء راشدین یا قرون اولیٰ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ صدقہ واجبہ کی رقم رفاہ عام کے کاموں یا عاملین کے علاوہ ہر کاری ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کی گئی ہو، بلکہ اس کے برعکس اوداؤ شریف میں ایک مرفوع حدیث ہے جس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ ہر چند کہ زکوٰۃ پر امام کا قبضہ مستحقین کا قبضہ ہے، لیکن ان کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے اور ان کے علاوہ کسی اور

جگہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

”فأناہ رجل فقال: أعطنی من الصدقة فقال رسول اللہ ﷺ: إن اللہ لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ من الصدقات حتی حکم فیہا ہو فجزأها ثمانية أجزاء فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك“ (سنن ابی داؤد، ۲۳۰)

(ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ صدقات میں سے مجھے بھی دیا جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ صدقات کی بابت کسی نبی یا غیر نبی کے فیصلہ پر راضی نہیں بلکہ خود اس نے مصارفِ زکوٰۃ کی آٹھ قسمیں کر دی ہیں، اگر تو ان میں ہے تو میں دے سکتا ہوں (ورنہ نہیں))۔

لہذا جب اسلامی بیت المال کے ذمہ دار کو یہ حق نہیں تو آج کے مدارس کے نظماً کو کیوں کر یہ حق پہنچے گا کہ غیر مصرف میں زکوٰۃ صرف کر ڈالیں۔

اس لئے تیسری صورت متعین ہو جاتی ہے کہ نہ ہر اعتبار سے مہتمم معطلی کا وکیل ہے اور نہ ہر اعتبار سے طلبہ اور مستحقین کا، بلکہ بعض بعض پہلوؤں سے ہر دو کے نائب اور وکیل کا درجہ رکھتا ہے، مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے پہلی صورت کے تحت مذکورہ اشکالات کے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے (دیکھئے تذکرۃ الرشید، ۱۶۳، ۱۶۵)۔

یہی بات مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مولانا اشرف علی صاحب کے ایک اشکال کے جواب میں کہی ہے:

”عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطیین اور آخذین کی طرف سے دکلاء ہیں، لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں“ (فتاویٰ ہامیلیہ، ۳۸۱، امداد الفتاویٰ، ۲۶۶/۶، فتاویٰ لمدادیہ موسوم بفتاویٰ اشرفیہ، ۳۸۱/۳ میں

حضرت تھانوی اور مولانا فاضل احمد صاحب کے مفید طبعی کا تبت ہیں جن سے بہت سے اشکالات رفع ہو جائے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ارباب مدارس لوگوں کی زکوٰۃ وصول کر کے مصرف میں خرچ کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور نہیں ہیں، جیسا کہ امیر المؤمنین مامور ہے، بلکہ وہ ادارہ چلانے کے لئے مالکین اموال سے صدقات وصول کرتے ہیں اور دینے والے حضرات صراحتاً انہیں مصرف پر خرچ کرنے کا وکیل بنا دیتے ہیں، دوسری طرف ظاہر ہے کہ مستحقین نے صراحتاً اپنا وکیل بنایا نہیں، لیکن چونکہ احیاء دین کی خاطر مدارس کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اور ان کا انحصار ان ہی صدقات و عطیات پر ہے، اس لئے بر بنائے ضرورت ارباب انتظام کو (جن کا انتخاب ارباب حل و عقد کے مشورے سے ہوتا ہے اور عوام و طلبہ عرفان کے اہتمام کو تسلیم بھی کرتے ہیں) امیر المؤمنین کے قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے، تاکہ وہ پیچیدگیاں لازم نہ آئیں جو پہلی صورت کے ذیل میں بطور اشکال ذکر کی گئیں اور قاعدہ ہے: ”الضرورات تقدر بقدرها“۔

لہذا جس قدر ضرورت داعی ہوگی اسی قدر ان کو فقراء کا نائب تسلیم کیا جائے گا، اور یہاں ضرورت صرف اس قدر ہے کہ مال معطی کی ملک سے نکل جائے، تاکہ ان کے مرنے پر ورثہ کی طرف واپسی لازم نہ ہو، خلط (جس سے بچنا عادتاً ناممکن سا ہو گیا) کی وجہ سے استہلاک نہ لازم آئے، اسی طرح اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہو، نیز زکوٰۃ وصول کر کے لانے والوں کو عالمین کی طرح زکوٰۃ میں اجرت دینا جائز ہو جائے، باقی تصدقات ضائع کر دینے کی صورت میں ضامن ہونے کی بابت اور مصارف پر صحیح طریقہ سے خرچ کرنے کی بابت وہ لازماً معطیین یعنی مالکین ہی کے وکیل ہوں گے نہ کہ طلبہ کے۔

مدارس کے سفراء ”العالمین“ کے مصداق ہیں؟

مدارس کے سفراء جو وصولی صدقات کے لئے بھیجے جاتے ہیں ”العالمین علیہا“ کے مصداق ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں، مگر اپنی ناقص معلومات کی حد تک

ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ کہ ضرورتاً انھیں بھی عاملین کا مصداق قرار دینا چاہئے جیسا کہ ضرورتاً مہتمم کو بعض پہلوؤں سے امیر المؤمنین یا عمال کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اس وجہ سے اس راہ کی بہت سی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں، مثلاً یہی کہ باضابطہ تنخواہ پر سفراء کا تقرر کرنے میں بسا اوقات ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے، آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زیادہ آتا ہے، اب اگر ان کو عاملین کے تحت داخل مانا جائے گا تو ان پر عامل کے احکام آئیں گے اور عامل کو اتنی ہی مقدار دی جاتی ہے جو اس کے وصولی پر جانے اور لوٹنے کی درمیانی مدت میں اس کی جملہ ضروریات کی اوسط طریقہ پر کفایت کر سکے اور ساتھ ہی اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اجرت اس کی وصولی کی ہوئی رقم کے نصف سے بڑھنے نہ پائے ورنہ کمی کی جائے گی (روح المعانی ۱/۱۲۱، تفسیر الخازن ۱/۹۱۳)۔

چنانچہ جب سفیر کو اس کی فکر ہوگی کہ اگر مجھ سے صدقات کی وصولی کم ہوئی تو لازماً میرے اوسط درجہ کے اخراجات وصول شدہ رقم کے نصف سے بڑھ جائیں گے اور اس میں میرا نقصان ہوگا، تو وہ زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرے گا، اس صورت میں بہر حال آمد کا تناسب اخراجات سے زیادہ ہوگا، ہمارے اس خیال کی تائید مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے (دیکھئے: کفایت المفتی ۳/۲۶۹)۔

واضح رہے کہ عاملین کے مصداق صرف مصلیٰ اور سفراء ہی ہو سکتے ہیں وہ عملہ نہیں جو حساب آمد و خرچ کے اندراج پر مامور ہیں، کیونکہ قرون اولیٰ میں کہیں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وصول کر کے لانے والے کے علاوہ محرر بیت المال، محافظ وغیرہ کو صدقات میں سے تنخواہ دی گئی ہو۔

### کمیشن پر زکوٰۃ کی فراہمی

فقہ حنفی کے اصول بیوع و اجارات کی رو سے ہر ایسا معاملہ جس میں معقود علیہ یا اس کا

بدل مجہول ہونا جائز ہوتا ہے، چنانچہ مذکورہ مسئلہ میں بھی اسی علت کے باعث اہل علم باکمال ارباب افتاء عدم جواز کا فتویٰ دیتے آئے ہیں، کمیشن پر چندہ کرانے میں جو امور عدم جواز کے متقاضی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- اجرت مجہول ہے، کیونکہ کمیشن وصولی کے تناسب سے ہوگا، معلوم نہیں وصولی زیادہ ہوگی یا کم، اگر اتنی کم ہوئی کہ جس کے کمیشن سے اس کا سفر خرچ وغیرہ بھی نہ نکل پائے تو یہ مستقل باعث نزاع ہے کہ سفیر فرامی چندہ کے لئے دردر کی ٹھوکریں کھائے اور نتیجہ صفر ہو، لہذا منتظم سے الجھنا عین ممکن ہے، اسی طرح وصولی اتنی زیادہ کر کے لایا کریں کہ اس کا کمیشن ہی پچیس تیس ہزار تک پہنچ جاتا ہے تو منتظمین کی نیتیں ڈگمگانے لگتی ہیں، یہ محض احتمال نہیں، بلکہ ایسے واقعات رونما ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

۲- جب سفیر عامل صدقہ کے حکم میں ہے تو اس کے اوپر اخراجات میں میانہ روی برتنا اور اسراف و تقصیر (فضول خرچی و تنگی) سے اجتناب لازم ہوگا، فضول خرچی سے اس لئے کہ یہ مال فقراء کا ہے اور جو کچھ بطور حق الخدمت اسے دیا جاتا ہے وہ ضرورت اور ضرورت کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جاتا ہے، اور تنگی سے اجتناب اس لئے لازم ہے کہ خود خسارہ میں نہ پڑے اور بعد کو بدل ہو کر یہ کام ہی چھوڑ دے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

”علی الإمام أن یبعث من یرضی الوسط من غیر إسراف ولا تقصیر“

(روح المعانی ۱۲۱/۱)۔

زیر بحث مسئلہ اگر سفیر کے ہاتھوں چندہ کم ہوگا تو تہذیر کا مرتکب ہوگا، جو فقراء کی حق تلفی ہے، اگرچہ برابر بھی صورت ہو سکتی ہیں، لیکن پہلے دونوں امکانات اس کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور فقہی قاعدہ ہے: ”درء المفسد اولیٰ من جلب المنافع“ (المدخل للفتاویٰ العام للورقاء

۹۸۵/۲)۔

عدم جواز کی پہلی علت کے سلسلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں جہالت ایسی نہیں جس سے لازماً نزاع اور جھگڑا پیدا ہو اور جہالت وہی مضر ہے جو مفصی الی النزاع ہوتی ہے، چنانچہ بہت سے معاملات جس میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہوتا ہے، مگر اس کی جہالت باعث نزاع نہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتراض نہیں اور وہ معاملے جائز ہیں، مثلاً مزاحمت (بٹائی)، درختوں پر پھلوں کی بیج جو لازماً مجہول ہوتے ہیں اور مضاربت وغیرہ۔

لیکن ان معاملات کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ لوگوں کی عام ضروریات ان سے وابستہ ہو گئی ہیں اور ان کا عرف و تعامل بن چکا ہے، اس لئے ان کی جہالت کسی کے لئے قابل اعتراض نہیں ہوتی اور کوئی نزاع نہیں ہوتا، مگر جب تک ان میں عرف نہیں ہوتا تب تک دو چند اشخاص اگر اس قسم کے معاملات کرتے ہیں چاہے ان میں بالفعل منازعت نہ بھی ہو تب بھی وہ معاملے ناجائز کہے جاتے ہیں۔

گویا زیر بحث مسئلہ میں بھی اجرت کی جہالت باعث نزاع اسی وقت نہیں ہوگی جب اس کا عرف و تعامل ہو جائے، ورنہ انکا دکھا اشخاص اور دو چند اداروں کے ذمہ دار جو اس طرح کا معاملہ کریں خواہ بالفعل ان میں جھگڑا رونما نہ بھی ہو تب بھی معاملہ ناجائز ہی کہا جائے گا، الا یہ کہ اس مسئلہ میں بھی عام ضرورت اور عرف و تعامل معتبر حد تک تسلیم کر لیا جائے جو محل نظر ہے۔ جیسا کہ عرف کی تعریف ”هو عادة جمهور قوم فی قولٍ أو فعلٍ“ (المذلل العن العام ۴/۸۳۰) سے کی گئی ہے۔

رعی عدم جواز کی دوسری دلیل تو اپنی جگہ پختہ ہے، اس لئے مسئلہ کا حل اسی میں ہے کہ اگر سفیر کو عامل صدقہ کا مصداق قرار دیا جاتا ہے تو اجرت بھی اسی طرح دی جائے جس طرح عامل کو دی جاتی تھی۔

## کمیشن پر چندہ

مولانا محمد عبید اللہ اسعدی ☆

”کمیشن پر چندہ“ کے سوال و موضوع کے تحت اس مقالہ میں جن بنیادی نکات و مباحث کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ ہیں:

- ۱- حدیث قفیز طحان۔
- ۲- ایسے معاملات میں حرمت کی بنیاد۔
- ۳- استثنائی صورتوں کی بنیاد۔
- ۴- زیر بحث مسئلہ میں استثنائی بنیاد کی تلاش۔

### حدیث قفیز طحان

”قفیز طحان“ والی حدیث سے مراد وہ حدیث ہے جس میں آنا پیش کر اس کی اجرت میں اسی آٹے کے ایک حصہ کو لینے سے منع کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ حدیث اس لئے زیر بحث آتی ہے کہ اگرچہ اس میں ایک خاص شکل کا حکم ذکر کیا گیا ہے، لیکن وہ اجارہ کے باب سے تعلق رکھتی ہے اور فقہاء نے اسے ایک اصل فقہی حیثیت دی ہے، اسی لئے ملتے جلتے مسائل میں فقہاء کے یہاں اس کا تذکرہ آئی جاتا ہے۔

☆ جامعہ عربیہ اسلامیہ، سکریٹری برائے سمینار و مباحث اسلامیہ، فقہ اکیڈمی انڈیا۔

صاحب ہدایہ نے ایسے مسائل پر کلام کرتے ہوئے اس کی بابت فرمایا ہے:  
 ”ہذا أصل كبير يعرف به فساد كثير من الإجازات لاسيما في ديارنا“  
 (ہدایہ مع فتح القدير ۲۸/۸، ۲۸/۸، ۲۸/۸، اجازات، نیز ملا حظہ ہو: ہبوط نرسی، ۹، بدائع الصنائع ۳/۳۳، ۱۰۳،  
 لا شاہ ۱۰۳)۔

(یہ ایک اہم و بڑی اصل ہے جس کی روشنی میں خاص طور سے ہمارے علاقہ کے بہت  
 سے اجارہ کے معاملات کے فساد کو معلوم کیا جاسکتا ہے)۔  
 فقہاء احناف نے اس سے جو قاعدہ اخذ کیا ہے جسے اس قسم کے جزئیات پر جاری کیا  
 ہے، صاحب الفقہ اسلامی نے اس کو بایں الفاظ تعبیر کیا ہے:

”تعیین الأجر مما يعمل فيه الأجير مفسد للعقد“ (فقہ اسلامی ۳/۳۸، ۷،  
 اس ضمن میں ایک دوسرا قاعدہ بدائع میں آیا ہے، ان لا یستفیع الأجر بعلمه جسے اجارہ کی شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے  
 بدائع ۳/۵۱، ۳، ۵۱، ۳، ۵۱، ۳، ۵۱)۔

(مزدور جو کام کرے اسی سے اس کے لئے مزدوری کا طے کرنا عقد کے لئے مفسد ہوتا  
 ہے)۔

### تاکلمین جواز

تفہیم طحان کے باب میں جواز کا نقطہ نظر رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں:  
 ۱- حدیث ”تفہیم طحان“ ضعیف اور غیر لائق احتجاج ہے ”المغنی“ میں ذکر کیا ہے:  
 ”هذا الحديث لا عرفه ولا يثبت عندنا صحته“ (المغنی ۵/۱۲، حدیث کی تفہیم  
 کی بابت تفصیل کے لئے ملا حظہ ہو، ”صفا“ شمارہ ۶ و ۷، جزر الطائمین ۵-۷)۔

۲- سند احسن اور لائق احتجاج بھی ہو تو معلول ہے، اس لئے کہ اکثر راویوں نے اس  
 کو ابو سعید خدری کے قول کی حیثیت سے یا مجہول کے صیغہ سے روایت کیا ہے۔



## مانعین جواز

۱- یہ حدیث اگر ضعیف بھی ہو تو، جب اس مسئلہ سے متعلق کوئی دوسری نص یا حدیث موجود نہیں ہے جو کہ اس کے خلاف ہو، زیادہ سے زیادہ قیاس ہے۔

حنفیہ و حنابلہ کے اس اصول کے مطابق کہ ضعیف حدیث قیاس پر مقدم ہوتی ہے، اس پر عمل کریں گے، بیشک صاحب ”المغنی“ نے اس کو نہیں جانا، لیکن بقول صاحب ”اعلاء السنن“:

قد عرفہ ابن عقیل والمارقطنی والبیہقی و عبد الحق فی احکامہ  
و کفی بہم قلوۃ و العارف حجة علی من لم یعرف“ (ایضاً: ۱۶۵/۱۷۷)۔

نیز امام طحاوی و امام محمد و مسدد بن مسدد و ابو یعلیٰ وغیرہ، جیسے ائمہ حدیث اس سے واقف ہیں ان سب نے اس کو روایت کیا ہے۔

صاحب ”المغنی“ نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے جو اس کو مستلزم نہیں کہ یہ ضعف کے ساتھ بھی ثابت نہیں، اور حدیث ضعیف خود حنابلہ کے یہاں حجت ہے، پھر یہ کہ ائمہ اثنی عشر کو صاحب ”المغنی“ کی اس بات سے اختلاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث لائق احتجاج ہے اور حسن لذاتہ سے کسی طرح کم نہیں ہے، (زجر الاصلین ۳۱، ۳۲، ۳۹) اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے:

الف- امام محمد نے ”کتاب الاصل“ میں، مسدد بن مسدد، نیز ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی مسانید میں، امام طحاوی نے ”مشکل الآثار“ میں، دارقطنی و بیہقی نے اپنی اپنی سنن میں اس کو روایت کیا ہے۔

ب- یہ حدیث موصولاً و مرسلماً اور مرئوفاً و موقوفاً ہر طرح مروی و ثابت ہے، موقوف یوں ہے کہ دارقطنی و بیہقی وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، اگرچہ ان کے الفاظ ایسے ہیں کہ اصولاً حدیث کو مرئوفاً ماننے کی گنجائش موجود ہے، اس کے مقابلہ میں امام محمد، مسدد بن مسدد اور امام طحاوی نے حضور اکرم ﷺ کے

نام کی تصریح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مرسل یوں ہے کہ مسدود بن مسرہ نے حضرت ابو سعید خدری کا نام چھوڑ دیا ہے، باقی سب نے صحابی راوی کا ذکر کیا ہے، اگرچہ امام طحاوی کے یہاں نام کے بجائے ”عن بعض اصحاب النبی“ کا لفظ آیا ہے۔

ج۔ اس کے روایت میں صحابہ میں ابو سعید خدریؓ اور تابعین میں عبد الرحمن ابن ابی نعم ہیں، اور ان سے روایت کرنے والوں میں ہشام ابو کلیب نیز عطاء ابن السائب ہیں، اکثر طرق میں ہشام ہی آئے ہیں اور انہیں پرکلام ہے، انہیں کی وجہ سے دارقطنی وغیرہ کی روایت پر کلام ہے۔

ان کا معاملہ یہ ہے کہ امام احمد، ابن حبان و ابن شاہین نے ان کو ثقہ کہا ہے، (کتاب البحر والتمدیل لابن ابی حاتم ۵/۶۳، ۶۵، ۶۸) امام بخاری و دوالابی نے ان کے تذکرہ میں جرح سے سکوت کیا ہے، (تاریخ البخاری الکبیر ۸/۱۹۵، الکنی للذوالابی ۲/۸۹) اور اگر یہ ہشام بن عائد اسدی ہیں جیسا کہ مزنی و ابن حاتم (تہذیب الکمال ۳/۱۳۳، کتاب البحر لابن ابی حاتم ۵/۶۳) کی تصریحات سے سمجھ میں آتا ہے تو وہ بالاتفاق ثقہ ہیں، اور صحاح ستہ میں نسائی کے معروف راوی ہیں۔

پھر یہ کہ جب کسی راوی کی بابت ائمہ فن کا اختلاف ہو جائے تو اس کی روایت درجہ حسن میں شمار کی جاتی ہے، جیسا کہ ابن قطان و منذری و سیوطی وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے (اعلاء السنن مقدمہ)۔

د۔ رفع و وقف وغیرہ کا اختلاف اس وقت عیب ہے اور حدیث کو معلول بنا دیتا ہے جب کہ ترجیح و تطبیق ممکن نہ ہو، اور مقابلہ میں معتمد مرفوع روایت موجود ہو، ورنہ مذاہب اربعہ میں موقوف حدیث حجت ہے، اور امام شافعی جو کہ مرسل کے بارے میں سخت موقوف رکھتے ہیں، وہ بھی بعض شرطوں کے ساتھ مرسل پر عمل کو درست کہتے ہیں، (نہج الفکر ۵۲، اعلاء السنن ۱/۸۵) اور

اکثر نیز ثقات کی روایت مرسل نہیں، بلکہ موصول ہے، جیسے کہ اکثر کی روایت مرفوع بھی واقع ہوئی ہے۔

۵۔ جن لوگوں نے اپنی کتابوں میں اس حدیث کو بغیر کسی تنقید کے روایت و نقل کیا ہے، انہوں نے دلائل اس کی تحسین و تصحیح کی ہے، بالخصوص عبدالحق اشبیلی، اس لئے کہ ان کا سکوت حجت شمار ہوتا ہے، (الرسالۃ المستطرفة، ۱۷۹) بقیہ لوگوں میں اصل روایت کرنے والوں کے علاوہ امام بغوی، زیلعی و علامہ عینی وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے ائمہ فن و محققین نے صراحتاً بھی تصحیح و تحسین کی ہے، مثلاً حافظ ابن حجر، قاسم بن قطلوبغا، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا تقی دیوبندی، مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری و مفتی سعید احمد سہارنپوری مع بعض علماء دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپوری اور اخیر میں شیخ ناصر الدین الالبانی (الطالب العالیہ، ۲۰۰۱، حدیث ۱۳۲، مع حاشیہ اشعریف والاخبار ۲/۱۳۸، اعلاء السنن ۱۶/۱۷۱، ارواء الغلیل ۵/۳۹۵-۳۹۷، صحیح جامع صغیر ۶/۶۸)۔

نیز اصولی طور پر تعدد طرق کی وجہ سے ان روایات کو ایک دوسرے سے تقویت ہے، اور اس کی وجہ سے یہ روایات ”حسن لھیرہ“ کے درجہ کی تو قرار پائیں گی ہی، حافظ ابن حجر نے مسند مسدد کی روایت کو ”حسن لذاتہ“ قرار دیا ہے، اگرچہ وہ مرسل ہے (الطالب العالیہ مع حاشیہ ۲۰۰۱)۔

### حدیث کی صحیح تفسیر

تاکلمین جواز کی طرف سے حدیث کا مفہوم تو یہی ذکر کیا گیا ہے کہ اجرت کی مقدار طے نہ کی جائے (لفظہ الاسلامی وادلتہ ۳/۸۳۸، نیل الاوطار ۷/۳۲، بدیۃ المجتہد ۲/۱۶۹) جیسے کہ ایک تفسیر یہ ہے کہ جو گیہوں پینا ہو اس کی مقدار معلوم نہ ہو (تخصیص لھیرہ ۳/۶۹)، لیکن ایک تفسیر اس کی عبداللہ

ابن مبارک سے یہ نقل کی گئی ہے کہ آدمی آنا پینے کی کچھ اجرت نقد متعین کر کے طے کرے اور آٹے کی ایک مقدار بھی طے کرے۔

”صورتہ أن يقال للطحان أطحن بكذا و كذا و زيادة قفيز من نفس الطحن“ (تفہیم البیہر ۶۹/۳، اعلاء السنن ۱۶/۱۶-۱۷)۔

یہ تفسیر اس لئے راجح بلکہ امام طحاوی کے بیان کے مطابق متعین ہے کہ دیگر تفاسیر کا اصل تاویل کون ہے معلوم نہیں، (المصنوع فی معرفۃ الموضوع ۸۳، تعلیقات الشیخ عبدالفتاح) ابن مبارک جیسے امام کی تفسیر ہے، (مشکل الآثار ۲/۳۰۷) ابن مبارک اس حدیث کے راوی بھی ہیں، اکثر حضرات نے ان کے طریق سے روایت لی ہے یا حوالہ دیا ہے، اور قاعدہ ہے کہ راوی کی تفسیر کو دوسروں کی تفسیر پر ترجیح ہوتی ہے، امام طحاوی نے مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے کہ ہم نے علماء کو اس حدیث کے اس مفہوم پر متفق پایا ہے (مشکل الآثار ۲/۳۰۷)۔

### حرمت و ممانعت کے عقلی وجوہ

کتب فقہ میں اس صورت اور اس جیسی صورتوں کی ممانعت کی مختلف عقلی وجوہ ذکر کی گئی ہیں، امام طحاوی نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی جب گھونٹ پینے کو دے کر آٹے کی ایک مقدار کا اجرت میں دینا طے کرے گا تو معاملہ کرتے وقت آنا اور اجرت موجود نہ ہوگی، اور اس کی وجہ سے آدمی معاملہ کرتے وقت طے شدہ اجرت کے ادا کرنے سے عاجز ہوگا، آنا پینے کے بعد ہی اس پر قاور ہوگا (حوالہ سابق، اعلاء السنن ۱۶/۱۶-۱۷)۔

دوسری وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ اس صورت میں آدمی اپنے ہی عمل اور اپنی محنت کے نتیجے کو اپنے عمل و محنت کی اجرت کے طور پر طے کرتا ہے، اور قاعدہ ہے ”تعیین الأجر مما يعمل فیہ الأجر مفسدة للعقد“ (فتاویٰ اسلامیہ وادانہ ۲/۷۸) نیز اجارہ کی صحت کی ایک شرط ہے:

”ان لا ینتفع الأجير بعمله“ (بدائع ۱۹۲/۳)۔

ایک وجہ یہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ اجارہ کا تعلق اگر کسی ایسی چیز سے ہو جو کہ کام لینے والے اور مزدور دونوں کے درمیان مشترک ہو یا ہو جائے تو اجارہ صحیح نہیں ہوتا، یہاں آٹے کو اجرت میں طے کرنے پر آنا پینے کے بعد یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے (بدایین فتح القدیر ۵۰/۸-۵۱)۔ اور اگر آٹے کی مقدار طے نہ کی جائے تو اجرت میں جہالت ہوگی، یہ ایک اہم نکتہ ہے، اسی انداز کی مختلف علتیں ایسے معاملات میں ذکر کی جاتی ہیں جن میں سے اول و آخر کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور بعض کا حل نکالنے پر بعض باقی ہی رہتی ہیں۔

### ج- استثنائی صورتیں اور ان کی بنیاد

دوسرے قواعد و کلیات کی طرح ”تفیز طحان“ کے باب میں بھی استثنائی جزئیات ملتے ہیں، کہ جن میں جواز کا حکم ہے، جیسے جانور کی بٹائی، کھیتی کی کٹائی وغیرہ کی اجرت میں اسی کا ایک حصہ دینا، سوت سے دھاگہ تیار کرانے پر اس کا حصہ اجرت میں دینا، نیز مضاربہت ہزارعت، یہ سارے مسئلے حنفیہ کے یہاں تو نہیں ہیں، مگر فقہاء کے یہاں ہیں۔

ان استثنائی جزئیات کی جو بنیاد احقر کی سمجھ میں آسکی ہے اور جس کی تصریح بھی مل جاتی ہے، وہ ہے تعامل اور ضرورت، بالخصوص معاملات کے باب میں تعامل کی اہمیت اور شریعت کی طرف سے اس کا اعتبار اور عایت معروف ہے، بیع سلم وغیرہ کی بنیاد اسی پر ہے، اور تعامل کی وجہ سے معاملہ کسی قدر جہالت بھی ہو جو کہ عام حالت میں عقد کے لئے مفسد ہوتی ہے، تو وہ بھی کو ارا کر لی جاتی ہے اور تعامل و ضرورت میں اصل تعامل ہی ہے، ضرورت تو تعامل کی وجہ سے اس بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ تعامل کا مطلب ہے عام عمل، دوسری شکل مروج نہیں ہوتی تو ضرورت مند آدمی اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور یہ مجبوری کا حال گنجائش پیدا کر دیتا ہے۔

## د- کمیشن پر چندہ اور تعامل

اگرچہ اس وقت چندہ کی اجرت کے طور پر ”کمیشن“ کو ہی طے کرنے کا رواج بہت ہو گیا ہے، لیکن کم از کم مدارس و دینی حلقوں میں اس کی حیثیت تعامل و عرف کی نہیں ہے، نہ عرف عام کی اور نہ عرف خاص کی، اور ظاہر ہے کہ فقیر طحان کے استثنائی مسائل میں اصل بنیاد تعامل ہے، اس لئے چندہ میں کمیشن کے جواز کی بنیاد اس کو بنانا درست نہیں ہے، اور جائز کہنے والوں کے نزدیک بھی اصل بنیاد یہی ہے باقی امور ضمنی ہیں۔

معاملہ یہ ہے کہ عرف و تعامل کی ایک خاص حقیقت ہے، اس کے بغیر ان کے ثبوت کا دعویٰ درست نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ عرف و تعامل ایک قسم کا اجماع ہے (ملاحظہ ہو: المدخل الفقہی اجماع للمدقق المصداق الشرعی فیما لا یصل فیہ، عبد الوہاب خلاف وغیرہ میں مباحث عرف، اس سلسلہ میں علامہ شامی کی عبارت ملا حظہ ہو: إلا أن یسکون کملک من الناس کلا فی البلدان کلھا فیکون إجماعاً، والإجماع حجة“ (۵۱ ص ۱۳)، جس کی دلیل ہمارے بعض فقہاء کا ”احسان بالتعامل“ کے لئے ”احسان بالاجماع“ کی تعبیر کو اختیار کرنا ہے، اگرچہ اس کے لئے اجماع اصطلاحی کی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک فرد بھی مخالف نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ خلاف کرنے والے کی حیثیت شذوذ و شاذ کی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان ۷۵ اور ۲۵ کا تناسب تو دور کی بات ہے ۹۰ اور ۱۰ کا تناسب بھی کافی نہ ہوگا، بلکہ ۹۹ اور ۱ یا ۹۸ اور ۲ کا تناسب درکار ہوگا، اور بعض اوقات یہ شرح اس سے بھی کم ہو سکتی ہے۔

اور تحقیق کرنے پر چندہ میں کمیشن کو اجرت بنانے والوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ ۹۰ اور ۱۰ کا نکلے گا، اس سے زیادہ نہیں، اور یہ تعامل کے تحقق کے لئے کافی نہیں ہے، اس لئے کہ سو میں دس کی تعداد اتنی کم نہیں ہے کہ اسے ”شذوذ و شاذ“ کہا جاسکے، اور پھر یہاں اجماع بہ مفہوم تعامل کا اعتبار کر لیا جائے اور ضرورت و ابتلاء عام کی وجہ سے جواز کے قول کو اختیار کر لیا جائے،

نیز ایک بات یہ بھی ہے کہ عرف و تعامل کی تعریف میں ایک قید یہ بھی ذکر کی گئی ہے۔

”تلقته الطباع السليمة بالقبول“ (رسائل ابن مابدين ۱۱۲/۲، الاشباہ ۹۳)۔

اور اس کے مفہوم کی وضاحت بعض دوسرے حضرات کے ان الفاظ سے ہوتی ہے:

”ولم ينكره أصحاب الذوق السليم في الجماعة“ (اصول مذہب الامام احمد

للدكتور الرزقي ۵۲۲، بحث و نظر شماره ۳ صفحہ ۲۳)۔

یعنی جماعت کے ذوق سلیم رکھنے والے حضرات اس پر ناگواری کا اظہار نہ کرتے

ہوں۔

حضرت تھانویؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

”تعامل ایک قسم ہے اجماع کی، اور اس میں شرائط اجماع کا پایا جانا ضروری ہے،

مجموعہ ان کے یہ ہے کہ علما عصر بلائیں اس کو قبول کر لیں“ (امداد الفتاویٰ ۳۲/۳، ۳۲-۳۳)۔

یہ قید بھی اس مسئلہ میں مفقود ہے، اس لئے کہ اہل ذوق سلیم یہاں علماء ہی ہو سکتے ہیں،

یا توسع کریں تو دینی سوجھ بوجھ رکھنے والے اس کا مصداق ہو سکتے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ چندہ

میں کمیشن لینے کے جواز پر اکابر اہل علم کی طرف سے برابر انکار جاری ہے، میرے علم میں ملک

کے اکابر اہل افتاء میں سے کسی طرف سے اس سلسلہ میں جواز یا تاہید جواز کی کوئی چیز موجود نہیں

ہے، حضرت تھانویؒ، مفتی مہدی حسن صاحب، مفتی سعید احمد صاحب، شیخ الحدیث مولانا زکریا

صاحب، مولانا عبد الشکور لکھنویؒ، مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ (ملاحظہ ہو: زجر لٹا لیتیں، نیز امداد

الفتاویٰ ۳۶۳، فتاویٰ محمودیہ ۳۷۳) وغیرہ سب کا قول عدم جواز کا ہے، اور ملک کے مستند دینی

درسگاہوں کے ارباب افتاء کا رجحان یہی چل رہا ہے۔

مولانا تقی صاحب دیوبندی کے رسالہ میں جن صاحب کی تحریر جواز کی نقل کی گئی ہے وہ

یوں بھی معروف نہیں ہیں، اور فقہ و افتاء کے باب میں تو ان کا کوئی شمار نہیں ہے، ادھر جن دو ایک

حضرات کی تحریر جواز کی آئی ہیں اور جو اس وقت ایسے فقہی و تحقیقی کاموں میں معروف ہیں، ان کی بابت یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے اساتذہ اور حقیقت پسند رفقاء کی تائید نہیں رکھتے۔

بہر حال اس مسئلہ میں جواز کی جو اصل بنیاد ہے چونکہ وہ متحقق نہیں ہے، اس لئے اس کو فقیر طحان کے مستثنیٰ جزئیات میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

### احتیاط و کام کی نزاکت کا تقاضا عدم جواز

اب اس مسئلہ کو ایک دوسرے رخ سے دیکھئے، یہ تنہا میرا خیال نہیں بلکہ بعض اہل علم و ارباب افتاء سے مذاکرہ پر ان کو بھی موافق پایا، کہ اگرچہ دلائل کی رو سے یہ کمیشن جائز ہو، مگر سد ذرائع کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بڑے عواقب کی وجہ سے اس کو ممنوع ہونا چاہئے، ایسے عواقب جو کہ محض متوقع نہیں ہیں، بلکہ موجود و معروف ہیں، کمیشن پر چندہ کی وجہ سے کم از کم دو چیزیں عمومی طور پر سامنے آ رہی ہیں، ایک چندہ کرنے والوں سے متعلق اور دوسری چندہ دینے والوں کی طرف سے۔

الف- یوں تو چندہ کے کام میں وسعت پیدا ہونے کے ساتھ اس کام میں بے اعتدالیاں اور غلط کاریاں عام ہوتی جا رہی ہیں، لیکن کمیشن پر چندہ کے کام نے اس کام کے حدود و وقار کو بہت مجروح کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ ہے کہ کمیشن والوں کو فکر صرف اس کی ہوتی ہے کہ کچھ ملے، کسی طرح بھی اور کہیں سے، تاکہ ہمارا حق وجہہ بنے، اور نتیجہً جس طرح وہ چندہ دینے والوں کے ساتھ چمٹتے ہیں اور پیچھے پڑتے ہیں اور پھر بکثرت جس بے آبروئی کی نوبت آتی ہے اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اور بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ جن اداروں کی طرف سے ایسے لوگ جاتے ہیں اکثر نہ ان کی کوئی خاص حیثیت ہوتی ہے اور نہ ضرورت، تو اس طرح کام کرنے والے اپنا ہی کام بنائے جاتے ہیں، لہذا اس کے لئے ان کو کچھ بھی کہنے یا کرنے میں دریغ نہیں ہوتا اور نہ ملتے ملتے بھی ان کو کافی مل جاتا ہے۔



ب- دوسری طرف یہ کہ اس کام پر کام کے پیچھے مشقت قربانی کی وجہ سے اجرت کے جواز سے کون انکار کر سکتا ہے اور نہ کوئی کرتا ہے، مگر چندہ میں کمیشن کا عنوان و نام آنے سے عام اہل خیر حضرات جو پورے اخلاص و ہمدردی کے ساتھ مدارس و ضرورت مند اداروں کی مدد کرتے ہیں، ان کو سخت تنفر دیکھ رہا ہوتا ہے، اور چونکہ کمیشن پر چندہ کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اور اہل خیر حضرات کو بھی اس کا علم ہوتا رہتا ہے، تو اب نوبت یہ آگئی ہے کہ بکثرت چندہ دینے والے کام کرنے والوں سے دریافت کیا کرتے ہیں کہ کیا کمیشن ملتا ہے، اور بہت سے اہل خیر حضرات تو یہ کرنے لگے ہیں کہ اس تحقیق کے بعد ہی چندہ دیتے ہیں کہ اس ادارے میں کمیشن تو نہیں دیا جاتا؟ جن کے متعلق اطمینان ہو ان کو یا پھر معروف و مسلم اداروں کو چندہ دیتے ہیں، بعض نے جن علاقوں میں اس کا عام علم ہوا، ان علاقوں کے اداروں کا تعاون بند کر دیا ہے، حتیٰ کہ اس کی وجہ سے ایسے علاقوں کے محتاط اہل مدارس اپنی رسیدوں و اشتہارات میں اس کی صراحت پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہمارے یہاں کمیشن نہیں دیا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ چندہ دینے والے اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے ہیں، اور وہ اس لئے کہ ان کو یہ احساس و خیال ہے کہ ہم نے ادارے کو زکوٰۃ یا اپنی گاڑھی کمانی ادارہ کے طلباء و دیگر مصارف کے لئے دی اور اس کا ایک بڑا حصہ کمیشن کی صورت میں دوسری طرف چلا گیا، اور ان کا مقصد فوت ہو گیا۔

یہ دونوں ہی چیزیں اہم اور قابل لحاظ ہیں، اس لئے کہ عموماً مدارس کا کام چندوں سے چل رہا ہے، اور یہ دونوں باتیں اور ان کا بڑھتا ہوا رجحان اس تعاون کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہے اور اس سے بالخصوص ان چھوٹے اور نئے اداروں کا نقصان ہوگا جن کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ان کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں ہوتا تو کمیشن کی وجہ سے ان کو چندہ زیادہ مل جاتا ہے۔

---

## خلاصہ مقالہ بابت کمیشن پر چندہ

- ۱- کمیشن پر چندہ کے جواز و عدم جواز کے سلسلہ میں ایک بنیادی مستدل حدیث تفسیر طحان ہے، یہ حدیث ائمہ فن کی ایک جماعت کی نگاہ میں صحیح یا حسن ہے، لہذا الائق احتجاج ہے۔
  - ۲- رفع و وقف اور وصل و ارسال کے اختلاف کی وجہ سے اس کو معلول قرار دینا درست نہیں ہے، روایت ہر طرح ثابت ہو سکتی ہے اور ہے۔
  - ۳- استثنائی صورتوں میں جواز کی بنیاد و تعامل ہے۔
  - ۴- کمیشن پر چندہ کے سلسلہ میں تعامل اپنی حقیقت مطلوبہ کے ساتھ مفقود ہے۔
  - ۵- بعض ایسے عواقب جن کی وجہ سے اس تعاون کی صورت کے ختم ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے یا کم از کم ہونے کا، اور دونوں میں امت کا نقصان ہے، ان عواقب کی وجہ سے سداً للدرائع بھی ایسی چیزیں منع کی جاتی ہیں۔
- لہذا ان سب کی بناء پر اس کمیشن کو ناجائز ہونا چاہئے اور ہے۔

## نصاب زکوٰۃ

مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی ✽

نصاب زکوٰۃ میں قدر مشترک غنا اور مالداری ہے اور مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک ناداری اور افلاس، اس لئے اصل نصاب کے تعین میں دونوں کے مفاد کی رعایت ضروری ہے، تاکہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مالداروں پر غیر ضروری بوجھ بھی نہ پڑے، یہی وجہ ہے کہ احادیث مقدسہ میں مختلف اصناف، مختلف انواع کے اشیاء میں کم سے کم مقدار اور مالیت کی تعیین کر دی گئی ہے، جس کی موجودگی میں انسان صاحب نصاب اور مالدار سمجھا جاتا ہے، اور جنہیں فقہ کی متداول کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، یہاں اس تفصیل میں جانے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ موقع، بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مختلف اشیاء کا نصاب الگ الگ اقل حد کو پہنچ رہا ہو تو زکوٰۃ کی ادائیگی مقررہ اور متعینہ مقدار و تعداد میں کی جائے گی اور اسے ہی اصل مانا جائے گا۔

بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اشیاء موجود ہوں، مگر ان میں سے کوئی الگ الگ نصاب کی اقل حد تک نہ پہنچے یا اموال تجارت ہوں تو ایسے میں کیا کیا جائے، ضم نصاب میں کس کی رعایت کی جائے اور تقویم میں کسے معیار مانا جائے۔

اس سلسلہ میں دو اہم اصول فقہاء نے بیان کئے ہیں:

۱- پہلا یہ کہ تعیین نصاب اور ضم نصاب میں فقراء کی رعایت کی جائے گی اور دیکھا

جائے گا کہ نفع للفقراء کی صورت کون سی ہے، فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

”يقومها بما هو أنفع للمساكين احتياطا لحق الفقراء“ (ہدایہ ۲۷۹/۱)۔

فخر الدین عثمان بن علی زیلیعی لکھتے ہیں:

”ويعتبر فيهما الأنفع أيهما كان أنفع للمساكين“ (تمیین الحقائق ۲۷۹/۱)۔

”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدرا

ورواجا“ (ہندیہ ۱۷۹/۱)۔

۲- دوسرا اصول یہ ہے کہ تقویم میں تجزیہ کے باوجود اعتبار اس کا ہوگا، جس سے نصاب

کی تکمیل ہو سکے، بنا یہ میں ہے:

”لا بد أن يقوم بما يبلغ نصابا حتى إذا قومت بالدرهم تبلغ نصابا،

وإذا قومت بالذهب لا تبلغ نصابا، يقوم بالدرهم وبالعكس كذلك“ (ہدایہ علی

ہاشم ہدایہ ۱۷۵/۱)۔

”در مختار“ میں ہے:

”ولو بلغ بأحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به“ (در مختار ۲۱۴/۳)۔

صاحب ”ہدایہ“ اور کچھ دوسرے فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں اصول الگ الگ

نہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور نفع للفقراء کا مطلب ”يقومها بما يبلغ به نصابا“ ہے۔

(ہدایہ ۱۹۵/۱)

”تمیین الحقائق شرح کنز الدقائق“ میں ہے:

”واعتبار الأنفع مذهب أبي حنيفة ومعناه يقوم بها يبلغ نصابا“ (تمیین

الحقائق ۲۷۹/۱)۔

شمس الائمہ برحسی لکھتے ہیں:

”و عن أبي حنيفة رحمه الله تعالى في الأمالي أنه يقومها بأنفع النقادين للفقراء“ (بسوط ۱۹۱/۲)۔

بہر کیف ان دونوں اصولوں کے ساتھ اصل نصاب کی تعیین میں ایک اور بات خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اور اس سلسلہ میں واضح احادیث موجود ہیں۔

بدایۃ الجہد میں ہے:

”فإنهم اتفقوا على أنه خمس أواق لقوله عليه السلام: الثابت ليس فيهادون خمس أواق من الورق صلقة“ (بدایۃ الجہد ۱۸۶/۱)۔

اس کے برعکس سونے کے نصاب میں کافی اختلاف ہے جس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے صاحب بدایۃ الجہد لکھتے ہیں:

”وسبب اختلافهم في نصاب الذهب أنه لم يثبت في ذلك شيء عن النبي صلى الله عليه وسلم كما ثبت ذلك في نصاب الفضة“ (سابق حوالہ)۔

سوالات کے جوابات

۱- ان اقتباسات اور مباحث کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اصل نصاب چاندی کو قرار دیا جائے اس لئے کہ:

الف- یہ فقراء کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔

ب- سونے کی بہ نسبت سستی ہونے کی وجہ سے نصاب کی تکمیل آسانی سے ہو سکتی ہے۔

ج- اس کا نصاب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور فقہاء سب کے سب متفق ہیں۔

## ایک شبہ کا ازالہ

زیادہ سے زیادہ چاندی کے نصاب کو اصل تسلیم کرنے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مالداروں کی رعایت نہیں کی گئی ہے، حالانکہ معاملہ قطعاً ایسا نہیں ہے، صاحب ”فتح القدر“ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”إن المال كان في يد المالك ينتفع به زماناً طويلاً فلا بد من اعتبار

منفعة الفقراء عند التقويم“ (فتح القدر ۱/۱۶۶)

## معاصر علماء کی آراء

دوسرے فقہی سمینار میں کرنسی نوٹ کی زکوٰۃ پر معاصر علماء نے جو کچھ لکھا تھا اور جو فیصلے ہوئے تھے، اس کا حاصل بھی یہی تھا کہ اصل نصاب چاندی کو جانا جائے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”احکام زکوٰۃ میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ جس پہلو میں فقراء کو فائدہ ہو اس کو اختیار کیا جائے، اس لئے زکوٰۃ کی حد تک ان سکوں اور نوٹوں کیلئے اصل چاندی ہی ہوگی اور اتنی رقم کا مالک ہونے پر جس سے چاندی کا نصاب خرید کیا جائے زکوٰۃ واجب ہوگی“ (جدید فقہی مسائل ۲/۲۳۱)۔

مولانا عبدالرحیم لاچپوری کا بھی خیال یہی ہے:

”جتنے روپے میں ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکے، اتنے روپے کے مالک کو

صاحب نصاب قرار دیا جائے گا“ (فتاویٰ رحیمیہ ۳/۲۲۳)۔

۲- حرمت زکوٰۃ کیلئے کسی بھی نصاب کی مقررہ و متعین حد و مقدار کا مالک ہونا کافی ہے، خواہ الگ الگ مختلف چیزوں کا مالک ہو جو نصاب کے حد تک پہنچ جاتے ہوں، یا مجموعی طور پر وہ اتنی مالیت ان شرائط کے ساتھ رکھتا ہو جو وجوب زکوٰۃ کیلئے کافی ہوں، بہر صورت وہ غنی اور

---

صاحب نصاب قرار دیا جائے گا، زکوٰۃ لیما اس کے لئے حرام ہوگا، اور زکوٰۃ دینا واجب۔  
درمختار میں ہے:

”ولا یصرف الزکوٰۃ إلی غنی یملک قبلہ نصاب من آی مال کان“

(بخاری ۲۶۵/۳)

”وفی الغایة ولا یجوز دفع الزکاۃ إلی من ملک نصابا سواء کان من

النقود أو السوائم أو العروض“ (بخاری ۲۶۵/۳)۔

## احکام زکوٰۃ

مولانا محمد شعیب مفتاحی ☆

### محو راول

اموال زکوٰۃ اور ان پر وجوب زکوٰۃ کی شرائط

احکام زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ بحث کہ ”کس قسم کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟“ بڑی اہمیت کی حامل ہے، اسی طرح ان اموال پر وجوب زکوٰۃ کی شرائط کی بحث بھی نہایت اہم ہے۔

### اموال زکوٰۃ

جہاں تک اموال زکوٰۃ کا مسئلہ ہے تو اس میں قرآن و حدیث میں کوئی تحدید نہیں آئی ہے، البتہ قرآن و حدیث میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے وہ چند قسموں پر مشتمل ہیں:

۱- چوپائے جانور (اور اس سے مراد اونٹ، گائے اور بکری ہے) اور امام ابوحنیفہ اور امام زہری کے نزدیک اس میں گھوڑا بھی داخل ہے (لفقہ علی المبراہب الاربعہ ۵۹۶/۱، الجومرۃ المیرۃ ۱۷۶/۱)۔

☆ مدرسہ سچے علوم بنگور۔



۲- سونا اور چاندی (اور اس میں مروجہ نقدی داخل ہوگی)۔

۳- سامان تجارت۔

۴- معدن و رکاز۔

۵- کھیتی اور پھل۔

ان پانچ قسم کے مالوں کے سوا اور مال پر زکوٰۃ نہیں ہے (المفتی علی امجد اہب الاربعہ

۵۹۶/۱)۔

### شرائط وجوب زکوٰۃ

#### ۱- ملک تام

پہلی شرط یہ ہے کہ مال پر ملکیت تامہ حاصل ہو، اگر نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور ملکیت تامہ کا مطلب یہ ہے کہ مال مملوک بھی ہو اور قبضہ میں بھی ہو، اگر مملوک تو ہے، مگر قبضہ میں نہیں یا قبضہ میں ہے، مگر مملوک نہیں تو وہ مال ایسا ہے جس پر ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

”وسببہ (أی سبب افتراضها) ملک نصاب حولی تام“ (الدر المختار علی ہاشم

رد المحتار ۳/۵۹۹)۔

اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے:

”لأن المراد بالتام المملوک رقبةً ویداً“ (رد المحتار ۳/۵۹۹)۔

اور علامہ ابن نجیم نے صاحب کنز الدقائق کے قول ”ملک“ پر لکھا ہے:

”وأطلق (أی صاحب الكنز) الملك فانصرف إلى الكامل وهو

المملوک رقبةً ویداً“ (البحر الرائق ۳/۲۰۳)۔

ان تصریحات سے واضح ہوا کہ ملک تام سے مراد مال کا رقبتہ ویداً دونوں طرح مملوک

ہوتا ہے، اور وجوب زکوٰۃ کی اسی شرط کے پیش نظر فقہاء نے مال مکاتب پر زکوٰۃ نہ ہونے کی تصریح کی ہے، اسی طرح گمشدہ مال اور مال مغضوب جس پر کوئی پینہ نہ ہو، اور وہ مال جو کسی جنگل میں مدفون ہو، ان سب پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ سب اگر چہ رقبۃ مملوک ہیں مگر قبضہ میں نہیں ہیں (البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

### خرید کردہ غیر مقبوض مال پر زکوٰۃ

اسی سے اس سوال کا جواب نکل آیا کہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی، اس خرید کردہ غیر مقبوض مال پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جواب ظاہر ہے کہ اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، وجہ وہی ہے کہ یہ مال اگرچہ خریدار کی ملکیت میں آگیا مگر اس کے ہاتھ اور قبضہ میں نہیں آیا ہے، لہذا یہ خریدار کی ملک تام نہیں ہے جو وجوب زکوٰۃ کی شرط ہے۔

علامہ ابن نجیم نے اس جزئیہ کی تصریح کی ہے:

”..... فلا یجب علی المشتري فیما اشتراه للتجارة قبل القبض لعدم

الید“ (البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

### پیشگی ادا کردہ قیمت پر زکوٰۃ

اسی طرح مال تجارت کی پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی، کیونکہ خریدار نے جب بائع کو پیشگی قیمت دے دی تو وہ اس کی ملک سے نکل کر بائع کی ملک میں داخل ہو گیا، لہذا خریدار پر اس کی زکوٰۃ نہ ہوگی، البحر الرائق میں ہے:

”ولا زکوٰۃ علی المشتري لأن الثمن زال عن ملکہ إلی البائع“

(البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

البتہ بائع پر اس کی زکوٰۃ لازم ہوگی جبکہ ایک سال اس پر گزر جائے۔

### اڈوائس یا ڈپوزٹ پر زکوٰۃ

اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیے کہ دکانوں اور مکانوں کے کرایہ پر جو اڈوائس دیا جاتا ہے اور عقد اجارہ کے ختم یا فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں، اور ہے تو کس پر ہے: کرایہ دار پر ہے یا مالک مکان پر؟

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اڈوائس کی رقم مالک مکان کی ملکیت میں نہیں ہے، اگرچہ فی الحال اس کا اس پر قبضہ ہے، لہذا مالک مکان پر اس رقم کی زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی، اب رہا یہ کہ کرایہ دار جو کہ اس رقم اڈوائس کا مالک ہے اس پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں پہلے اس رقم کی نوعیت متعین کرنا چاہیے۔

اس رقم کے متعلق ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ قرض ہو، مگر تعامل اور عرف اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ قرض میں میعاد مقرر نہیں ہو سکتی (ہدایہ ۳/۶۰) اور جب چاہے واپس لیا جاسکتا ہے، اور اڈوائس کی رقم میں یہ بات مفقود ہے، لہذا یہ قرض نہیں ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ امانت یا ودیعت ہو، مگر یہ احتمال بھی اس لئے صحیح نہیں کہ امانت اگر تلف ہو جائے تو اس کا ضمان نہیں آتا (ہدایہ ۳/۲۵۷) مگر اڈوائس کے سلسلہ میں عرف اور عادت سے ثابت ہے کہ یہ رقم واجب الاداء ہوتی ہے، خواہ وہ تلف ہی کیوں نہ ہو جائے، لہذا اس کو امانت و ودیعت بھی نہیں کہہ سکتے۔

تیسرا احتمال اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ رقم عاریت ہو، لیکن یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ عاریت میں بھی مالک کو ہر وقت رجوع کا حق ہوتا ہے (ہدایہ ۳/۲۶۳) اور اڈوائس کی رقم میں یہ بات نہیں ہے، دوسرے عاریت بھی مثل ودیعت امانت ہے جس کے ہلاک و تلف ہو جانے سے

ضمان لازم نہیں آتا (ہدایہ ۳/۲۶۳) اور اڈوائس کی رقم ہلاک و تلف ہونے کی صورت میں بھی واجب الاداء شمار ہوتی ہے، تیسرے علماء نے لکھا ہے کہ عاریت اگر دراہم و دنانیر یا مکیلی یا موزونی یا معدودی شئی ہو تو وقرض کے حکم میں ہوتی ہے، ہدایہ میں ہے۔

”وعاریة الدراهم والدنانیر والمکیل والموزون والمعمود قرض“

(ہدایہ ۳/۲۶۵)۔

پس روپیہ یا تودرہم و دینار کے حکم میں ہوگا، ورنہ معدود تو ہے ہی، لہذا اڈوائس کی رقم کو عاریت کہنے کی صورت میں بھی وہ قرض ہی کہلائے گی، اور اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ احتمال عرف و عادت کی رو سے صحیح نہیں، لہذا اڈوائس کی رقم عاریت میں بھی داخل نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ رقم رہن ہو، اور یہ احتمال کافی حد تک اس رقم اڈوائس پر منطبق ہو سکتا ہے، ایک تو اس لئے کہ ”شئی مرہون“ کی واپسی جس طرح اس وقت نہیں جب تک مرہون بہ (دین) کو واپس نہ کیا جائے، اسی طرح اڈوائس کی رقم بھی اس وقت تک واپس نہیں ہوتی جب تک کہ کرایہ دار گھریا دکان مالک کے حوالہ نہ کر دے، تیسرے اس لئے کہ رہن میں جس طرح شئی مرہون کو مرہن کے پاس رکھنے کا مقصد مرہن کے دل میں وثوق پیدا کرنا ہے، اسی طرح اڈوائس دینے کا بھی یہی مقصد ہے۔

جب یہ واضح ہوا کہ اڈوائس کی رقم ”شئی مرہون“ سے مشابہ ہے تو اب اس کے بارے میں زکوٰۃ کا حکم معلوم کرنا آسان ہو گیا، علماء نے لکھا ہے کہ ”شئی مرہون“ پر زکوٰۃ نہیں ہے، اگر وہ مرہن کے قبضہ میں ہو، کیونکہ زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ”ملک تام“ ہے، اور ملک تام نام ہے مال کے مملوک و مقبوض ہونے کا، اور شئی مرہون چونکہ مالک کے قبضہ میں نہیں ہے، اس لئے اس پر ملک تام حاصل نہیں، لہذا اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے:

”ومن موانع الوجوب الرهن إذا كان في يد المرتهن لعدم ملك  
اليد“ (البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

بالکل اسی طرح اڈوائس کی رقم بھی چونکہ مالک کے قبضہ میں نہیں ہے، لہذا اس پر بھی  
زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔

### مدارس میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کی جو شرط یہاں زیر بحث آئی ہے، یعنی ”ملک تام“ اس سے یہ بھی معلوم  
ہوا کہ جس مال کا کوئی متعین مالک نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع شدہ رقم اس کی زکوٰۃ  
نہیں ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی نے ”فقہ الزکوٰۃ“ میں لکھا ہے:

”ایسا مال جس کا کوئی متعین مالک نہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں، مثلاً حکومت، زکوٰۃ اور  
ٹیکسوں وغیرہ سے جو مال حاصل کرتی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ اس مال کا کوئی  
متعین مالک نہیں ہے، بلکہ یہ مال تمام امت کی ملکیت ہے“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۱۷۶)۔

بعض علماء نے رقم مدرسہ و ادارہ پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ اگر  
وہ رقم صدقات واجبہ کی ہے تو اس لئے اس پر زکوٰۃ نہیں کہ اگر یہ رقم اصل مالک کے پاس بھی ہوتی  
اور وہ چندہ میں نہ دیا ہوتا تب بھی اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ اگر نہ دیا  
ہو تو آئندہ سال زکوٰۃ کی مقدار وضع کر کے باقی مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی (۲/۲۶۰)۔ اور اگر  
وہ رقم مدعیتہ کی ہو تو مہتمم کی تحویل میں دے دینے کے بعد چونکہ وہ معطی کے ملک سے خارج  
ہو جاتی ہے، اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ نہیں اور یہ بمنزلہ غلۃ الوتف ہے (احسن الفتاویٰ  
۲/۴۳۱، ۴۳۲)۔

### مال حرام پر زکوٰۃ ہے؟

اسی شرط و وجوب زکوٰۃ کے نتیجے میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خالص حرام مال جیسے رشوت، غصب، سود یا چوری وغیرہ کا مال چونکہ ملکیت میں نہیں آتا، لہذا اس پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، البتہ حرام مال کو اولاً ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی جن کا یہ مال ہے، اگر پتہ نہ چلے پھر فقراء پر کل کا کل صدقہ کرنا واجب ہے۔

شامی نے لکھا ہے:

”فی القنیۃ لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمہ الزکوٰۃ، لأن الكل واجب التصدق علیہ، فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ، ومثله فی البزازیۃ“ (رد المحتار مع الدر المختار ۲/۲۹۱)۔

غرض مال حرام خالص واجب التصدق ہے، اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، اور وی جائے تو مقبول بھی نہیں ہے، حدیث میں ہے: ”لا یقبل اللہ إلا الطیب“ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ) اور اس کی توجیہ یہی کی گئی ہے کہ یہ مال حرام اس کی ملکیت میں نہیں ہے جس نے غلط طریقہ سے اس کو حاصل کیا ہے، ابن حجر نے امام قرطبی سے نقل کیا ہے:

”وإنما لا یقبل اللہ الصدقۃ بالحرام؛ لأنه غیر مملوک للتصدق وهو ممنوع من التصرف فیہ، والمتصدق بہ متصرف فیہ“ (فتح الباری ۲/۲۷۹)۔  
غرض یہ کہ مال حرام ملکیت میں نہیں آتا، لہذا اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

### مال مخلوط بالحرام پر زکوٰۃ

البتہ ایسے مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو مال حرام سے مخلوط ہو اور دونوں مالوں میں امتیاز مشکل ہو جائے، کیونکہ اپنے حلال مال کے ساتھ حرام مال ملانے سے یہ مال حرام بھی اس کی

ملکیت میں داخل ہو جائے گا، لہذا اس مخلوط مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔  
علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے:

”وفی فتح القدير وغيره لا يخرج عن ملك النصاب المذكور ما  
ملك بسبب خبيث، ولذا قالوا: لو أن سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملكاً له  
حتى وجبت عليه الزكوة“ (البحر الرائق ۲/۲۰۵)۔

یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے، اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے مسلک پر اس  
مال مخلوط پر بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ ان کے نزدیک ملک ثابت نہیں ہے (البحر الرائق  
۲/۲۰۵)۔

لیکن امام صاحب کے قول پر بھی مخلوط مال پر وجوب زکوٰۃ اس صورت پر ہے، جبکہ مال  
مخلوط کے سوا بھی نصاب زکوٰۃ ہو، اگر مخلوط مال کے سوا کوئی اور نصاب اس شخص کے پاس نہ ہو تو  
اس میں زکوٰۃ نہیں ہے (رد المحتار ۲/۲۹۱)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیروں کے جو اموال اس نے اپنے مال میں ملایا ہے وہ غیروں  
کو واپس کرنا لازم ہے، لہذا یہ مدیون ہو اور مدیون کا مال اگر دین سے زائد نہ ہو تو اس میں زکوٰۃ  
نہیں ہے (رد المحتار ۲/۲۹۱)۔

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مال مخلوط بالحرام پر دو صورتوں میں زکوٰۃ آتی ہے:  
۱- ایک تو اس صورت میں، جبکہ اس حرام مال کے حقدار زری کر دیں۔  
۲- دوسرے اس وقت جب کہ اس کے اصحاب و حقدار معلوم نہ ہوں۔  
باقی اور صورتوں میں اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اس حرام مال کو ان لوگوں کو پہنچانا  
ضروری ہوگا جن کے یہ اموال ہیں۔

## دین کے اقسام اور ان پر زکوٰۃ کی تفصیل

ملکیت کی شرط پر ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث آتا ہے کہ دین کی زکوٰۃ کس پر ہوگی، دائن پر جو کہ اس کا مالک ہے، یا مدیون پر جس کے قبضہ میں ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ مدیون پر اس کی زکوٰۃ ہو نہیں سکتی، کیونکہ وہ اس کا مالک نہیں ہے، پھر جبکہ مدیون پر دین کی وجہ سے بقدر دین اس کے اپنے مال میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے تو جو اس کا مال نہیں اس پر اس کے ذمہ زکوٰۃ کا عائد کرنا غیر معقول ہے، البتہ دائن پر بوجہ ملکیت کے اس کی زکوٰۃ عائد ہو سکتی ہے، مگر اس سلسلہ میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ وہ دین کی باعتبار وصولیابی کے امیدوار امید کی کئی قسمیں ہیں:

۱- مال دین کا مدیون انکار کرے اور اس پر بیئہ بھی نہ ہو، ایسے مال دین پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

۲- دین پر بیئہ نہ تھا اور مدیون انکار کر رہا تھا، پھر کسی طرح بیئہ قائم ہو گیا تو اس دین پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ہدایہ میں ہے۔

”ومن له على آخر دين فجدله سنين ثم قامت به بينة لم يزك له لما مضى“ (ہدایہ ۱/۱۶۶)۔

۳- مدیون انکار کرے اور دین پر بیئہ قائم ہو، اس صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ لازم ہے اور امام محمد سے عدم وجوب منقول ہے، اور بعض علماء نے اس کی تصحیح کی ہے۔

۴- مدیون انکار کرے اور بیئہ نہ ہو مگر قاضی کو اس کا علم ہو، (مگر مفتی بقول اس صورت میں عدم وجوب کا ہے)۔ اس میں بھی زکوٰۃ ہے (دیکھئے: رد المحتار ۱/۲۹۷)۔

۵- دین مقرر ہو اور وہ غنی ہو۔

۶- دین مقرر ہو اور وہ تنگ دست ہو، ان دونوں صورتوں میں بھی زکوٰۃ ہے (ہدایہ ۱/۱۶۷)۔



۷- دین مقرر پر ہو اور اس کو قاضی نے مفلس قرار دیا ہو، اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس دین کی زکوٰۃ لازم ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک واجب نہیں ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی اس صورت میں زکوٰۃ ہے (ہدایہ ۱/۱۶۷)۔

مگر جن صورتوں میں دائن پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ آتی ہے ان میں دین قوی ہے، جیسے قرض پر اس صورت میں زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، جبکہ مثلاً اس قرض میں سے چالیس درہم وصول ہو جائیں اور دین متوسط میں سے دو سو درہم وصول ہونے پر زکوٰۃ دینا لازم ہوگا (فقہ علی الحدیث ۱/۶۰۳)۔

جن میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں ہے، ان میں وصولی کے بعد ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ لازم ہوگی (ایضاً)۔

خلاصہ یہ کہ دائن پر دین کی زکوٰۃ یا تو اس وقت لازم ہوگی جب کہ مدیون دین کا اقرار کرے یا اس وقت جب کہ دین پر پینہ قائم ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں دائن کو مال دین پر ملکیت تامہ حاصل ہے، مملوک ہونا تو ظاہر ہے اور قبضہ اگرچہ حقیقتہً نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کو مال دین تک وصول و رسائی ممکن ہے، لہذا یہ حکماً قبضہ ہے، پس ملکیت تامہ حاصل ہوگی، اس لئے ان پر زکوٰۃ ہوگی، اور دوسری صورتوں میں قبضہ نہ حقیقتہً ہے نہ حکماً، اس لئے زکوٰۃ نہ ہوگی، اسی کو صاحب ”ہدایہ“ نے ”لإمكان الوصول إليه ابتداءً وبواسطة التحصيل“ (ہدایہ ۱/۱۶۷) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

### کیا مامل دین کی زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے

اوپر کی توضیح سے معلوم ہوا کہ دین کے سلسلہ میں زکوٰۃ دائن پر ہوتی ہے نہ کہ مدیون پر، مگر بسا اوقات ایسا ہوتا کہ مدیون باوجود اقرار کے مال منول کرتا ہے، اور باوجود قدرت کے اداء قرض میں غیر معمولی تاخیر کرتا ہے اور خود اس دین سے تجارت کر کے منافع حاصل کرتا ہے، تو اب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں مماطل دین کی زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے یا نہیں؟— اس صورت میں دائن پر زکوٰۃ عائد کرنا بظاہر خلاف عدل معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک اس صورت میں دائن پر زکوٰۃ کا مسئلہ ہے تو احقر کا خیال ہے کہ اس پر زکوٰۃ نہ ہونا چاہیے بشرطیکہ وہ دین کے وصول کرنے میں عاجز و غیر قادر ہو، اور اس کی نظیر یہ چیز یہ ہے کہ والی و حاکم اگر کسی کے دین کا اتر ارتو کرتا ہو، مگر دینا نہ ہو تو فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں زکوٰۃ نہیں، اسی طرح اگر قرضدار بھاگ گیا اور دائن طلب کرنے سے عاجز ہو تو زکوٰۃ نہ ہونا امام محمد سے منقول ہے:

”وفی المحيط عن المنتقی عن محمد: لو كان له دين على وال وهو مقر به إلا أنه لا يعطيه وقد طالبه بباب الخليفة فلم يعطه، فلا زكوة فيه، ولو هرب غريمه وهو يقدر على طلبه أو التوكيل بذلك فعليه الزكوة، وإن لم يقدر على ذلك فلا زكوة عليه“ (رد المحتار ۳/۲۶۶)۔

رہا مدیون پر زکوٰۃ کے عائد کرنے کا مسئلہ تو صحیح نہیں معلوم ہوتا جس کی وجہ ظاہر ہے، وہ یہ کہ اس کا وہ مالک نہیں، نیز اس کے ذمہ تو کل رقم دین کو واپس لوٹانا واجب ہے، اس کے لئے بعض حصہ کا صدقہ (زکوٰۃ میں) دینا کیا مفید ہو سکتا ہے؟ جیسے کوئی غصب کر لے تو اس مال مغصوب میں زکوٰۃ کو واجب قرار دینا کیا مفید ہو سکتا ہے، جبکہ اس کے اوپر تو کل مال مغصوب کا مغصوب منہ کو اور وہ نہ ہو تو نقرہ کو دینا واجب ہے، چنانچہ اسی دلیل سے اموال غیر طیبہ پر زکوٰۃ نہ ہونے کو فقہاء نے لکھا ہے۔ ثامی نے لکھا ہے:

”فی القنیة: لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة لأن الكل واجب التصديق عليه فلا يفيد إيجاب التصديق ببعضه“ (ثامی ۲/۲۹۱)۔

غرض یہ کہ مدیون کو دین واپس کرنے کا ذمہ دار قرار دینا چاہئے نہ کہ دین کی زکوٰۃ کا

(البتہ مماطل پر زکوٰۃ کا وجوب بعض ائمہ سے چونکہ منقول ہے، اس لئے اگر کوئی مصلحت اس کی داعی ہو تو اس قول کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، جیسے امام نخعی و عطانی روایت عنہما) (کافی فقہ الزکوٰۃ للقرضاوی ۱/۱۸۲)۔

### پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

سرکاری یا غیر سرکاری محکموں اور کمپنیوں میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں، ان کی ماہانہ تنخواہ سے ایک حصہ کاٹ کر ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور کچھ فیصد سرکاری کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کے پیش نظر اپنی طرف سے اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، بعض اوقات اس پر سرکاری کمپنی ایک اضافی رقم بنام انٹرسٹ بھی دیتی ہے، اس کو پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اور یہ کہ کب واجب ہوگی؟ اس مسئلہ کے حل کے لئے سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ سرکاری کمپنی جس حصہ کو تنخواہ سے کاٹ کر کھاتے میں جمع کرتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟

اس فنڈ میں دو قسم کی رقم ہوتی ہے، ایک وہ جو تنخواہ ملازم کا حصہ ہے، دوسرے اس پر زائد وہ رقم جو کمپنی یا سرکاری ادارے کی طرف سے دیتی ہے جو محض ایک انعام ہے، جہاں تک اس زائد رقم کا سوال ہے تو یہ جب تک کمپنی یا ادارہ ملازم کو نہیں دے دیتا وہ نہ اس کی ملکیت میں داخل ہوگا اور نہ اس پر اس کا استحقاق ہوگا، یہ ایک تبرع اور احسان ہے کمپنی یا سرکاری طرف سے، چاہے وہ دے یا نہ دے، لہذا اس پر زکوٰۃ کے عائد کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب رہی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ کا جزو حصہ ہے، یہ اگرچہ ابھی ملکیت میں داخل نہیں ہے لیکن ملازم کا اس پر استحقاق ہے اور حصہ تنخواہ کمپنی یا سرکار پر واجب الادا ہے اور دین ہے۔ دین کے متعلق امام محمد و امام ابو یوسف کا مسلک یہ ہے کہ دین کسی قسم کا ہو اس کی زکوٰۃ

واجب ہے، اور گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا ضروری ہے، اور دین کی رقم تھوڑی یا زیادہ جتنی بھی وصول ہو اس کی زکوٰۃ ادا کرے، البتہ دین سعا یہ دین کتابت اور دین دیت اس سے مستثنیٰ ہیں (البحر الرائق ۲/۲۰۸)۔

ان حضرات کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ کی اس رقم پر جو جزء تنخواہ ہے اور کمپنی کے ذمہ ہے زکوٰۃ دینا لازم ہوگا، اور جب بھی اس کا کوئی حصہ یا کل رقم مل جائے گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ لازم ہوگی اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

۱- دین قوی: دین قوی کہتے ہیں قرض کے بدل کو جو قرضدار کے ذمہ ہے، اور مال تجارت کی اس قیمت کو جو خریدار کے ذمہ ہے، اس دین پر ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اور اگر مثلاً دس سال کے بعد یہ رقم وصول ہو تو ان تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ ادا کرنے میں اتنی گنجائش ہے کہ فوراً ادا نہ کرے، بلکہ جب اس میں سے چالیس درہم یا اس کے برابر روپیہ وصول ہو تو ادا کرے (البحر الرائق ۲/۲۰۷، بدائع الصنائع ۲/۱۰، بسوط السنن ۲/۱۹۵)۔

۲- دین متوسط: دین متوسط کسی ایسے سامان کی قیمت ہے جو تجارت کے لئے نہیں تھا، اور یہ قیمت خریدار کے ذمہ ہو، جیسے رہنے کا گھریا اپنے کپڑے وغیرہ فروخت کیا اور ابھی اس کی قیمت وصول نہیں ہوئی، اس دین کے وصول ہونے اور ایک سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کا واجب ہونا معلوم و مقرر ہے، البتہ مدیون کے قبضہ میں جتنے سال رہا، ان کی زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں امام صاحبؒ سے دو روایتیں منقول ہیں:

صاحب ”البحر الرائق“ نے ایام گزشتہ کی زکوٰۃ واجب ہونا نقل کر کے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، مگر یہ بھی بتایا ہے کہ ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا، جبکہ نصاب (دوسو درہم) پر قبضہ ہو جائے ”وفی المتوسط لا تجب مالہ یقبض نصاباً و یعتبر لما مضی من الحول فی صحیح الروایة“ (البحر الرائق ۲/۲۰۷)۔

مگر جیسا کہ شامیؒ نے منجہ الخائق میں تنبیہ کی ہے، یہ روایت اصح کے خلاف ہے:

”وہی احمدی الروایتین عن الإمام وہی خلاف الأصح“ (منحة الخالق مع البحر

الرائق ۲/۲۰۷)۔

اس سلسلہ میں صحیح یہ ہے کہ گزشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ جب دوسورہم وصول ہوں اور ان پر ایک سال گزرے تو ان دوسورہم کی زکوٰۃ واجب ہوگی (بدائع الصنائع ۲/۱۰)۔

۳- دین ضعیف: وہ ہے جو مال کے بدلہ میں کسی کے ذمہ نہ ہو، بلکہ غیر مال کے بدلہ

کسی کے ذمہ آیا ہو، جیسے مہر وغیرہ، اس میں گزشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب نہیں (بحر وغیرہ)۔

اب غور کرنا چاہیے کہ امام صاحب کے مسلک پر پراویڈنٹ فنڈ کی وہ رقم جو تنخواہ کا حصہ و جزو ہے وہ ان تین قسموں میں سے کس قسم میں داخل ہے؟ دین قوی میں تو داخل نہیں، کیونکہ یہ رقم نہ بدل قرض ہے اور نہ سامان تجارت کا بدل ہے، بلکہ یہ ملازم کی خدمت کا بدل و معاوضہ ہے۔

اب یہ حل کرنے کے لئے کہ یہ دین وسط میں داخل ہے یا دین ضعیف میں، یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ دین (پراویڈنٹ فنڈ) جس چیز کا بدلہ اور معاوضہ ہے وہ مال ہے یا نہیں، اگر وہ مال ہے تو یہ دین وسط میں اور اگر مال نہیں تو دین ضعیف میں داخل ہوگا، اور اوپر عرض کر آیا ہوں کہ پراویڈنٹ فنڈ کی یہ رقم خدمت کا معاوضہ ہے، تو اب سول یہ ہے کہ ملازم کی خدمت کیا مال ہے یا مال نہیں ہے؟

فقہاء کے کلام میں غلام کی خدمت پر بحث کی گئی ہے اور اس میں دو روایتیں ہیں: ایک یہ کہ غلام (جب کہ تجارت کے لئے ہو، اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت مال نہیں ہے ”بحر وغیرہ“ خدمت چونکہ ایک منفعت ہے، وہ مال نہیں ہے، لہذا ایسا دین، دین ضعیف ہے، اور ایام گزشتہ کی زکوٰۃ اس میں واجب نہیں، اور دوسرا قول یہ ہے کہ خدمت غلام، مال ہے، لہذا یہ دین، دین متوسط ہوگا، یہی ظاہر الروایۃ ہے۔

چنانچہ شامی نے ”منحة الخالق“ میں ”محیط“ کے حوالہ سے مفصل عبارت نقل کی ہے،

(دیکھئے صحیح الخالق علی البحر الرائق ۲/۲۰۸)۔

اس خدمت کے سلسلہ میں ایک تیسری روایت بھی ہے جو ”البحر الرائق“ میں ہے، اور شامی نے اس پر ولو الجیہ کا حوالہ بھی دیا ہے، وہ یہ کہ تجارت کے غلام کی خدمت دین قوی میں داخل ہے، اس لئے کہ مال تجارت کی اجرت بھی مال تجارت کی قیمت کی طرح ہے، صاحب ”بحر“ نے اس کو صحیح روایت قرار دیا ہے، اور علامہ سرخسی نے ”مبسوط“ میں اس کو اصح قرار دیا ہے (بسوط اسرخسی ۲/۱۹۵)۔

مگر فقہاء کا یہ کلام جیسا کہ ظاہر ہے، ایک تو غلام کی خدمت کے بارے میں ہے، دوسرے اس غلام کی خدمت کے بارے میں جو تجارت کے لئے ہو، اگر غلام تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت کا معاوضہ دین ضعیف میں داخل ہے۔

ہم جس سلسلہ میں بحث کر رہے ہیں وہ آزاد انسان کی خدمت کا مسئلہ ہے، تو یہ کسی طور پر بھی دین قوی میں داخل نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو صرف وہ صورت داخل ہے کہ غلام تجارت کا ہو، اور اس کی خدمت کا معاوضہ ذمہ میں ہو، جب تجارت کے لئے ہونا غلام میں بھی، دین قوی بننے کے لئے شرط ہے تو آزاد انسان کا مسئلہ تو بہر صورت اس سے مختلف ہے۔

اسی طرح دین وسط میں بھی اس کو داخل کرنا مشکل ہے، کیونکہ آزاد انسان کی خدمت کو مال قرار دینا مشکل ہے، غلام کی خدمت کو بھی جب ایک روایت پر مال قرار نہیں دیا گیا ہے، تو آزاد انسان کی خدمت کو مال قرار دینا بعید ہے، اس لئے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے، لہذا ایام ماضیہ کی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہوگی، بلکہ وصولی کے بعد جب ایک سال گزر جائے تو اس سال کی زکوٰۃ دینا ہوگا۔

اور اگر بالفرض اس کو دین وسط میں داخل مان لیں تب بھی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، دین وسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے، اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہے، یہی اصح روایت ہے۔

لہذا امام صاحب کے مسلک پر اس پر ایام گزشتہ کی زکوٰۃ نہ ہوگی، بلکہ وصولی کے بعد ایک سال گزرنے پر دینا ہوگا، حکیم الامت تھانویؒ کی آخری تحقیق یہی ہے، اور مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، (دیکھئے: امداد المغتیبین، ص ۷۲)۔

## (۲) نما یعنی نامی ہونا

اموال میں وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مال نامی ہو، اگر مال نامی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

نامی: نما سے ہے اور نما لغت میں فرز، اُش اور زیادتی کو کہتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے:

”نما المال ینمی نماء وینمو نموا أنماء اللہ“ (مغرب)۔

شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی نما، دوسرے تقدیری نما، حقیقی فرز، اُش اور زیادتی تو والد و تاسل سے (جیسے جانوروں میں) یا تجارت سے ہوتا ہے اور تقدیری فرز، اُش کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں زیادتی اور فرز، اُش پر صاحب مال کو قدرت حاصل ہو، اس طرح کہ مال اس کے یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو (البحر الرائق، ص ۲۰۶)۔

غرض یہ کہ زکوٰۃ انہی اموال پر لازم ہے جو اپنے اندر فرز، اُش کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور یہ فرز، اُش دو طرح پر ہے:

- ۱- نما حقیقی، جیسے جانور اور مال کی تجارت کہ حقیقت میں ان میں اضافہ ہوتا ہے۔
- ۲- نما تقدیری، کہ حقیقت میں تو اضافہ نہیں ہے، لیکن مالک چاہے تو اس کو بڑھا سکتا

ہے۔

## نما تقدیری کی قسمیں

پھر نما تقدیری کی دو قسمیں ہیں: ایک خلئی، دوسرے فعلی، خلئی جیسے سونا اور چاندی جو کہ

بالذات حوائجِ اصلیہ کے دفع کرنے میں انتفاع کی قابلیت رکھتے ہیں، اس میں تجارت کی نیت و وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ضروری نہیں، کیونکہ سونا اور چاندی اصل خلقت سے ہی تجارت کے لئے متعین ہیں، تو اب نیت جو کہ تعین کے واسطے ہوتی ہے اس کی کیا ضرورت، لہذا ان پر ہر حال میں زکوٰۃ ہوگی۔

فعلی ان دونوں کے علاوہ سب چیزیں ہیں جو اگر تجارت کی نیت سے ہوں تو ان میں زکوٰۃ ہے ورنہ نہیں (اگر وہ عروض ہو) اگر مویشی ہیں تو ان میں سائہ ہونا شرط ہے (البحر الرائق ۲۰۹، ۲۱۰)۔

### (۳) حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

وجوبِ زکوٰۃ کی ایک شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے، اگر کسی کے پاس مال تو ہے، مگر اپنی حقیقی و اصلی حاجت و ضروریات کے لئے ہے تو اس مال پر زکوٰۃ نہیں ہے، بلکہ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جو انسانی حوائجِ ضروریات سے فارغ و باقی ہو۔

### حاجتِ اصلیہ کی تعریف

حاجتِ اصلیہ و ضرورتِ حقیقی کی تعریف فقہاء نے یوں کی ہے:

”ما يدفع الہلاک عن الإنسان تحقیقاً أو تقلیداً“ (در مختار مع رد

المختار ۲۰۶، ۲۰۷)۔

یعنی حاجتِ اصلیہ وہ ہے جس سے انسان ہلاکت کو تحقیقی یا تقلیدی طور پر دور کر سکے، اور حقیقتاً ہلاکت کو دور کرنے والی چیزوں میں کھانا، پانی، سکونت کے لئے گھر اور جنگی آلات، اور کپڑے جو سردی یا گرمی کے دفع کرنے کے لئے ضروری ہوں، وغیرہ کو فقہاء نے ذکر کیا ہے، اور تقلیدی طور ہلاکت کے دفع کرنے والی اشیاء میں قرض کو بطور مثال پیش کیا ہے، کیونکہ انسان قرض کو ادا کرنے کا محتاج ہے تاکہ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں جو جس و قید ہلاکت کے مانند



ہے، اس سے اپنے کو بچا سکے، اسی طرح اس کی مثال میں فقہاء نے آلات صنعت و حرفت، گھریلو ضروریات کا سامان، سواری کا جانور اور علمی کتب کو ذکر فرمایا ہے (درمختار مع رد المحتار ۲/۲۶۳، البحر الرائق ۲/۲۶۳)۔

خلاصہ یہ کہ جو چیزیں انسان کے لئے ایسی ضروری ہوں کہ ان کے بغیر حقیقتاً یا تقدیراً بلاکت واقع ہو جاتی ہے، ان کو حاجات اصلیہ کہا جائے گا، اور جو چیزیں ایسی نہ ہوں وہ حاجات اصلیہ میں داخل نہ ہوں گی۔

### حاجات اصلیہ پر زمانہ کا اثر

رہا یہ سوال کہ حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں کیا اس کے اعتبار سے ہوگا؟ تو اس کا جواب میرے خیال کے مطابق یہ ہے کہ ہاں، حاجات اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول کے لحاظ سے الگ الگ ہوگا، کیونکہ ہر زمانہ کی ضرورت الگ اور اس کا معیار بھی مختلف ہوتا ہے، ایک زمانہ میں روشنی کے لئے معمولی چراغ ضروری تھا، اور ضرورت کو پورا کر دیا تھا، مگر آج بجلی کے بلب کے بغیر ضرورت پوری نہیں ہوتی، لہذا اس زمانہ میں بھی ضرورت کو چراغ تک محدود قرار دے کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بجلی حاجت اصلیہ میں داخل نہیں، اسی طرح کسی زمانہ میں ہاتھ کے پچھے، گرمی میں ہوا حاصل کرنے کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے، مگر اب بجلی کے پنکھوں کو ضروری سمجھا جا رہا ہے، لہذا یہ داخل ضرورت قرار دیا جائے گا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ علماء کا اختلاف خود بتا رہا ہے کہ زمانہ یا ماحول کی وجہ سے یا اشخاص کے لحاظ سے حوائج اصلیہ میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، یہ کوئی ایسی قطعی چیز نہیں کہ ہر حال میں وہ متعین ہو، یہی رائے علامہ یوسف القرضاوی کی بھی ہے (فقہ الزکاۃ ۲/۲۶۳)۔

مگر اس کا خیال رہے کہ زمانہ، ماحول اور حالات کی تبدیلی سے حوائج اصلیہ میں

رووبدل، اور ان حوائج کا تعین اجتہادی کام ہے، لہذا یہ کام صرف اہل اجتہاد و بصیرت لوگوں کو کرنا چاہیے، ورنہ ہر کس و ما کس کو اس کا اختیار دے دیا جائے تو ہر نفس پرست اس میں دخل اندازی کرے گا اور ہر چیز کو ضرورت میں شمار کرنے کی کوشش کرے گا۔

### (۴) دین سے محفوظ ہونا

شرائط و وجوب الزکاۃ میں سے ایک یہ ہے کہ مال زکوٰۃ دین سے محفوظ ہو، اسی کو فقہاء نے دین سے فارغ ہونا کہا ہے، مگر اس جگہ دین سے مراد وہ دین ہے جس کا بندوں کی جانب سے تقاضا ہوتا ہے خواہ وہ بندوں کا دین ہو یا خدا کا (درمختار مع رد المحتار ۲/۶۰، البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال ہے مگر اس کے ذمہ ایسا دین ہے جس کا بندوں کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے تو ایسے مال پر زکوٰۃ نہیں ہے، اور یہ دین بندوں کا ہوتب بھی زکوٰۃ نہیں اور اگر خدا کا ہو جیسے زکوٰۃ و خراج جس کا مطالبہ سلطان کی طرف سے ہوتا ہے، تب بھی اس پر زکوٰۃ نہیں۔

اور جس دین کا مطالبہ بندوں میں سے کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتا، جیسے نذر، تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی، بلکہ ایسے دین کے ذمہ میں ہوتے ہوئے بھی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، دین معجل ہو یا مؤجل ہر دو صورت میں جمہور کے نزدیک مانع زکوٰۃ ہے، جبکہ اس کا بندوں کی طرف سے کوئی تقاضہ کرنے والا ہو۔

### کیا طویل الاجل قرض مانع زکوٰۃ ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل ہر کار مختلف اسکیموں کے تحت، طویل الاجل قرض فراہم کرتی ہے، اور ان کی مدت ۳۰، ۴۰ سال تک بھی ہوتی ہے اور قرض کی مقدار بھی بڑی ہوتی ہے، مثلاً پانچ لاکھ، دس لاکھ، بیس لاکھ وغیرہ، تو کیا اس قرض کے ہونے سے بھی زکوٰۃ

ساقط ہو جاتی ہے؟ نیز قسط وار ادائیگی کی صورت میں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، پورا قرض منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط کو وضع کر کے باقی مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کے مابین اس میں اختلاف ہے کہ دین مؤجل و مؤخر مانع زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ مگر اکثر علماء دونوں میں فرق نہیں کرتے، تاہم ایک جماعت علماء کی اس طرف گئی ہے کہ دین مؤخر مانع زکوٰۃ نہیں، اسی پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ ہر مؤجل مانع زکوٰۃ ہے یا نہیں، بعض علماء نے کہا ہے کہ ہر مؤجل مانع نہیں، کیونکہ فی الغور اس کا مطالبہ نہیں ہے (البحر الرائق ۲/۲۰۳)۔

لہذا جمہور کی رائے کے مطابق طویل الاجل قرض بھی مانع ہوگا، مگر چونکہ اس سے زکوٰۃ کا نظام ٹھپ ہو جانے کا اندیشہ ہے، لہذا مناسب ہوگا کہ دوسرے علماء کے قول کے مطابق مؤخر مطالبات مانع نہ قرار دیا جائے، اور سالانہ واجب الادا قسط کو وضع کر کے باقی پر زکوٰۃ کو واجب قرار دیا جائے۔

### کمپنی کے اثاثہ پر زکوٰۃ

کمپنی جس کے متعدد حصہ دار اور شرکاء ہوتے ہیں، اور مجموعی اثاثہ اور مالیت کروڑوں روپے کو پہنچتا ہے، مگر اس کے حصہ داروں کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ اگر ان میں اس اثاثہ اور مالیت کو تقسیم کیا جائے تو کوئی بھی صاحب نصاب نہیں رہتا، یا کچھ لوگ صاحب نصاب نہیں ہوتے، ایسی کمپنی کے بارے میں یہ سوال ہے کہ وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار ہوگا یا ہر فرد کے حصہ کا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حصہ داروں میں سے کوئی بھی تقسیم کے بعد صاحب نصاب نہیں رہتا تو اس مشترک کمپنی کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، ”در مختار“ میں ہے:

”ولا تجب الزکوٰۃ عندنا فی نصاب مشترک، قال الشامی: المراد

أن يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم أحد المالكين إلى الآخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما بانفراده نصاباً“ (در مختار رد المحتار ۲/۳۰۴)۔  
 اگر حصہ داروں کا مال نصاب کو پہنچتا ہو تو مجموعی مالیت پر زکوٰۃ دی جائے گی، اور ہر حصہ دار اپنے اپنے حصہ کے مطابق ایک دوسرے سے رجوع کر لیں گے (دیکھئے رد المحتار ۲/۳۰۴)۔

ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ

بعض لوگ اکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کے بجائے ہیرے جواہرات کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرتے ہیں جو تجارت کی نیت سے نہیں ہوتے، اس پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے، اسی طرح عورتیں زینت کی خاطر جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا کیا حکم ہے؟

جہاں تک عورتوں کے جواہرات کا سوال ہے تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ یہ زیب و زینت کے لئے ہوتے ہیں، لیکن جو جواہرات اور ہیرے محض اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے اور ٹیکس سے بچنے کے لئے رکھے جاتے ہیں، احقر کے خیال میں ان پر زکوٰۃ ہونا چاہیے، ورنہ زکوٰۃ سے فرار کے لئے یہ کھلا راستہ لوگوں کو مل جائے گا کہ ہیرے اور جواہرات خرید کر رکھ لئے جائیں، یہ اگرچہ مال تجارت نہیں، مگر مال تجارت کے حکم میں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ رکھنے والا عام طور پر اس سے اپنی تجارت میں بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔

علامہ یوسف القرضاویؒ نے لکھا ہے:

”مناسب ہے کہ یہی حکم موتیوں، یاقوت، الماس اور تمام نفیس پتھروں اور قیمتی جواہر کا ہو کہ ان میں جو بطور زینت یا زیور استعمال کئے جائیں، اور جو حد اسراف میں داخل نہ ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، اور جو کھلم کھلا عادت کے طور پر استعمال ہونے والی مقدار سے زائد ہوں تو وہ

اسراف اور حرام ہے، اور اس کو زکوٰۃ سے چھوٹ دینا درست نہ ہوگا، اسی طرح جو کنز کے طور پر رکھے گئے ہوں ان پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی، اس لئے کہ یہ صورت مال پر عائد ہونے والے حق معلوم سے بچنے کی ایک صورت بن جائے گی“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۳۱۱)۔

یہ ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں ہیرے اور جواہرات بطور کنزی جمع کئے گئے ہیں، لہذا ان پر زکوٰۃ واجب ہونا چاہیے۔

### زکوٰۃ کس نرخ پر ہوگی؟

۱- سامان تجارت کی زکوٰۃ کس نرخ کے حساب سے ہوگی؟ لاگت کے حساب سے یا ادائیگی زکوٰۃ کے دن کی قوت خرید کے لحاظ سے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سامان تجارت کی مالیت کا تعین لاگت کے حساب سے نہ ہوگا، بلکہ موجودہ بازاری نرخ کے لحاظ سے ہوگا، پھر اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ادائیگی زکوٰۃ کے دن کے نرخ کا اعتبار کیا جائے گا یا وجوب کے دن کا لحاظ ہوگا؟، صحیح یہ ہے کہ ادائیگی کے دن بازار کا جو نرخ ہو اس کے لحاظ سے مالیت کا تعین کر کے اسی کے مطابق زکوٰۃ نکالی جائے گی، ”در مختار“ میں ہے:

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالوا يوم الأداء وفي السوانم يوم الأداء إجماعاً وهو الأصح“ (در مختار مع رد المحتار ۲/۲۸۶، فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۶۸)۔

۲- اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا پھنکر فر و خنگلی کا لحاظ کیا جائے گا؟

اس سلسلہ میں کوئی تصریح نظر سے نہیں گزری، البتہ علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے: ”میرے خیال میں بھاؤ سے مراد تھوک کا بھاؤ سے اشیاء کی فروخت نسبتاً زیادہ سہل ہوتی

ہے“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۳۳۸)، اقر کے خیال میں تھوک فروش بیوپاری اپنی اشیاء تجارت کی مالیت تھوک بھاد سے لگائے گا، اور جو پھٹکر فروخت کرنا ہو وہ پھٹکر فروختگی کا اعتبار کرے۔

۳- اراضی کی خرید و فروخت کرنے والے اپنی ملکیت میں جو زمین برائے تجارت رکھتے ہیں ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں، اور ان کی زکوٰۃ کس نرخ کے اعتبار سے نکالی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان پر زکوٰۃ ہے، اور جیسا کہ گزرا وہ جو زکوٰۃ یا ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، مگر چونکہ زمین جب تک فروخت نہ ہو جائے اس کی قیمت قطعی طور پر متعین نہیں ہو سکتی، بلکہ کمی و بیشی کا احتمال رہتا ہے، اس لئے فروختگی تک انتظار کر لیا مناسب ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا:

”سامان کی فروختگی تک اداء زکوٰۃ کے انتظار میں کوئی حرج نہیں“ (فقہ الزکوٰۃ ۱/۳۳۸،

الاسوال ۳۶۶)۔

علامہ قرضاوی نے اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ انتظار سے مقصود یہ ہے کہ جن قیمتوں پر سامان فروخت ہو ان کا حقیقی تعین ہو جائے۔

### کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ

تجارتی کمپنیاں جو اپنے شیئرز فروخت کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ ہوگی، کیونکہ یہ شیئرز دراصل شیئر ہولڈر کی ملکیت میں داخل ہیں، جس کو وہ برائے تجارت کمپنی میں لگایا ہوا ہے، لہذا اس پر ضرور زکوٰۃ لازم ہے۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمپنی کے شیئرز کمپنی کی ساکھ اور نفع و نقصان کے پیش نظر باعتبار قیمت گھٹتے اور بڑھتے ہیں، مثلاً ایک شیئر اور حصہ کمپنی کی شروعات کے موقع پر پانچ ہزار کا تھا، مگر کمپنی کی ترقی اور زیادتی منافع کی وجہ سے وہی حصہ دس ہزار کفر و فروخت ہوتا ہے، تو اب

زکوٰۃ اصل رقم کے اعتبار سے ہوگی یا بازار کے موجودہ نرخ کے مطابق ہوگی؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل یہ حصص، مال تجارت کے قائم مقام ہیں، اور ان کا مالک  
ان کی خرید و فروخت کرنا اور مال بڑھاتا ہے، لہذا سامان تجارت کی طرح ان حصص کی وہ قیمت  
معتبر ہوگی جو بازار میں رائج ہے، یہی علامہ یوسف القرضاوی نے اختیار کیا ہے (فقہ الزکوٰۃ  
۶۶۹/۱)۔

نیز حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حصص کی کمی و بیشی کے ساتھ بیع کی جو توجیہ  
وتاویل (امداد الفتاویٰ جلد دوم میں) کی ہے کہ اگر کسی کمپنی میں سو کا حصہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ  
اس سو میں سے کچھ کا تو سامان ہے اور کچھ نقدی ہے، اور بیع میں کمی و بیشی خلاف جنس کی طرف  
پھیرنے سے جائز ہے تو یوں کہا جائے گا کہ سو میں سے، مثلاً تیس کا سامان ہے اور نقدی ستر ہے،  
اور بیع اس کی دو سو سے ہو تو ان میں سے ستر تو ستر کے بدلہ میں ہیں، اور باقی ایک سو تیس سامان  
کے بدلہ میں ہے، اس تاویل کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ موجودہ نرخ پر دینی چاہیے۔  
کیونکہ جب اس تاویل سے یہ کمی و بیشی جائز تر اور پاتی ہے تو جب بازار میں کمپنی کے  
حصص کی قیمت پانچ سے بڑھ کر دس ہوگئی، تو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، زکوٰۃ بازار کے موجودہ نرخ کے  
مطابق نکالی جائے گی۔

### بونڈز پر زکوٰۃ کا حکم

بونڈ جو کہ سند قرض ہے، اس پر زکوٰۃ آئے گی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرض  
ہے جو کہ دین قوی کہلاتا ہے، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں آئی ہے، اس لئے اس پر گزشتہ ایام  
کی زکوٰۃ بھی واجب ہے، البتہ ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب وصول ہو جائے، اور بونڈ کو کیش  
کرا لیا جائے۔

## محورثانی - نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے میں کون سا نصاب اصل ہے؟

موجودہ دور میں جبکہ سونے اور چاندی کے نرخ میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے تو حرمت زکوٰۃ واجب زکوٰۃ کا نصاب چاندی کے نصاب سے مقرر کیا جانا چاہیے یا سونے کے نصاب سے؟

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ اکثر معاصرین علماء کی رائے یہ ہے کہ چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اسی سے نصاب کا تعین کیا جائے، علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ اس کی دو وجوہ ہیں:

ایک یہ کہ چاندی کے نصاب پر اجماع ہے، اور مشہور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ چاندی کا نصاب فقراء کے حق میں زیادہ مفید ہے۔

اس کے برخلاف بعض دیگر علماء جیسے شیخ ابو زہرہ، شیخ خلاف اور شیخ حسن نے سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے کی تجویز کی ہے، علامہ یوسف القرضاوی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے، اس لئے کہ اموال زکوٰۃ کو اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے کہ پانچ اونٹوں پر زکوٰۃ ہے، چالیس بکریوں پر زکوٰۃ ہے، پانچ وسق کھجور یا کشمش پر زکوٰۃ ہے، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس عہد میں زکوٰۃ کے تمام نصابوں سے قریب سونا ہے چاندی نہیں۔

اس لئے مناسب یہی ہے کہ نصاب زکوٰۃ کے لئے سونے کو اصل قرار دیا جائے، اس میں اگرچہ پہلے قول کے برعکس فقراء اور مستحقین کے حق میں نسبتاً فائدہ کم ہے، مگر امت مسلمہ کے عام افراد جن کے ذمہ زکوٰۃ ہے، ان کے حق میں سہولت ہے، اس کے علاوہ موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کے اعتبار سے بہت ہی کم مقدار مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی، جو اسلامی عدل و انصاف کے تقاضے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔



## محورثالث - مصارف زکوٰۃ

## مد زکوٰۃ سے فیس کی وصولی

مستحق زکوٰۃ طالب علم پر بسلسلہ قیام و طعام و تعلیم پر جو خرچ آتا ہے، مدرسہ کی مد زکوٰۃ سے اہل مدرسہ کیا اس کو ادا کر سکتے ہیں، یا اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دے کر بعد کیش کرنے کے اس سے وصول کر کے مدرسہ میں جمع کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری (چیک والی) صورت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، یہ تملیک کی معقول صورت ہے، اور بلاشبہ جائز ہے، البتہ پہلی صورت میں احتیاطاً یہ ہونا چاہیے کہ پہلے طالب علم، اہل مدرسہ کو اس بات کا وکیل بنا دے، جب اہل مدرسہ طالب علم کی وکیل کی حیثیت سے مد زکوٰۃ سے مقررہ رقم فیس میں ادا کر دیں گے، تو جائز ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مہتمم مدرسہ کیا طلبہ کا وکیل ہے یا نہیں، نیز زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے یا نہیں؟

مہتمم و اہل مدرسہ وکیل فقراء ہیں، لہذا جب وہ وکیل ہوئے تو طلبہ کی طرف سے ان کی ضروریات میں مد زکوٰۃ سے خرچ کرنا ان کے لئے جائز ہے، پھر بھی اگر تو وکیل ہو جائے تو احتیاط کا تقاضا ہے۔

یہی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی رائے ہے، اور حضرت تھانوی نے بھی آخر میں اسی کی طرف رجوع فرمایا تھا، نیز حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اسی کو اختیار فرمایا کہ اس کے خلاف سے رجوع کر لیا تھا (امداد المعتبرین، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶)۔

## مدارس کے سفراء کی حیثیت

عام طور پر مدارس میں وصولی چندہ کے لئے سفراء رکھے جاتے ہیں اور ان کو ان کا حق الخدمت دیا جاتا ہے، ان کے متعلق سوال یہ ہے کہ کیا ”العاملین علیہا“ میں داخل ہو کر مستحق

زکوٰۃ ہیں، اور کیا ان کو زکوٰۃ کی رقم سے معاوضہ دینا جائز ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہاں یہ عالمین صدقہ کے حکم میں داخل ہیں، اور چونکہ عالمین صدقہ کی حیثیت وکیل فقراء ہونے کی ہے، اس لئے ان کو زکوٰۃ کی مد میں سے ان کا حق خدمت دینا جائز ہے، جیسے کوئی فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنا دے، اور اس کا حق الخدمت زکوٰۃ کے مال سے ادا کر دے تو جائز ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تفسیر معارف القرآن میں اگرچہ یہ لکھا ہے کہ مدارس کے سفراء عالمین صدقہ کے حکم میں نہیں، اور ان کو زکوٰۃ کی مد سے معاوضہ دینا جائز نہیں (معارف القرآن ۳۹۹/۳) مگر ”امداد المقتدین“ میں صراحتاً اس سے رجوع فرمایا ہے، اور سفراء و اہل مدرسہ کو صدقہ کے عالمین کے حکم میں داخل فرمایا ہے، اور حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور حضرت سہارنپوریؒ سب کا یہی مسلک ظاہر کیا ہے (امداد المقتدین ۱۰۸۵)۔

زکوٰۃ کا حساب لکھنے والوں کی تنخواہ زکوٰۃ سے

رہا یہ سوال کہ حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے اس کی تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے حسابات لکھنے پر مد زکوٰۃ سے اس کی تنخواہ دینا جائز ہوگا، کیونکہ یہ ان مستحق طلبہ ہی کا کام ہے، لہذا ان کے مال (مد زکوٰۃ) سے ان کے کام کی اجرت دینا درست ہونا چاہئے۔

## زکوٰۃ - کچھ اہم مسائل

مولانا رفیق المنان قاسمی ☆

شرايط زکوٰۃ

۱- ملک تام:

”بدائع“ میں ہے:

”الزکوٰۃ واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول“ (بدائع الصنائع ۹/۳)۔

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ ملک رقبہ و ملک يد دونوں موجود ہوں، جس مال پر کسی کی ملکیت نہ ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی کی ملکیت میں مال نصاب موجود ہو، مگر اس کے قبضہ و دسترس سے اس طرح نکل گیا ہو کہ وہ شخص اس سے انتفاع و استفادہ پر قدرت نہ رکھتا ہو تو ایسے مال میں بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (بدائع الصنائع ۹/۳)۔

ملک يد کی شرط مفقود ہونے ہی کی وجہ سے مال ضما میں احناف کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہے (دیکھئے: فقہ الاسلامی وادانہ ۷۳۱/۳)۔

اسی طرح اصل ملک قائم ہو جانے کے باوجود اگر مال ابھی قبضہ میں نہیں آیا تو اس کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں (دیکھئے: فقہ الاسلامی وادانہ ۳/۳۶۷، رد المحتار ۵/۲۳۵)۔

اسی طرح اگر ایک آدمی کے قبضہ میں مال ہو، مگر اس کا اصل مالک یا مستحق دوسرا ہو تو صاحب ید پر زکوٰۃ واجب نہیں (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۷۷، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہ الاسلامی وادانہ ۳/۳۶۷، ہایہ ۳/۳۲۲)۔

مکاتب کے مال کی زکوٰۃ نہ اس پر واجب ہے، نہ اس کے مالک پر، کیونکہ مکاتب میں ملک رقبہ کی اور مالک میں ملک ید کی شرط مفقود ہے، اور اگر مکاتب کے بدل کتابت کی ادائیگی سے عاجز ہو جانے کی صورت میں وہ مال مالک کو مل جائے یا بدل کتابت کی ادائیگی کی صورت میں وہ مال مکمل طور پر مکاتب کی ملکیت میں داخل ہو جائے تو بھی سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہ ہوگی (رد المحتار ۷/۲۲)۔

بالکل یہی حکم مال مرہون کا بھی ہے، جب تک وہ راہن کے قبضہ سے باہر اور مرہون کے قبضہ میں داخل ہے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں (رد المحتار ۷/۲۲)۔

مال مشتری کی زکوٰۃ قبضہ سے پہلے واجب نہیں ہوتی، لیکن قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں صاحب ”البحر الرائق“ نے ”محیط“ کی عبارت سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن ”خانیہ“ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (دیکھئے: ہایہ ۳/۳۶۰)۔

فقہاء احناف نے وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید کی شرط لگائی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو مال قبضہ میں نہ ہو اس کی زکوٰۃ بہر حال واجب نہ ہوگی، بلکہ اس سے مراد عام ہے کہ وہ مال فی الواقع اس کے قبضہ میں ہو یا اس کے قبضہ میں نہ ہو، مگر اس پر قبضہ کر کے اس سے استفادہ کرنا اس کی قدرت و دسترس سے باہر نہ ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین کی زکوٰۃ فی الجملہ

و اُن پر واجب ہوتی ہے حالانکہ وہ فی الواقع اس کے قبضہ میں نہیں ہوتا۔  
 لیکن وہ مال جو قبضہ و دسترس سے اس طرح باہر ہو گیا ہو کہ اس کی واپسی کی امید منقطع  
 اور اس سے انتفاع کی راہ مسدود ہو گئی ہو اور کوئی ایسی ٹھوس بنیاد موجود نہ ہو جس کے ذریعہ اس مال  
 کے دوبارہ حصول کو یقینی بنایا جاسکے، ایسے مال کی زکوٰۃ واجب نہیں قرار دی جاتی، ایسے مال کو ضمائر  
 کہتے ہیں (البنایہ ۳۶۰، ۳۶۱، بدائع الصنائع ۹/۲)۔  
 مال ضمائر کے سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، جسے فقہاء کرام نے عموماً نقل  
 کیا ہے۔

”لنا ما روی عن علی رضی اللہ عنہ موقوفاً علیہ و مرفوعاً إلی رسول  
 اللہ ﷺ أنه قال: ”لا زکوٰۃ فی مال الضمائر“ (البدائع ۹/۲)۔

مال ضمائر میں زکوٰۃ کے عدم وجوب کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اس مال تک مالک کے ہاتھ  
 کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مال اس کے حق میں ناقابل انتفاع ہے اور جب انتفاع پر اسے  
 قدرت حاصل نہیں تو اس مال کی وجہ سے اسے غنی قرار نہیں دیا جاسکتا اور زکوٰۃ ظاہر ہے کہ غنی پر  
 واجب ہوتی ہے، نہ کہ غیر غنی پر (بدائع الصنائع ۹/۲)۔

ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مال نامی کا ہونا ضروری ہے،  
 چاہے نہ حقیقتاً ہو یا تقدیراً، اور جس مال میں تصرف پر قدرت نہ ہو اس میں نما کا تصور بھی نہیں کیا  
 جاسکتا (البنایہ ۳۶۲)۔

مال ضمائر جب تک قبضہ میں نہ آئے اس کی زکوٰۃ دینا کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں،  
 لیکن قبضہ میں آنے کے بعد سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں حضرات  
 ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

”فعند زفر و الشافعی فی الجملید و أحمد فی روایة یجب علیہ إخراج

ما مضی عن السنین وقال مالک تجب علیه زکاة حول واحد لأن فی الزیادة ضرر علیه“ (البنایۃ ۳/۳۶۲)۔

جو مال صحرا میں دُفن کیا گیا اور جائے دُفن یاد نہ ہو تو وہ مال شمار کے تحت آئے گا، مگر گھر میں دُفن کردہ مال شمار نہ ہوگا، اور اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی (بدائع المعانی ۳/۹۷)۔

ایسا ہی معاملہ دین کا بھی ہے اگر مدیون دین کا منکر ہو اور کوئی ایسا ثبوت موجود نہ ہو جس کی بنیاد پر عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ اس کے حصول کی توقع کی جائے تو اس دین میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو اس میں دائن پر گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### شرط اول - ملک تام سے متعلق سوالوں کے جوابات

۱- وصولیابی سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن وصولیابی کے بعد احوط یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۲- کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم اگر حق قبضہ کا بدل ہے تو ظاہر ہے کہ کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن اگر اس کی حیثیت رہن کی ہے تو بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں (فتاویٰ ۲/۷۷)۔

۳- اس پر ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے واجب نہیں۔

۴- ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ صاحب ید اس کا مالک نہیں، بلکہ وہ مال اس کے اصل مالک کو واپس کرنا اور یہ ممکن نہ ہونے کی صورت میں اس کا صدقہ کر دینا ضروری ہے (فتاویٰ ۲/۲۵، ۲۶)۔

اور حرام مال حلال مال میں مخلوط ہو جانے کی صورت میں اگر مقدار معلوم ہو تو مال حرام

کے بقدر بطور دین اس کے ذمہ لازم ہوگا اور اتنی رقم مستثنیٰ کرنے کے بعد اگر بقدر نصاب مال موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں، لیکن اگر مال حرام اس کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہو کہ تمیز و استثناء معتذر ہو تو احتیاطاً پورے مال کی زکوٰۃ واجب ہوگی (ردالمحتار ۲/۲۵۸)۔

۵- دین کی زکوٰۃ ظاہر ہے کہ دائن پر واجب ہوگی، کیونکہ وہ مال اگرچہ اس کے قبضہ میں نہیں مگر اسے وصول کرنا اور اس سے استفادہ کرنا دشوار نہیں، ہاں اگر اس کی وصولیابی کی امید باقی نہ رہی ہو تو وہ مال ضمار کے ذیل میں آئے گا اور اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مدیون پر دین کی زکوٰۃ بہر حال واجب نہ ہوگی، اگر وہ ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو اور دائن کو وصولیابی کی کوئی امید نہ ہو اور اس کا حصول اس کی استطاعت سے باہر ہو تو اس دین کو مال ضمار کے درجہ میں رکھ کر عدم وجوب زکوٰۃ کا حکم دیا جاسکتا ہے (ردالمحتار ۲/۹۸)۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں، اس کے متعلق ایک بات یہ کہی جاسکتی اور کہی جاتی ہے کہ قبضہ میں آنے سے پہلے اس پر ملازم کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، یعنی اس کی تنخواہ میں سے فنڈ کے لئے جو رقم وضع کر لی گئی وہ اس کی ملکیت میں داخل ہی نہیں اور ملازمت ختم ہونے پر جو رقم اسے ملتی ہے وہ حسب وعدہ و دستور ملنے والا سرکاری عطیہ ہے، اسی وجہ سے انٹرسٹ کے نام سے ملنے والی رقم کے جواز کے بھی فتوے دیے گئے ہیں، اس صورت میں قبضہ میں آنے سے پہلے مذکورہ فنڈ میں زکوٰۃ واجب ہونے کی ظاہر ہے کہ کوئی وجہ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فنڈ کی رقم کو ملازم کی ملکیت قرار دی جائے اور سرکاری خزانہ پر اسے دین واجب الادا تصور کیا جائے، اس تقدیر پر بھی میرے خیال میں مال ضمار کی مشابہت کی وجہ سے اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اگرچہ اس کا حصول متوقع بلکہ یقینی ہوتا ہے، لیکن ایک طویل مقررہ مدت تک وہ مالک کے حق میں غیر مفدور الانتفاع ہوتا ہے، مدت مقررہ سے پہلے نہ وہ اس رقم کو حاصل کر سکتا ہے، نہ ہی اس میں اس کو تصرف پر قدرت ہوتی ہے، اس

وجہ سے نما کی شرط اس میں تحقیق پائی جاتی ہے نہ کہ تقدیراً، اس لئے مال ضار میں عدم وجوب زکوٰۃ کی جو وجہ ہے وہ میری ناقص رائے میں یہاں پائی جاتی ہے (بدائع الصنائع ۹/۲، بیابان ۳/۳۶۳)۔

### دوسری شرط - نما

نما کے معنی زیادتی و فراغ کے ہیں، وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا نامی ہونا شرط ہے، لیکن اس میں حقیقت نما کا اعتبار نہیں، بلکہ مال کا نما کے لئے رکھنا اور قابل استثناء ہونا ہی کافی ہے، شریعت مطہرہ نے یہاں سبب نما ہی کو نما کا درجہ دے کر حکم کو اسی پر دائرہ کر دیا ہے، سبب نما اگر پایا جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، فی الواقع نما کا تحقق ہو یا نہ ہو۔

سبب نما دو چیزوں کو قرار دیا گیا ہے، مویشی میں اسامہ (بدائع ۳۰/۲) اور دوسرے اموال میں نیت تجارت، اسامہ دودھ، گھی اور نسل کے حصول کا ذریعہ ہے، اور تجارت حصول ربح کا ذریعہ، اس لئے سائنہ چوپایوں اور تجارتی اموال میں زکوٰۃ واجب ہوگی (بدائع ۱۱/۲)۔

جو چیزیں اصلاً و خلتاً ثمن مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے سونا، چاندی یا جو عرفاً و رواجاً ثمن کا درجہ حاصل کر چکی ہیں جیسے موجودہ دور میں کاغذی نقود، ان میں نیت تجارت شرط نہیں، بلکہ ان کی ثمنیت بذات خود نما کا قائم مقام ہے اور وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے، کیونکہ ان چیزوں کا مقصود اصلی تجارت ہی ہے اور ان کی وضع و تخلیق ہی اس لئے ہے کہ حوائجِ اصلیہ کے پورا کرنے میں وہ مبادلہ اشیاء کا ذریعہ و معیار بنیں، بذات خود یہ چیزیں کسی بھی انسانی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

سونا چاندی اپنی ذاتی حیثیت میں بھی بہت اہم اور مرغوب خلق ہیں اور بحیثیت ثمن ان کے رواج میں ان کی قدر ذاتی کو بھی بڑا دخل ہے، خلقی طور پر ان میں خالق کائنات نے کچھ ایسی خوبیاں رکھ دی ہیں، ثمن بننے کے لئے یہی چیزیں سب سے زیادہ موزوں قرار پائیں اور انھیں کو



بحیثیت ثمن قبول عام نصیب ہوا، ورنہ قدر ذاتی کے اعتبار سے ان سے بھی گراں قدر چیزیں دنیا میں موجود رہی ہیں۔

نما کی مذکورہ شرط جن اموال میں پائی جائے ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور جن میں یہ شرط مفقود ہو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے بذات خود کتنی ہی گراں قدر و مرغوب خاطر ہوں، تفصیل کے لئے دیکھئے: (فقہ الاسلامی وادلتہ، الدر المختار و رد المحتار، المشرح المصنوع جامعہ الصلوٰۃ ۱/ ۶۵۰)۔  
تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو، ان میں وجوب زکوٰۃ کے لئے نیت تجارت غیر ضروری ہے اور اس کے لئے ان کی ثمنیت ہی کافی ہے۔

اس کے برعکس زر و ثمن کے علاوہ جو مال و متاع ہیں انہیں بہ نفیس نفیس استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور تجارت میں لگا کر بھی ان سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے ان میں وجوب زکوٰۃ کے لئے نیت تجارت و اسامہ شرط ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ مال حوائج اصلیہ سے زائد ہے اور قابل نما ہے، مزید تفصیلات ”بدائع الصنائع“ (۱۱/۴) پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اموال نامیہ کی تین قسم ہیں: زر و ثمن کے قبیل کی چیزیں، اموال تجارت اور مویشی سائز، نما کی شرعا دو قسمیں ہیں: حقیقی و تقدیری۔

”فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد و التناسل و التجارات و التقدیری تمکنہ من الزیادۃ بكون المال فی یدہ أو ید نائبہ“ (رد المحتار ۲/ ۷۰)۔

اس اعتبار سے ملک تام کی شرط بھی نماہی کی فروعات میں سے ہے۔

حولان حول کی شرط بھی نماہی کی مکلیات میں سے ہے۔

تیسری شرط - حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا بھی نما کے لوازم و مقتضیات میں سے ہے، مال نامی ہونا، اس بات کی دلیل اور علامت ہے وہ مال اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہے، ہاں حاجت

اصلیہ سے زائد ہونا نما کو مستلزم نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی مال حاجت اصلیہ سے زائد ہو مگر شرط نما کے نقد ان کی وجہ سے اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہو، جیسے ہیرے، جواہرات کا ذخیرہ، رہائش سے فاضل اور خالی مکانات۔

واضح رہے کہ نما کی شرط صرف وجوب زکوٰۃ کے حق میں ہے، وجوب صدقہ فطر قربانی منع استحقاق زکوٰۃ کے لئے صرف حوائج اصلیہ سے فارغ نصاب کے بقدر مال ہونا کافی ہے۔ حوائج اصلیہ کے زمرہ میں انسان کی بنیادی ضرورتوں روٹی، کپڑا اور مکان کے علاوہ وہی چیزیں آئیں گی جن کی اسے واقعی ضرورت ہو اور جن کی عدم موجودگی اس کے اور اہل و عیال کے لئے ضرر و پریشانی کا باعث ہو۔

وجوب زکوٰۃ کے حق میں حوائج اصلیہ و ثانویہ کی تعیین کی کوئی خاص ضرورت نہیں، کیونکہ انسانی استعمال میں آنے والا کوئی بھی سامان چاہے اس کی قیمت نصاب کے برابر ہی کیوں نہ ہو اگر وہ نامی نہیں تو موجب زکوٰۃ نہیں ہے۔

البتہ صدقہ فطر قربانی کے وجوب اور حرمان زکوٰۃ کے حق میں حوائج اصلیہ کی تعیین ضروری ہے، کیونکہ ان چیزوں کے لئے حوائج اصلیہ سے فاضل بقدر نصاب مال کا ہونا کافی ہے، چاہے وہ نامی ہو یا غیر نامی۔

علامہ شامی نے قدر حاجت کی توضیح اور استحقاق زکوٰۃ کی صورتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، دیکھئے: (رد المحتار ۶۵/۲)۔

چوتھی شرط - دین سے محفوظ ہونا

دین بھی حقیقت میں حوائج اصلیہ ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے دین سے محفوظ ہونے کی شرط مستقل شرط نہیں، بلکہ ”فراغۃ عن الحوائج الأصلیۃ“ ہی کی فروعات میں سے ہے۔

ائمہ متبوعین میں سے غالباً امام شافعی ہی تنہا وہ شخص ہیں جو وجوب زکوٰۃ میں دین کو غیر مؤثر قرار دیتے ہیں، بقیہ تمام ہی ائمہ و اکابرین سلف نے دین کو منع زکوٰۃ میں مؤثر مانا ہے۔  
البتہ کن احوال میں دین کا اعتبار ہوگا اور کن میں نہیں ہوگا، اس میں کچھ اختلاف ہے  
(دیکھئے: فقہ الاسلامی وادانہ ۲/۴۷۳، بدلیۃ الجہد ۱/۹۱ اور غیرہ)۔

منع زکوٰۃ میں وہی دین معتبر ہے جس کا من جہتہ العباد کوئی طلب گار و وصول کنندہ موجود ہو، جس دین کا تعلق خالص حقوق اللہ سے ہو اور اس کا کوئی مطالب من جہتہ العباد نہ ہو تو وہ مانع زکوٰۃ نہیں ہے (الہدایہ مع البناہ ۳/۵۶۳)۔

البتہ زکوٰۃ کا معاملہ ذرا مختلف ہے اور راجح قول کے مطابق دین زکوٰۃ بہر صورت مانع زکوٰۃ ہے، صاحب ”ہدایہ“ اور علامہ عینی نے اس بحث کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے  
(دیکھئے: ہدایہ جلد اول، بناہ ۳/۵۷۳)۔

### طویل المیعاد قرضے

بینکوں سے مختلف سرکاری اسکیموں کے تحت شہریوں کو جو طویل المیعاد قرضے دیے جاتے ہیں اور جن کی ادائیگی حسب معاہدہ بالاقساط کی جاتی ہے، مثلاً ایک شخص نے زراعتی فارم قائم کرنے، کارخانہ اور فیکٹری لگانے، مکانات تعمیر کرنے یا تجارتی کاروبار کے لئے پانچ کروڑ روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں، یعنی دس لاکھ سالانہ کے حساب سے ادا کرنا ہے یا ٹریڈنگ کی خریداری کے لئے ایک لاکھ روپے قرض لئے جسے دس سال میں دس دس ہزار سالانہ کے حساب سے ادا کرنا ہے، ان صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟  
نصوص فقہیہ کے عموم سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پورے قرض کو منہا کئے جانے کے بعد ہی زکوٰۃ واجب ہو، مگر میری ناقص رائے میں اس عموم میں تخصیص کرنا اور مذکورہ قسم کے قرضوں کی

حد تک جزوی طور پر امام شافعی کے قول کو اختیار کرنا زیادہ ترین صواب اور مزاج شریعت و مصالح زکوٰۃ سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یعنی منع زکوٰۃ میں صرف سالانہ قسط واجب الاداء ہی کا اعتبار کیا جائے اور اس سے زائد اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔

لیکن مذکورہ قرض کی نوعیت یہ ہے کہ قرض کی مجموعی رقم اگرچہ بڑی ہے، مگر ایک سال میں طے شدہ قسط واجب الاداء کے علاوہ اس کے مال میں اور کوئی مطالبہ نہیں، نہ ہی ادائیگی کی کوئی ضرورت درپیش ہے، بقیہ پورے مال کو وہ جس طرح چاہے بلا خوف و خطر اپنے تصرف میں لاسکتا ہے اور اسے نفع بخش بنا سکتا ہے اور جب تک سال گزر نہیں جاتا بقیہ دین کی ادائیگی پر مجبور ہونے کا اسے کوئی خدشہ نہیں ہوتا، اس لئے سالانہ قسط کے علاوہ بقیہ دین کا ذمہ میں لازم ہونا اس کے لئے کسی مضرت کا باعث نہیں ہے۔

دین کے مانع زکوٰۃ ہونے کے سلسلہ میں اہم ترین دلیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وہ ارشاد ہے جو انہوں نے برسر منبر صحابہ کرام کے مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”ہذا شہر زکاتکم فمن کان منکم علیہ دین فلیقض دینہ حتی تخلص أموالکم، فتؤدون عنها الزکوٰۃ“ (بخاریہ ۲۵۱/۱)۔

الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ اس روایت کو امام مالک، امام شافعی اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے، (موطا امام مالک مع واو جز ۲/۳، کتاب الواہلہ فی ۲/۲، مسند امام شافعی ۹۸، مصنف ابن ابی حنیبلہ ۲/۳، سنن ابی نعیم ۱۵۰/۳، دیکھئے المغنی لابن قدامہ ۲/۶۸، فقہ الاسلاوی وادلہ ۲/۴۸)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے بقدر مال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جانا، ادائیگی کی ضرورت کی وجہ سے ہے، جس سے یہ مفہوم نکالا جاسکتا ہے کہ منع زکوٰۃ میں وہی دین موثر و معتبر ہوگا جس کی ادائیگی کی ضرورت درپیش ہو اور جس کی ادائیگی سے

مال زکوٰۃ کم یا ختم ہو جائے، لیکن وہ دین جو لازم فی الذمہ تو ہو مگر موجودہ اموال زکوٰۃ سے اس کی ادائیگی کی ضرورت درپیش نہ ہو اور اس کی وجہ سے مال زکوٰۃ پر کوئی اثر نہ پڑے تو وہ دین مانع زکوٰۃ نہ ہوگا۔

مذکورہ قسم کے طویل المیعاد قرضوں میں اگرچہ پوری رقم ذمہ میں واجب ہوتی ہے، مگر موجودہ موجب زکوٰۃ سرمایہ سے ادائیگی صرف سالانہ طے شدہ قسط ہی کی اس کے ذمہ لازم ہوتی ہے، بقیہ قرض کی ادائیگی کی نہ اسے فکر ہوتی ہے، نہ اس کے مطالبہ کا کوئی خدشہ ہوتا ہے۔ اس لئے نظر و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ مانع زکوٰۃ ہونے میں قرض کی پوری رقم کا اعتبار نہ کیا جائے، بلکہ صرف سالانہ واجب الادا قسط ہی کو موجب زکوٰۃ سرمایہ سے منہا کر کے بقیہ مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔

مذکورہ طویل المیعاد قرضوں کو مہر مؤجل کی نظیر قرار دیا جاسکتا ہے جس کے متعلق بعض مشائخ احناف کا فتویٰ ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ نہیں، کیونکہ عادتاً اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا (بدائع الصنائع ۶/۲)۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

مواشی کے ماسوا اموال زکوٰۃ میں جمہور ائمہ و فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ کے حق میں شرکت کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وجوب زکوٰۃ میں ہر شریک کی انفرادی ملکیت کا اعتبار ہوگا، اگر وہ بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں، چاہے اموال شرکت کی مجموعی مقدار جتنی بھی ہو، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور صحیح قول کے مطابق امام احمد کا یہی مذہب ہے، امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے (المغنی لابن قدامہ ۶/۲، الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۳/۲۵۷)۔

امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت اور امام شافعیؒ کا قول جدید و راجح یہ ہے کہ اموال

شرکت میں انفرادی ملکیت کا اعتبار نہیں، پورے سرمایہ کو ایک آدمی کے مال کے حکم میں رکھ کر اس پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی۔

”وعن أحمد رواية أخرى أن شركة الأعيان تؤثر في غير الماشية“  
(المغنی ۶/۱۹۲)، اس پوری بحث کو علامہ و بہ ذیلی نے الفقہ الاسلامی وادلتہ (۸۳۹/۲) میں نقل کیا ہے۔

احناف کے نزدیک تمام اموال زکوٰۃ میں مویشی ہوں یا غیر مویشی وجوب زکوٰۃ کے لئے انفرادی ملکیت نصاب ضروری ہے، مشترک مجموعی سرمایہ کا اس میں کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مالک نصاب ہونا ضروری ہے اور اموال شرکت میں جن کے حصے بقدر نصاب نہیں ہیں، وہ مالک نہیں، اس لئے ان کے مال میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاسکتی (دیکھئے بدائع الصنائع ۲/۲۹۷)۔

شرکت کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں امام شافعی کا قول احوط اور جمہور ائمہ کا قول راجح و اقرب الی القیاس ہے۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہر اگر تجارت کے لئے ہوں تو بالاتفاق ان میں زکوٰۃ واجب ہے اور اگر زیورات کی شکل میں محض تزئین و آرائش کے لئے ہوں تو بالاتفاق ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔  
لیکن جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنا سرمایہ محفوظ کرنے کی بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

نصوص فقہیہ کے عموم سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مگر میری رائے میں ایک پہلو سے ان پر زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے، اس خاص صورت میں جبکہ

ہیرے جوہرات کی خرید صرف نقد کے متبادل کے طور پر ذخیرہ اندوزی کی غرض سے ہو اور بذات خود انہیں کسی ذاتی استعمال میں لانے کا کوئی ارادہ نہ ہو، بلکہ مقصد صرف حسب ضرورت ان کے تبادلہ کے ذریعہ اشیاء ضرورت کا حصول ہو تو خرید نے والے کے حق میں ہیرے جوہرات کو منین کی طرح اموال تجارت کے حکم میں رکھ کر ان پر زکوٰۃ واجب قرار دینی چاہئے۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

#### کون سی قیمت معتبر ہوگی؟

اموال تجارت کی قیمت کی تعیین میں قیمت خرید کا کوئی اعتبار نہیں، اس سلسلہ میں شہر کے موجودہ بازار بھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا، ایک قول کے مطابق سال پورا ہونے کے دن کی قیمت معتبر ہوگی اور ایک قول کے مطابق ادائیگی کے دن کی قیمت، تھوک بھاؤ سے قیمت لگانے میں البتہ کوئی حرج نہیں، دیکھئے: (فقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۹۲، ۷۶۰، کتاب الفقہ علی المذہب الاربعہ ۱/۶۰۷، الدرعی رد المحتار ۲/۲۲، اشراح مشیر لدردیر لہا لگی ۱/۶۳۹)۔

### اراضی کی زکوٰۃ

تجارت کی غرض سے خریدی گئی زمین کی زکوٰۃ میں تھوڑی تفصیل ہے، اگر زمین خراجی ہے تو اس میں صرف خراج واجب ہے اور اگر زمین عشری ہے اور اس میں کاشت کر دی گئی تو اس میں صرف عشر واجب ہے، احناف کے نزدیک کسی بھی مال میں تجارت کے معتبر ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دہری زکوٰۃ لازم نہ آئے، اس لئے جس زمین میں عشر یا خراج واجب ہو اس میں نیت تجارت معتبر نہ ہوگی (رد المحتار ۲/۱۳، ۱۵)۔

فقہاء احناف کا مشہور اور ظاہر مذہب یہی ہے کہ عشر و خراج میں سے کسی کے ساتھ زکوٰۃ کا اجتماع نہیں ہو سکتا، البتہ امام محمد سے ایک روایت یہ منقول ہے کہ بیک وقت ایک ہی زمین

میں عشر یا خراج کے ساتھ زکوٰۃ بھی واجب ہو سکتی ہے (بدائع الصنائع ۲/۵۷۷)۔  
لیکن جس زمین میں خراج واجب نہ ہو اور عدم کاشت کی وجہ سے عشر بھی واجب نہ ہو، اس کی خریداری اگر تجارت کی غرض سے کی گئی ہو تو بلاشبہ اس کی قیمت میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ اس زمین کے مال تجارت قرار دینے سے کوئی چیز مانع نہیں، اس لئے جو حکم جملہ اموال تجارت کا ہے وہی حکم اس زمین کا بھی ہوگا۔

### شیرز اور بونڈ زکی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز میں مال تجارت ہونے کی حیثیت سے یقیناً زکوٰۃ واجب ہوگی اور شیرز میں لگے ہوئے اصل اور اس پر حاصل شدہ منافع کی مجموعی مالیت و قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کی جانی چاہئے، البتہ صنعتی استثماری کمپنیوں کے شیرز میں عمارات، آلات اور مشینوں کی لاگت کا حصہ شیرز سے منہا کرنے کے بعد بقیہ اصل و منافع ہی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، شیرز کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

شیرز کی رسیدات حقیقتہً مال تجارت نہیں ہیں، اس لئے ان کی مارکیٹ قیمت کا لحاظ میرے نزدیک محل نظر ہے، شیرز کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں دکتور وہبہ زحیلی نے طویل بحث کی ہے (دیکھئے: فقہ الاسلامی وادانہ ۲/۷۷۳)۔

بونڈ چونکہ دین کی سند ہے، اس لئے اس کا حکم وہی ہوگا جو دین کا ہوتا ہے، کیش کرانے سے پہلے اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری نہیں، مگر اسے کیش کرانے کے بعد اس میں سالہائے گذشتہ کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور زکوٰۃ میں بونڈ کی صرف اصل رقم کا اعتبار ہوگا، اس کی بازاری قیمت قطعاً معتبر نہ ہوگی، کیونکہ اصل جمع شدہ رقم سے اس کی زائد جو قیمت ہوگی وہ ربایا بدل رہا ہوگی جو ایک مسلمان کے حق میں ناقابل انتفاع ہونے کی وجہ سے کالمعدوم ہے۔



## نصاب زکوٰۃ

سونا اور چاندی میں سے کس کا نصاب اصل اور معیاری ہے اس کا فیصلہ کر پانا بے حد مشکل ہے، نصوص شرع میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر کسی ایک نصاب کو اصل و معیاری اور دوسرے کو اس کے تابع قرار دیا جائے، اسی وجہ سے جمہور نے دونوں نصابوں کو مستقل اور مساوی حیثیت دی ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے لئے معیار قرار نہیں دیا (دیکھئے: المغنی ۳/۶۰۳، بولبیہ الجہد ۱/۱۸۶)۔

البتہ بعض علماء سلف نے چاندی کے نصاب ہی کو اصل قرار دیا اور اسی کو سونے کے نصاب کے لئے بھی اصل معیار قرار دیا، ان کے بقول سونا میں مثقال سے کم ہو یا زائد، اگر اس کی قیمت دوسو درہم کے مساوی یا اس سے زائد ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں (بولبیہ الجہد ۱/۱۸۶، ۱۸۸، نیز دیکھئے فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۵/۱۲، المغنی ۳/۶۰۳)۔

عہد نبوی میں جب کہ نصاب زکوٰۃ کی تعیین کی گئی ایک دینار یا ایک مثقال سونا قیمتاً دس درہم کے مساوی تھا، اس طرح دوسو درہم چاندی اور بیس مثقال سونا میں مالیت و قیمت کے اعتبار سے کوئی تفاوت نہیں تھا۔

لیکن آج کے دور میں سوال نامہ کے الفاظ میں سونے اور چاندی کے نرخ میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ سونے کا نصاب بیس مثقال (قریباً سو گرام) مالیت اور قدر و قیمت میں چاندی کے نصاب دوسو درہم (قریباً سات سو گرام) سے قریب قریب دس گنا زیادہ ہے اور چاندی کا نصاب قیمتاً سونے کے نصاب کا صرف دسواں حصہ ہے، اب یہ عجیب و غریب صورت حال درپیش ہے کہ سونے کے نصاب کے اعتبار سے پچاس ہزار روپے پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اگر وہ مثقال سونے کی قیمت سے کم ہو اور چاندی کے نصاب کے اعتبار سے اس سے دس گنا کم پانچ ہزار روپے کی املاک پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر

وہ دوسورہم چاندی کی قیمت کے مساوی ہو، اس طرح غناہ موجب زکوٰۃ کے دو الگ الگ ایسے معیار ہو جائیں گے جن میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جب کہ عہد نبوی میں یہ فرق یکسر معدوم تھا اور معیار غناہ بہ ظاہر مختلف ہونے کے باوجود حقیقتہً ایک ہی تھا، سونے اور چاندی کے دونوں نصاب قدراً متحد تھے۔

دور اجتہاد و مدوین فقہ میں بھی غالباً سونے اور چاندی کے نصابوں میں قیمتاً کوئی قابل لحاظ فرق واقع نہ ہوا تھا، اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین نے اس پہلو پر کوئی خاص توجہ نہ کی اور جمہور فقہاء نے دونوں نصابوں کو یکساں حیثیت دی، سونے اور چاندی میں تو قیمت کا سرے سے اعتبار ہی نہیں کیا گیا اور اموال تجارت کی تقویم میں دونوں نصابوں کو یکساں طور پر معیار تسلیم کیا، ائمہ کرام کی ترجیحات اگرچہ مختلف تھیں مگر اس وقت کے لحاظ سے ان میں کوئی بڑا اختلاف نہ تھا۔

اموال تجارت کی تقویم میں بعض ائمہ نے تھد خرید کو ترجیح دی اور بعض نے نقد غالب کو، اور بعض نے بلا کسی فرق و لحاظ کے دونوں کو یکساں قرار دیا اور اکثر فقہاء نے جانب فقراء کی رعایت سے شمنین میں سے نسبتاً کم قیمت والے شمن کو ترجیح دی، دیکھئے: (ہدایہ ۱/۱۷۶، ۱۷۵، بدائع الصنائع ۲/۲۱۲، المغنی ۳/۳۳)۔

### سونے و چاندی کا مخلوط نصاب

اگر کسی کے پاس کچھ چاندی اور کچھ سونا موجود ہو اور منفرداً کوئی بھی بہ قدر نصاب نہ ہو تو جمہور کے نزدیک دونوں کی مجموعی قدر کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی، موجودہ حالات میں کیفیت ضم کے سلسلہ میں وہ قول قابل ترجیح ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں یا تو قیمت کا سرے سے اعتبار ہی نہ کیا جائے اور ضم بالاجزاء کیا جائے یا پھر عہد نبوی میں موجودہ قیمت کا اعتبار کیا جائے، یعنی ایک دینار کو دس درہم کے مساوی مان کر مخلوط نصاب بنایا جائے،

حسن بصری، قتادہ، ابراہیم نخعی، اوزاعی، مالک، احمد بن حنبل، ابو یوسف اور محمد بن الحسن رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے، امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے، (بدائع الصنائع ۱۹/۲، فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۳/۲۵)۔

### تقویم عروض

موجودہ حالات میں غناء موجب زکوٰۃ کی تعیین اور تذبذب کی حالت سے نکلنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اموال زکوٰۃ کی تقویم میں نقدین میں سے کسی ایک کو ترجیح دیا جائے اور اسی کو معیار نصاب قرار دیا جائے۔

دور جدید کے بعض اہل علم خصوصاً عرب علماء کا رجحان یہ ہے کہ اموال تجارت اور کاغذی نقد کی تقویم میں سونے کے نصاب کو معیار بنایا جائے اور اسی کے ذریعہ مالیت کی تعیین کی جائے (دیکھئے: تعلق الدكتور مصطفیٰ کمال و صفی علی المشرح المصغیر ۱/۵۸۶، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۸۶۵)۔

لیکن ہم اس رجحان کی وکالت نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں احتیاط و نفع للمنفقہ کی رعایت یکسر نظر انداز ہو جاتی ہے جس کا لحاظ بیشتر علماء و فقہاء نے کیا ہے، پھر چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے حتیٰ کہ بعض فقہاء سلف کے نزدیک وہی اصل نصاب ہے اور جملہ اموال حتیٰ کہ سونے کے لئے بھی وہی معیار ہے جب کہ سونے کا نصاب مختلف فیہ ہے اور ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے بھی اسے اصل اور معیاری نصاب قرار نہیں دیا ہے، اس لئے چاندی کے نصاب کو نظر انداز کر کے سونے کے نصاب ہی کو معیار قرار دینا احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ترجیح کی صورت میں چاندی کے نصاب کو ترجیح دینا زیادہ مناسب اور احوط ہے، عصر حاضر کے بیشتر علماء کی یہی رائے ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۶۰)۔

لیکن اس صورت کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں سونے کا نصاب متروک اور یکسر نظر انداز ہو جاتا ہے، جب کہ معدودے چند فقہاء سلف کو چھوڑ کر بقیہ سبھی علماء امت نے دونوں

نصابوں کو مساوی حیثیت دی ہے، ہاں بیشتر علماء نے دونوں نصابوں کی مالیت میں کمی بیشی کی صورت میں اَحْظَ وَالْفَقْرَاءَ كَوْتَرَجِحَ دیا ہے، یہ وجہ ترجیح اس وقت یقیناً نہایت معقول و مناسب تھی جب کہ دونوں نصابوں کی قدر میں بہت نمایاں فرق نہ تھا اور دونوں نصابوں میں سے ہر ایک میں عملاً اَحْظَ لِلْفَقْرَاءِ بن سکنے کا امکان تھا، لیکن موجودہ دور میں صرف فقراء کی حصہ داری کی ایسی رعایت جس کے نتیجے میں سونے کا نصاب بالکل متروک و مہجور ہو جائے، میرے خیال میں مناسب و بر محل نہیں کہا جاسکتا۔

### مخبر ثالث - مصارف زکوٰۃ

۱- کسی ادارہ میں ایک طالب علم کے قیام، طعام اور دیگر سہولتوں کی فراہمی میں ماہانہ جو خرچ آتا ہے وہ طلبہ سے وصول کیا جائے اور مستحق زکوٰۃ طلبہ کو اس کی ادائیگی کے لئے مد زکوٰۃ سے وہ رقم دے دی جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ نسبتاً یہ تملیک کی بہتر شکل ہے۔ لیکن اگر وہ رقم ہر راستہ ادا کر دی جائے اور طلبہ کو دی نہ جائے تو تملیک نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

رہ گیا یہ سوال کہ مدرسہ کے مہتمم اور سفراء زکوٰۃ دہندگان کے وکیل ہیں یا مستحقین زکوٰۃ کے؟ تو میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دہندگان کے وکیل ہیں، مستحقین زکوٰۃ کے وکیل نہیں ہیں۔

میری رائے اس سلسلہ میں وہی ہے جو حضرت تھانویؒ و حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ہے، ”امداد الفتاویٰ جلد دوم کے استفتاء ۶۸ و ۹۱“ کے جوابات سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔  
حضرت مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں:

”آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر

صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عالمین صدقہ کا آیت میں مذکور ہے، کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمنوں کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں ہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف میں خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل نہیں بنایا اور امیر المؤمنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بہ خود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لئے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل مقرر کر دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو“ (سحارف القرآن ۳۹۹/۳)۔

۲۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ سفراء مدارس عالمین صدقہ کی حیثیت نہیں رکھتے، اس وجہ سے زکوٰۃ کی رقم تنخواہ میں نہیں دی جاسکتی، لیکن اگر الگ سے تنخواہ یا اجرت فی صد وصولی کے اعتبار سے مقرر کی جائے تو بھی صحیح نہیں، کیونکہ یہ اجارہ کا معاملہ ہے اور اجارہ میں اجرت معلوم و متعین ہونی چاہئے (ہدایہ ۳/۲۷۷)۔

جدید فقیہی تحقیقات

۶

تیسرا باب

مختصر جوابات

## زکوٰۃ سے متعلق سوالنامہ کا اجمالی جواب

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی ✽

### محو راول

جیسا کہ معروف ہے ”اموال نامی“ میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔  
ملک تام: جس پر آزاد بالغ مالک (غیر سفیہ اور غیر مجبور) کو شرعاً تصرف کا پورا اختیار ہو  
اور اس میں وہ کسی دوسرے کی اجازت کا محتاج نہ ہو، اگر اس کے قبضہ میں مال بالفعل نہیں ہے، مگر  
اس پر قبضہ ہو جانا مطلق ہو۔

### ذیلی سوال (۱) کا جواب

۱۔ جس مال (مبیع) کی قیمت ادا کر دی گئی اور وہ مال (مبیع) قبضہ میں نہیں آیا، اگر عقد  
تام ہونے کے بعد قیمت ادا کی گئی ہے تو اس مال (مبیع) کی چاہے ابھی قبضہ میں نہ آیا ہو، زکوٰۃ  
مشتری پر لازم ہوگی (اگر وہ مال تجارت ہے) ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ اب مشتری پر لازم نہ ہوگی،  
کیونکہ وہ قیمت مشتری کی ملکیت سے نکل گئی، البتہ اس قیمت کی زکوٰۃ بائع پر، جو کہ اب اس قیمت  
کا مالک بن چکا ہے، لازم ہوگی۔ (اگر وہ صاحب نصاب ہے اور حولان حول ہو چکا ہے)۔  
۲۔ اگر کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان (یا دکان وغیرہ) کو دی گئی رقم بہ طور اجرت

(کرایہ) دی گئی ہے تو اس رقم کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط و وجوب پائے جانے کی صورت میں) مالک مکان (یا دکان) پر لازم ہوگی، لیکن اگر یہ رقم (کرایہ دار نے) بطور ضمانت دی ہے تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہوگی (اسباب و شرائط و وجوب کی موجودگی میں)، کیونکہ اس رقم کی حیثیت، یا قرض کی ہے (اگر تصرف کا اختیار دیدیا ہے) یا امانت کی، دونوں صورتوں میں اس کی زکوٰۃ رقم دینے والے پر لازم ہوگی۔

۳۔ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، کی مثال میں مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو پیش کرنا محل نظر ہے، علاوہ ازیں شریعت میں اس کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے (سوائے بیع بشرط الخیار کی شکل کے، وہ بھی مختلف فیہ ہے) کہ ایسا مال بھی ہوتا ہے جس کا کوئی مالک معین نہ ہو، لہذا یہ سوال ہی خود محل سوال ہے۔ (ہاں یہ ممکن ہے کہ مالک معلوم نہ ہو) مدارس میں جمع کی جانے والی رقم پر مدارس کے ذمہ داروں کی ملکیت کا قائم ہو جانا (طلبہ مستحق زکوٰۃ کی نیابت میں) اکابر علماء کا راجح قول ہے، جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اختیار کیا ہے اور حضرت تھانوی کا بعد میں مختار ہونا بھی بتایا ہے، حضرت گنگوہی و حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا محقق قول ہونا تو معروف ہی ہے (جوہر اللہ ۳۸۷-۳۸۸ طبع دیوبند)، لہذا اس رقم کی جو کہ مدارس کے ذمہ داروں کے قبضہ کے اندر طلبہ مستحق زکوٰۃ کی ملکیت میں ہے۔ زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہ ہوگی۔

۴۔ مال حرام و حلال کے مخلوط ہو جانے کی شکل میں بھی چونکہ بقدر حرام کا تصرف واجب ہے اور اس کے بقدر گویا دین واجب فی الذمہ ہے، صرف حلال مال کی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کل حرام مال کے بقدر تصدق واجب ہوگا۔ (جیسا کہ شامی کی ”مصادرة السلطان“ وغیرہ والی بحث سے مستفاد ہوتا ہے)۔

۵۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی (جیسا کہ ظاہر ہے) اگر مدیون ادائیگی میں وسعت کے باوجود مال منول کر رہا ہو تو گناہ گار ہوگا، مگر زکوٰۃ کی ادائیگی اس کے ذمہ نہ ہوگی، ہاں!



اگر اس نے دین سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کیا تو نفع بقدر مال کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط کے ساتھ) مدیون پر واجب ہوگی (جیسا کہ مال مستفاد کی)۔

دائن دین کی وصولیابی کی امید کی صورت میں ہر سال کی زکوٰۃ چاہے ہر سال ادا کرے، یا وصول ہونے پر تمام گذشتہ سالوں کی اکٹھی، دونوں شکلیں جائز ہیں، لیکن اگر مال وصول ہونے کی امید بالکل نہ ہو اور مال ضماریہ کے مثل ہو، تو اس کا حکم مال ضماریہ جیسا ہوگا۔

۶- رٹرنمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کے وصول ہو جانے کی صورت میں ہی اس پر ملکیت آئے گی، اس سے قبل نہیں، لہذا اس سے متعلق تمام مالی ذمہ داریاں۔ وجوب زکوٰۃ وغیرہ۔ بعد میں ہی متعلق ہوں گی، اس سے پہلے نہیں، اس لئے زکوٰۃ بھی وصولیابی کے بعد ہی واجب ہوگی، گذشتہ مدت کی واجب نہ ہوگی۔

دوسری شرط نما، یعنی اضافہ کی صلاحیت

اس کی دو قسمیں ہیں: حقیقی و حکمی۔ حقیقی کی مثال مال تجارت، سوائم وغیرہ۔ حکمی کی مثال نقدین، یا اس کے قائم مقام کرنسی (خواہ وہ کاغذ کی ہو یا وصالت کی)۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت کا مفہوم تو معروف ہے اور تمام متعلق کتابوں میں موجود ہے، کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر ماحول کے اعتبار سے ان چیزوں کا تعین ہوگا، جن پر ”حاجیات“ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور کتب فقہ کی تفصیلات پیش نظر رکھنے سے حیثیت کے فرق سے بھی حاجیات کے مصداق میں فرق ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہو جانا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ اس کا جواب عام کتب فقہ میں ملتا ہی ہے، سوالنامہ میں

کوئی نئی بات نہیں دریافت کی گئی ہے، اس لئے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں معلوم ہوا۔  
دین کی معروف تین قسموں: — قوی، متوسط، ضعیف — میں سے پہلی دو قسمیں  
متفقہ طور پر مانع زکوٰۃ ہیں۔

ہر دین قوی مانع زکوٰۃ ہے، خواہ وہ طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد، خواہ قلیل مقدار میں ہو،  
یا کثیر میں، اس لئے پورا قرض منہا کرنے کے بعد، خواہ وہ لاکھوں میں ہو اور اس کی ادائیگی طویل  
مدت میں کیا جانا طے ہو، اگر بقدر نصاب کا مالک رہتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔  
کمپنیز پر زکوٰۃ: کمپنی میں شریک ہر فرد کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، جس شریک کا  
حصہ (یا اس کی ملکیت میں کل مال) نصاب زکوٰۃ کے بقدر ہوگا، اس پر زکوٰۃ، اپنے حصہ کے  
بقدر واجب ہوگی، اور جس کا حصہ (ملکیت میں کل مال) نصاب سے کم ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب  
نہ ہوگی۔

### ہیرے جواہرات

اگر تجارت کے لئے نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ ان کی مالیت کتنی ہی ہو،  
اور خواہ وہ اکلم نکس (یا زکوٰۃ) سے بچنے کی غرض سے ہی خریدے گئے ہوں، البتہ ہیرے جواہرات  
حوائج اصلیہ میں سے نہ ہونے کی بناء پر ان کے مالکین پر صدقہ فطر اور قربانی کا وجوب  
ہوگا (بشرطیکہ جواہرات کی قیمت بقدر نصاب ہو) اور ان کے مالکین صدقات واجبہ کا مصرف نہیں  
ہوں گے، یہی حکم ان خواتین کے بارے میں بھی ہوگا جن کے پاس ہیرے جواہرات ہیں، خواہ وہ  
ترمیم کے لئے ہوں، یا کسی اور غرض سے (بس تجارتی مقصد سے نہ ہوں)۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا ذکر تمام کتب فقہیہ حنفیہ میں ملتا ہے، مثلاً  
شامی میں ہے:

”لا زکاة فی اللآلی و الجواہر إلا أن تكون للتجارة“ (رد المحتار ۴/ ۱۳)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

صاحب نصاب تاجر حوالان حول کے وقت جتنے مال کا مالک ہے اور اس وقت اس کی ملکیت میں موجود مال تجارت کی جو قیمت ہے (یعنی اس مال کی جو قیمت اسے ملے گی) اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تاجر اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کے بقدر، اگر خوردہ فروش ہے تو خوردہ قیمت کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وہ تجارتی مال خواہ منقول ہو، یا غیر منقول (اراضی وغیرہ) سب کا حکم یکساں ہوگا، یعنی وہی جو اوپر مذکور ہوا، کہ حوالان حول کے وقت تاجر کو جو قیمت ملے گی اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ وہ شیرز دراصل علامت (یا سند) ہوتے ہیں اس مال کی جو کمپنی کی ملکیت میں مال تجارت ہے۔

شیرز کے مالک کے پاس حوالان حول کے وقت موجود جو قیمت شیرز کی ہوگی اسی کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس شخص نے جو قرضہ کسی کو خواہ حکومت کو دیا ہے اصل قرضہ پر نہ کہ سود پر زکوٰۃ واجب ہوگی قرض دینے والے پر ان تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی جو قرض کی ادائیگی میں لگیں گے، اب چاہے ہر سال زکوٰۃ ادا کرتا رہے، یا تمام سالوں کی وصولی قرضہ کے بعد اکٹھا کر دے۔

### مخبر ثانی

چاندی سونے میں سے جو نصاب بھی ”نفع للمفقر“ ہو، وہی اصل تسلیم کیا جائے گا۔

## محور ثالث - مصارفِ زکوٰۃ

۱- طالب علم پر آنے والے کل اخراجات (بشمول رہائش و تعلیمی فیس) کے بقدر اگر مد زکوٰۃ سے مدرسہ کے ذمہ دار، مستحق زکوٰۃ طالب علم کو رقم پہلے دے دیں اور پھر وہ ان سے وصول کر لیں تو یہ شکل جائز ہے، چیک سے ادائیگی کی شکل میں ادائیگی اس وقت سمجھی جائے گی جب کہ چیک کی رقم طالب علم کو وصول ہو جائے، اگر اس کا بینک میں کھاتا ہے تو اس کے کھاتہ میں اندراج ہو جائے اس کے بغیر نہ ہوگی۔

(بحوالہ اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت گنگوہی، حضرت سہارنپوری، حضرت تھانوی اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ کا آخری نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران (مہتمم وغیرہ) طلبہ کے وکیل ہوتے ہیں، لہذا ان کا قبضہ طلبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہے)۔

۲- زکوٰۃ وصول کرنے پر مدارس کے سفراء وغیرہ کو کمیشن دینا شرعاً درست نہیں، انہیں ”العالمین علیہا“ کے تحت داخل کرنا بھی مشکل ہے، کیونکہ ”العالمین“ کی تعریف یہ کی گئی ہے:

”هو الذي يبعثه الإمام لأخذ الصدقات“ (احکام القرآن للجصاص ۳/۱۲۳)۔

جصاص رازی نے جبری وصولی کا حق بھی امام کے لئے اسی سے ثابت کیا ہے، ظاہر ہے کہ مدارس کے ذمہ دار نہ امام ہیں اور نہ انہیں جبری وصولی کا حق ہے، مدارس کے منشی وغیرہ جو زکوٰۃ کی آمد و صرف کے حساب کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دینا شرعاً درست نہیں۔

”فی سبیل اللہ“ کا مصداق صرف وہ ہے جسے خیر القرون میں مصرف قرار دیا گیا، یعنی اصطلاحی جہاد میں مشغول افراد، بقیہ قول ضعیف اور بعض، مثلاً سوالنامہ میں مذکور دوسرا تیسرا تو نہایت ضعیف ہیں، ایسے کمزور دلائل، جیسے کہ ان قول کے قائلین نے دیئے ہیں، ان کی بنیاد پر تو

ہر غلط کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے، اس طرح پوری شریعت ہی کو مسخ کیا جاسکتا ہے، یوں بھی جمہور کے قول ہی میں سلامتی ہے۔

بغیر شدید مجبوری کے اس سے عدول جائز نہیں سمجھا گیا، مگر اولیٰ میں اگر کسی آیت کی تشریح میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو تیسرے قول کا اختیار کرنا درست نہیں، کیونکہ یہ بھی ایک طرح کا خرق اجماع ہے (جسے اصولیین نے لا قائل بالفصل جیسی تعبیرات میں بیان کیا ہے) اور پھر اس طریقہ سے تو ہر غلط بات کو صحیح قرار دینے، بلکہ ہر خواہش کے لئے سند دریافت کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔

الف: فی سبیل اللہ کا مصداق اصلاً تو غازی ہے، زیادہ سے زیادہ منقطع الحاج (امام محمد کے قول کی رو سے) بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس کی شمولیت پر احادیث صحیحہ دل ہیں (جن کا ذکر سوالنامہ میں بھی ہے)۔

ب: احناف کے نقطہ نظر سے ہر مصرف کے لئے (سوائے العالمین علیہا کے) فقر شرط ہے۔

۵۔ مصارف زکوٰۃ بھی رکعات صلوٰۃ کی طرح قیاس کا محل نہیں، ظاہر ہے کہ فکری و قلمی جہاد نئی تعبیریں ہیں، بنا بریں جہاد قلمی و فکری فی سبیل اللہ کا مصداق نہیں بن سکتے اور ان میں مشغول لوگ (اگر وہ محتاج نہیں ہیں) مستحق زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہی میں منحصر ہیں اور یہ حصر اضافی نہیں حقیقی ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم حتیٰ کہ صحابہ کے تفردات اور شاذ اقوال پر مدار رکھنا سلف کے طریقہ کے خلاف ہونے کے ساتھ نہایت خطرناک اقدام ہے، جس سے بہت سی بے راہ رویوں، بلکہ گمراہیوں کے لئے راستہ کھل سکتا ہے، امام اوزاعی کا یہ قول: "من أخذ بنوا در الإسلام خرج عن الإسلام" قابل توجہ ہے۔

## جوابات بابت سوالات زکوٰۃ

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

### محو راول

۱۔ جس تجارتی سامان کی قیمت پیشگی ادائیگی کی جا چکی ہے مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حصکھی نے ایسے سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں:

”إلا في ما اشتراه للتجارة قبل قبضه“ (درمختار علی ہاشم الرمدی ۷۲)۔

۲۔ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی۔ اس لئے کہ اس کو اس مال پر ملک تام حاصل ہو چکا ہے، ملک تام کے لئے فقہاء نے ملکیت رقبہ اور قبضہ کی شرط لگائی ہے اور یہ دونوں باتیں یہاں مالک مکان کو حاصل ہیں، البتہ جو رقم مالک مکان کو بطور ڈپازٹ دی گئی ہے اور مدت کرایہ مکمل ہونے پر یہ رقم واپس ہوتی ہے اس کی حیثیت اگر کرایہ دار کی طرف سے امانت مانی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے مالک مکان پر چونکہ اس کی حیثیت دین کی ہے اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے، لیکن امانت اور اس زر ضمانت میں فرق یہ ہے کہ امانت کبھی بھی واپس لینا ممکن ہوتا ہے، جبکہ یہاں کرایہ دار ہوتے ہوئے اس بات کا اختیار نہیں

رکھتا کہ کرایہ کی رقم واپس لے، اس لئے رقم کی حیثیت ”رہن“ کی سی ہے، جیسے مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہوتی ہی نہ مرہن پر یہی حکم اس کا بھی ہونا چاہئے، کیونکہ رہن کی طرح اس ضمانت کی حیثیت بھی ایک ایسی رقم کی ہے جو وثیقہ کی حیثیت سے اس کے پاس رہتی ہے۔ علامہ شامی نے مال مرہون کے متعلق لکھا ہے:

”ولا فی مرہون آی لا علی المرتہن لعدم الملک الرقبة ولا علی الراہن لعدم الید“ (رد المحتار ۷/۷۲)۔

۳- زکوٰۃ کا مخاطب شریعت نے افراد کو بنایا ہے نہ کہ اداروں کو، اس لئے دوسری عبادت کی طرح زکوٰۃ کا تعلق بھی افراد سے ہے، دوسرے زکوٰۃ کیلئے شریعت نے ملک بلکہ ملک تام کی شرط لگائی ہے اور دینی مدارس اور ایسے دوسرے خیراتی ادارے اپنے فنڈ کے مالک نہیں ہوتے بلکہ وقفین اور معاونین کی طرف سے محض وکیل ہوتے ہیں، اس لئے مدارس وغیرہ کے پاس جو مال ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۴- مال حرام میں بنیادی طور پر زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن وہ مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ حرام و حلال مال کے درمیان شناخت ممکن نہ رہے تو دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ فقہاء کا معروف و مسلم اصول ہے، اسی قاعدہ کا اطلاق مال رشوت اور بینک کے سود وغیرہ پر بھی ہوگا۔ شامی میں ہے:

”ولا زکوٰۃ فی المغصوب والمملوک شراء فاسد والمراد بالمغصوب ما لم یخلطہ بغيرہ لعدم الملک“ (رد المحتار ۵/۷۲)۔

۵- دین کی تین قسمیں کی گئی ہیں: دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔

قرض کی رقوم اور سامان تجارت کا عوض جو باقی ہو دین قوی کہلاتا ہے، تجارتی سامان کے علاوہ کسی اور مال کی قیمت باقی ہو تو اس کو دین وسط کہتے ہیں، جو مال کسی مال کے بدلے میں

باقی نہ ہو، بلکہ کسی اور شئی کے عوض باقی ہو، جیسے مہر، بدل خلع، دین وغیرہ تو اس کو دین ضعیف کہتے ہیں۔

فقہاء کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ دین قوی اور دین وسط میں تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لیکن دین ضعیف میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، جبکہ وہ قبضہ میں آجائے اور پھر اس پر سال گذر جائے، دین قوی اور دین وسط میں قبضہ سے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے فرق یہ ہے کہ دین وسط میں تمام رقم اکٹھی وصول ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرے گا، اور دین قوی میں نصاب کا ایک ٹکس وصول ہونے پر۔

یہ زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں بنیادی اصول ہیں، ان کو سامنے رکھ کر دیون کے سلسلہ میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

#### ۶- پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کی حیثیت اجرت کی ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ماضی قریب کے اکابر علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے دو متضاد رائیں منقول ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی محمد جمیل صاحب نے حضرت تھانوی ہی کی ایماء پر اس مسئلہ میں مزید تحقیق فرمائی اور جس نتیجے پر پہنچے وہ انہیں حضرات کے الفاظ میں یوں ہے:

”الفرض پراویڈنٹ فنڈ کاروبار یا دین قوی میں داخل نہیں ہو سکتا، اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے، جب تک کہ حرکی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی صحیح روایات پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے“ (امداد الفتاویٰ ۲/۳۸۸)۔



## حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جو انسان کی شخصی ضروریات کی ہوں، علامہ طحاوی نے حاجت اصلیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

”كشيب المحتاج إليها لدفع الحر والبرد وكالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والحرفة وأساس المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها“ (طحاوی، ۳۸۹)

ظاہر ہے جب ”حاجت اصلیہ“ کا تعلق انسانی ضروریات سے ہے تو مختلف افراد مختلف ماحول اور مختلف طبقوں اور پیشوں کے اعتبار سے حاجت اصلیہ کا تعین عمل میں آئے گا۔

## دین سے محفوظ ہونا

دین، حنفیہ کے یہاں زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہے اور اس کا مقصد مدیون کو حرج و تنگی سے بچانا ہے، لیکن آج کل جو ترقیاتی طویل لاجل ترقی اردنیے جاتے ہیں، ان سے مدیون زبردست معاشی فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے ہر سال ایک معمولی قسط ہی ادا کرنی پڑتی ہے، اس طرح اگر پورا دین اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاتا رہے تو فقراء حق سے محروم ہوتے ہیں، حالانکہ ان کی زکوٰۃ ادا کرنے میں مدیون کے لئے ایسا حرج نہیں ہے جس کو شریعت دفع کرنا چاہتی ہے، اس لئے یہ درمیانی رائے بہت مناسب ہے کہ ہر سال اس کو جو قسط ادا کرنی ہے اتنا حصہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور باقی دین مستثنیٰ کئے بغیر اس کے مال میں زکوٰۃ واجب ترقی اردنی جائے۔

## کمپنی پر زکوٰۃ

حنفیہ کے یہاں اموال میں شرکت اور خلط کا کوئی اثر نہیں، یہ متفق علیہ قاعدہ ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں حیوانات میں شرکت زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہونا

ہے، لہذا کمپنی کے مجموعی حصص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ کمپنی کے حصہ داروں میں جو مالک نصاب ہوں وہ اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے زکوٰۃ ادا کریں گے۔

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ

شریعت میں اموال زکوٰۃ منصوص ہیں اس میں قیاس و اجتہاد کو دخل نہیں، اس لئے ہیرے اور جواہرات جس قدر بھی ہوں اور جس نیت سے رکھے جائیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”البواقیت والالالی والجواہر فلا زکوٰۃ فیہا وإن کانت حللیا إلا أن تکون للتجارة“ (۱۸۰/۱)۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

مال تجارت میں کس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف ہے، صاحبینؒ کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن کا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس دن کا جس دن زکوٰۃ واجب ہوئی اور نصاب پر سال مکمل ہوا، اسی پر فتویٰ ہے۔ ”عالمگیری“ میں ہے:

”إن أدى القيمة يعتبر قيمتها يوم الوجوب“ (۱۸۰/۱)۔

لہذا جس تاریخ کو نصاب پر حوالان حول ہوتا ہے تمام سامان تجارت میں بہ شمول پلاس اراضی اسی دن کی قیمت معتبر ہوگی نہ کہ مستقبل میں متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیر اور بونڈز کی زکوٰۃ

تجارتی بونڈز کے شیرز بھی مال تجارت کے حکم میں ہیں، لہذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی،

---

اور زکوٰۃ میں اس کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ حوالان حول کے وقت مارکیٹ میں اس کی جو قدر تھی وہی معتبر ہوگی، اور اس کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، بونڈز کی حیثیت قرض کے سند کی ہے لہذا جو رقم اس کے عوض ادا کی گئی ہے، اس کا دین ہونا ظاہر ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں یہ دین قوی کے زمرہ میں آتا ہے، اس لئے اس پر ضروری زکوٰۃ واجب ہوگی۔

## زکوٰۃ سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا انضال الحق ☆

سوال (۱) کا جواب - ملک تام

الف - اگر وہ رمضان کو سال تام کا حساب بناتا ہے تو ان کی تجارت کی موجودہ مالیت پر زکوٰۃ ہے یا مال پر ہے۔

ب - آپ نے جو رقم مثلاً بیع سلم کے لئے کسی کو دیدی ہے اور طے کر لیا ہے کہ وہ آپ کی نہیں ہے فریق ثانی کی رقم ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر واجب نہیں، اگر قرض دیا ہوتا تو آپ کی رقم ہوتی، مگر ادائیگی کی ہے تو اس کا مال ہے جس کو دیا ہے۔

ج - جو مال آپ نے بیع سلم میں مثلاً خرید لیا ہے اور اب تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر اس لئے واجب نہیں کہ آپ کا قبضہ نہیں صرف ملکیت ہے، ملکیت اور قبضہ دونوں ضروری ہے زکوٰۃ کے لئے۔

سوال (۲) ڈپازٹ وغیرہ، یہ رقم آپ کی ہے مگر آپ کا قبضہ نہیں ہے، اس لئے زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب رقم آپ کے ہاتھ میں آجائے گی، ہاں اگر آپ کے پاس جمع کرنے کا ثبوت پکا ہے تو احتیاطاً ادا کر سکتے ہیں آج ہی۔

سوال (۳) مہمل سوال ہے، کیونکہ مدرسہ کا مہتمم یا ناظم بیت المال کی رقم کا صرف

امین اور وکیل ہے جو خرچ کر سکتا ہے، نہ وہ مالک ہے اور نہ زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم کسی کی ملک ہے وہ تو مال موقوفہ ہے اس لئے غیر متعلق سوال ہے۔

سوال (۴) یہ عجیب سوال ہے، مال حرام کا کمانا، وصول کرنا، رکھنا سب حرام، اس کو واپس کرنا یا کسی غریب کو دے کر بری الذمہ ہونا واجب ہے، پھر اس کی زکوٰۃ کی کیا بحث، زکوٰۃ تو ملکیت پر ہے اور مال حرام شرعاً کا عدم ہے، کیونکہ وہ غاصب ہے آج بھی مالک وہی ہے جس کا مال لیا ہے، اس لئے غاصب کا قبضہ ہے، ملکیت نہیں ہے، زکوٰۃ کیسی؟

۱- اگر حلال مال، حرام مال مخلوط ہے تو حلال کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا، ورنہ تخمینہ کرے گا، جیسے بھی کرے۔

۲- حرام کی یا حلال کی کثرت و قلت یا غلبہ کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ حرام ہے تو شرعاً کا عدم ہے، اعتبار کیسے ہوگا۔

۳- اگر حرام و حلال میں تمیز مشکل ہے تو زکوٰۃ کا سوال ہی کیوں پیدا ہوگا، ایسی کمائی والے کے یہاں۔

سوال (۵) جو قرض دیا گیا ہے وہ ملک آپ کی ہے مگر قبضہ مدیون کا ہے اب اگر دینے کا ثبوت ہے اور مدیون کو انکار نہیں ہے تو واپسی کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ واجب ہے اور اگر ثبوت کم ہے یا مدیون کو انکار ہے یا مال مفقود ہے تو شرعاً وہ مال ضماری ہے، حدیث میں ہے ”لا زکوٰۃ فی الضمار“ اب اس کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ دین واپس ہوگا یا مال مل جائے گا اور از سر نو واجب ہوگی۔

۱- مدیون کے مال منول سے وہ گناہ گار ہے، اس کے انکار سے آپ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی کیونکہ قبضہ نہیں ہے اور ثبوت بھی کمزور ہے، اصول زکوٰۃ کے لئے ملکیت اور قبضہ دونوں بنیادی شرطیں ہیں، دونوں سے مل کر ملکیت تام ہوگی۔

سوال (۶) پی ایف فنڈ میں آپ کی تنخواہ سے جو رقم مجرا ہوتی ہے وہ آپ کی ملک ہے مگر قبضہ نہیں ہے، قبضہ سرکار کا ہے لہذا واپسی کے بعد ہی قبضہ ہوگا اور زکوٰۃ ہوگی، پوری مدت کی زکوٰۃ۔

۱- سرکار نے جس رقم کے ملانے کا وعدہ کیا ہے وہ نہ آپ کی اب تک ملک ہے نہ قبضہ، جب ہوگا تب زکوٰۃ شروع ہوگی، اور حوالان حول کے بعد ہوگی۔  
۲- سود کی جو رقم ملے گی وہ آپ کی بونس ہے اسے غریبوں کو تقسیم کر دیجئے ہرگز نہ رکھئے، زکوٰۃ کا سوال ہی نہیں، کیونکہ مال حرام کا عدم ہے۔

دوسری شرط نمونہ ہے

یہاں مال صرف تین ہیں:

ثمن، چوپائے، سامان تجارت، مال کی تین قسمیں ہیں:

۱- تو سونا چاندی شرعاً ثمن ہیں، لیکن دین کے لئے قدرت نے اس کو بنایا ہی ہے، اس لئے ان پر زکوٰۃ واجب ہے، بشرطیکہ قبضہ میں ہو، مال مفقود یا مال قمار نہ ہو۔  
۲- جانور اگر زماہ دونوں ہوں، چرائی پر گزر بسر کرتے ہوں تو ان میں نمونہ ہوگا، ان پر ایک خاص نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے، تفصیل کے لئے کتب فقہ دیکھئے۔  
۳- مال تجارت چاہے کوئی سامان ہو، مٹی سے ہیرے تک ان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، اور پورا سال گزرنے کے بعد ہوگی تاکہ بھاء کے اتار چڑھاؤ سے ان کی مالیت کا نمونہ ممکن ہو سکے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

سوال: انسان کی بنیادی ضرورتیں شرعاً ۹ ہیں اگر وہ پوری ہو جائیں تو مسلمان غنی

ہے ورنہ فقیر اور تامل ادا ہے۔

۱- نفقہ یعنی کھانے پینے کے لئے غلہ، دال، نمک، گوشت، ترکاری وغیرہ سال بھر مہیا کر سکے۔

۲- سکنی، اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق اس کے پاس مکان ہو، جس پر اس کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں خواہ مکان ہو یا کوٹھی یا چھپر ہے سامان زندگی یا کرایہ کا مکان ہو۔

۳- سواری، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، موٹر سائیکل حسب حیثیت حسب ماحول مع ضروریات وتوابع۔

۴- نوکر چاکر، یا لونڈی، اگر خوش حال گھرانہ ہو یا ڈرائیور وغیرہ جو موٹر چلا سکے۔

۵- آلات معاش، مثلاً کسان کے لئے کھیتی کے سامان، لوہار، بڑھئی، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کے کاروباری سامان جن کے بغیر معاشی مسائل کا حل نہ ہو سکتا ہو۔

۶- اپنے لئے بچوں کے لئے پہننے، اوڑھنے، بچھانے کے وہ سامان جو ہر موسم کو چھیل سکیں۔

۷- بچوں کی پڑھائی یا تربیت کے سامان اور صاحب علم ہو تو اچھی لائبریری کی ضرورت۔

۸- اس پر کسی کا قرض نہ ہو، اتنا قرض جو اس کی بچت کی رقم کو منہا کر دے یا نصاب نہ پورا ہونے دے۔

۹- ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے باوجود اگر بچت کی رقم ہے اور وہ رقم پورے سال تجارت میں یا بینک میں یا تجوری میں یا کہیں محفوظ رہ گئی ہے، اور اس کی مقدار، نصاب زکوٰۃ کے برابر ہے تو اس کی رقم پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ کسی مستحق کو دے دی جائے۔

## چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

ٹرکٹر: کسان کے لئے آلات زراعت میں ہے وہ اگر ایک لاکھ کا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

الف- جو قرض لیا گیا ہے اس سے حاجت اصلیہ پوری کر رہا ہے اگر اس کے پورے کاروبار پر وہ دین جاری ہے تو بچت کی رقم کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ب- فیکٹری اور کارخانے کے لئے جو قرض لیا گیا ہے وہ قرض اگر تجارت کی لاگت سے زائد ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں، اگر بچت اس سے فاضل ہے اور نصاب کے برابر ہے تو واجب ہے۔

ج- اگر کاروبار کی لاگت ۲ کروڑ ہے اور قرض ۱ کروڑ تو حاجت اصلیہ سے فاضل مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جب دس لاکھ کی قسط ادا کر دے گا تو ایک کروڑ دس لاکھ کی زکوٰۃ دے گا پھر بیس لاکھ کی اسی طرح چلتا رہے گا۔

د- اگر ایک کروڑ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو کوئی زکوٰۃ نہیں، وہ قرض اور اس کا سود اس کی لاگت کو کھا جائے گا، بچت کا سوال ہی نہیں ہوگا، اس سے غنی نہیں ہوگا۔

ہ- اگر پچاس لاکھ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو قسط اور سود سے اس کا کاروبار مکان اور جائیداد کوئی محفوظ نہیں رہے گا، بہر حال خدا اس پر رحم کرے اس مالدار فقیر پر۔

## کمپنی اور کارپوریشن پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو مالک نصاب ہیں، اس لئے جس کمپنی کو آپ لوگ ایک کروڑ کی لاگت سے چارہے ہیں، اس کے جس حصہ دار کے حصے یا جس انداز کی رقم نصاب کو پہنچ جائے گی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مشترک سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، ذاتی مال پر ہوتی ہے۔



## اہم اصول

- ۱- زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے جو ذاتی ہو، پس انداز ہو یا ضروریات سے فارغ ہو، اور پورے سال کا ہر موسم جھیل چکی ہو پھر بھی موجود ہو اور آپ کے قبضہ میں ہو۔
- ۲- ہیرے جوہرات اگر مال تجارت ہیں تو ملکیت پر زکوٰۃ ہے ورنہ کوئی زکوٰۃ نہیں،  
کما قال ﷺ -

## اموال تجارت

- سال پورا ہوا تو آپ کی دکان میں جو مال ہے اس کی لاگت پر زکوٰۃ ہوگی، پھر جب وہ فروخت ہوگا تو پتہ چلے گا کہ لاگت کیا تھی، نفع کیا ہوا، آج تک فروخت نہیں ہوا، آپ کی لاگت والا مال ہے اس پر زکوٰۃ ہے۔
- ۱- آپ کی لاگت جتنی ہے اس پر زکوٰۃ ہے، خواہ تھک ہو یا پھٹکر جیسی حیثیت ہو یا جیسی مالیت، مال کی تھوک یا خوردہ قیمت کا نہیں بلکہ جتنے ہیں وہ مال بار برداری کے بعد آپ کو پڑا ہے اس لاگت سے مالیت نکال کر زکوٰۃ دی جائے گی، پھر اس مالیت کو فروختنگی میں نفع کی بنیاد بناتے ہیں۔
  - ۲- جو زمین کا کاروبار کرتے ہیں، سال ختم ہونے پر جتنی زمین ان کے قبضے میں ہے اس کی لاگت والی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، کیونکہ اس کے قبضے میں دی ہے، قوت خرید سے خریدار کو رغبت ہے بائع کو نہیں یہ معاملہ بائع کی ذاتی حیثیت کا ہے جو اس وقت موجود ہے۔

## حصص کی زکوٰۃ

- ۱- آپ نے کسی کمپنی کے جو حصے خریدے ہیں وہ آپ کی ملکیت ہیں مگر آپ کے قبضے میں نہیں ہیں، لہذا اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ حصہ واپس ہوگا یا اس کا بدلہ یا نفع

ملے گا تو جتنا قبضے میں آئے گا، اتنی رقم اگر نصاب کے برابر ہے تو زکوٰۃ دیں گے ورنہ نہیں۔  
 ۲۔ حصص کی جو بھی قیمت آپ کو مل جائے گی، اس کے تناسب سے زکوٰۃ ہوگی اگر کم ملے گی تو کم پر، زیادہ ملی تو زیادہ پر فرق یہ ہوگا کہ حصص آپ کے اصل پونجی کے اور اس کی کمی بیشی کا نام نفع نقصان ہوگا مگر اس کا اعتبار رقم کی واپسی پر ہوگا، چنانچہ بمبئی کا اسکندل اور لندن کے بینک کا اسکندل گواہ ہے کہ حصص کا اعتبار اس وقت ہوگا جب وہ حصہ دار کے قبضے میں آجائیں یہ اصول بہت وسیع ہے۔

### بونڈز

جس رقم کو میں نے دیا ہے اور بینک نے یا سرکار نے مجھے مدتی بونڈ عطا کر دیا ہے یہ بونڈ نوٹ نہیں ہے، نقد نہیں ہیں، بلکہ سرکاری رسید ہے کہ تمہارا مال ہمارے پاس ہے، اس لئے وہ رقم جو آپ کے قبضے میں نہیں ہے، اس پر آج زکوٰۃ واجب نہیں اس وقت واجب ہوگی جب بونڈ کیش ہو جائے گا اور ان تمام سالوں کی واجب ہوگی، جتنے سال سرکاری تحویل میں وہ رقم رہی ہے، وجہ وہی ہے کہ ملک نام نہیں، کیونکہ قبضہ نہیں ہے، اور چونکہ آپ کے پاس چکی رسید ہے اور سرکار کو انکار نہیں، اس لئے وہ قمار بھی نہیں ہے، اس لئے پوری مدت کی زکوٰۃ ہوگی۔

### نصاب زکوٰۃ

#### سوالات کے جوابات

شرعاً چاندی اور سونا دونوں ثمن ہیں اور آپ کے ماننے نہ ماننے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا وہ ثمن خلقی ہی رہیں گے اس لئے:  
 الف۔ اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہے تو ۲۰۰ درہم سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہنچے حساب یہی ملے گا۔

ب۔ اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے تو ۲۰ مثقال سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہنچے۔

ج۔ اگر دونوں میں سے کسی کا نصاب مکمل نہیں ہے تو دونوں کو وزن یا قیمت کے لحاظ سے دیکھیں گے، اگر کوئی نصاب مکمل ہو جاتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، نہیں تو نہیں ہوگی۔  
د۔ رہا مال تجارت تو اگر کسی تاجر کے پاس اس کی حاجت اصلیہ سے فاضل جو مالیت ہے وہ ۲۰۰ درہم سے زائد ہے تو وہ غنی ہے، اس پر شرائط کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی لیکن اگر مال تجارت کی قیمت ۲۰۰ درہم سے کم ہے تو وہ مسلمان شرعاً فقیر ہے، زکوٰۃ اس کو دی جاسکتی ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ہ۔ ایسا اس لئے ہے کہ فقیروں کے لئے یہ مفید ہے کہ چاندی کا نصاب مان لیا ہے ورنہ سونے کو محو بنایا جائے گا، تو تاجروں کو تھوڑا موقع اور مل جائے گا، مگر فقیروں کا نقصان ہوگا اور یہ فرق صرف ابتدا کرنے میں ہے کہ کہاں سے شروع کیا ہے ورنہ جب شروع ہو گیا تو ہر مالک نصاب دوسرے کے برابر ہے۔

و۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا مسئلہ ہر مسلمان سے متعلق ہے، خواہ ہمالیہ کی ترائی کا ہو یا امریکہ کے بازار کا ۱۹۹۲ کا ہو یا ۲۲۹۲ کا۔ دوسرے یہ کہ من موہن سنگھ نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس کے سونے کی وہ برتری خال میں مل جائے گی، جو ہندوستان میں اس کو حاصل ہوگی ہے، تیسرے یہ کہ اگر ثبوت غنا کے لئے سونا اور ثبوت فقر کے لئے چاندی کو معیار قرار دیں گے تو فقر و غنا کے درمیان مابقی عبور خلیج پیدا ہو جائے گی، اور یہ طے نہیں ہو سکے گا کہ غنا کب اور فقر کب شروع ہوا، اسی لئے شریعت نے دونوں میں سے ہر ایک کو ضمنی قرار دے کر ماحول کو پابند کر دیا ہے اور فقر و غنا کے درمیان کوئی واسطہ نہ رکھ کر کام آسان کر دیا ہے۔

## مصارف زکوٰۃ

مہتمم یا ناظم یا منیجر عطیہ یا زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کی رقم کو مستحقین زکوٰۃ تک پہنچائے، مستحقین تو مصرف زکوٰۃ ہیں اور مہتمم دونوں کے درمیان واسطہ ہیں۔

الف۔ مہتمم کی طرف سے کسی مستحق کو جو رقم سپرد کر دی گئی وہ زکوٰۃ ادا ہوگئی، اور وہ شخص اتنی رقم کا مالک ہو گیا، اب ایسے شخص کو حق ہے کہ اپنے کھانے کا، رہائش کا، ٹیوشن کا، نظم و ضبط کا خود انتظام کرے، کیونکہ مال ان کے پاس ہے، وہ انجمن بنا کر اسے چلائیں گے اور جہاں چاہیں گے کرایہ کا مکان لے کر رہیں گے، جس کو چاہیں گے مدرس رکھ کر پڑھائیں گے، پھر مہتمم صاحب کہاں جائیں گے؟ انہیں سوچ لینا چاہیے جیسے الہ آباد بورڈ کے مدرسین مالک مدرسہ ہیں اور کاسٹھ کا، مہتمم نام کا مہتمم، یہ فتنے کا گھر ہے اس دروازے کو نہ کھولے۔

ب۔ پھر جن لوگوں نے جائداد، کمرے، سامان بطور اوقاف مدرسہ میں دیا ہے کہ ان کا آپ کو یا ان کے ورثاء کو ثواب ملتا رہے گا، یہ صدقہ جاریہ، اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پھر تو سارا مال تجارتی سامان ہوگا، کرایہ کا مکان کرایہ کی زمین، کرایہ کی سواری۔

ج۔ بہت سے علماء کو عطیات کی رقم سے تنخواہ لینے میں تردد ہوتا ہے اور آپ نے زکوٰۃ سے تنخواہ لینے اور طلباء کے ہاتھوں ذلیل کرنے کا راستہ نکال کر اداروں کی دینی حیثیت کو داؤ پر لگا دیا ہے اور اسکولوں کی طرح تجارت گاہ بنا دیا ہے، خدا راجم کیجئے دینی اداروں پر۔

د۔ یہ صورت بہت اچھی ہے کہ طلباء کے خوراک اور وظیفے کی رقم ان کو نقد دیدی جائے اور وہ مطبخ میں جمع کر دیں، وہاں سے سارے انتظام ہوتے رہیں، اس سے تملیک بھی ہوتی رہے گی، انتظام بھی چلتا رہے گا۔

### عاملین علیہا

رمضان وغیرہ میں اداروں کے جو مدرسین، ملازمین، نظماً اور اراکین چندہ وصول کرتے ہیں ان میں اکثر اداروں کے مستقل ملازم ہوتے ہیں، ان کی تنخواہ وغیرہ زکوٰۃ سے نہیں دی جاسکتی۔

الف- ہاں پورے سال میں وہ زکوٰۃ ہی وصول کراتے ہیں تو ایسی وصولی کے تناسب سے ان کی تنخواہ کا کوئی حصہ زکوٰۃ سے لیا جاسکتا ہے۔

ب- زکوٰۃ کے مصارف بیان کرنے کا انداز انحصار کا ہے ”انما الصدقات“ اس لئے جب تک مستحق زکوٰۃ ہوں گے دی جائے گی، جتنے مستحق زکوٰۃ ہوں گے اسی مقدار سے دی جائے گی اور ”عاملین علیہا“ کی اصطلاح بھی مستقل ملازمین کو شامل ہونے نہیں دیتی۔ متکلم کی منشا کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔

ج- کمیشن، اہل علم کا کبھی دستور نہیں رہا نہ علماء نے اجازت دی ہے، اگر اس سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، تو جو لوگ فیصدی کمیشن لیتے ہیں اور پھر مصارف سفر وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی رقم کہیں باقی رہ گئی ہے تو اس کا بھی کمیشن لے لیتے ہیں، ان کو آپ کیا کہیں گے، بعض لوگ فرماتے ہیں کہ ہماری جیب سے کیا گیا؟ مگر انہیں معلوم نہیں کہ جتنی رسید آپ کے سفیر نے کاٹ دی ہیں ان سب رقم کا آپ کو یہاں سے آخرت تک حساب دینا ہے، پھر خدا سے کیا معذرت فرمائیں گے۔

د- جو ادارے کا کلرک ہے وہ بیت المال کا منشی ہے وہ رقم کی وصولی نہیں کرتا، مگر اس رقم کے خرچ کا حساب لکھتا ہے، اس لئے ”عاملین علیہا“ کی مد میں شامل نہیں ہو سکتا۔

### فی سبیل اللہ

قرآن، کتاب الہی فرمان خداوندی اور بندوں کے نام احکام لے کر آیا ہے، قرآن

نے عبادات و معاملات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تعبیرات کے لئے اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ آپ ان اصطلاحوں کا معنوی تعین آج کی لغت سے نہیں کر سکتے، اس وقت کے فہم و ادراک سے کر سکتے ہیں۔

الف۔ ”فی سبیل اللہ“ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ اس سے متکلم کا منشا کیا ہے؟، کیونکہ متکلم کی منشا کا نام تفسیر ہے، ظاہر ہے کہ خدا کی منشا اگر معلوم ہوگی تو خود قرآن سے ہوگی، یا پیغمبر سے معلوم ہوگی، حد سے حد یہ ہے کہ صحابہ کرام کی زبانی معلوم ہوگی۔ ہاں اگر ان میں سے کسی سے نہ معلوم ہو تو تفسیر کرنا ممکن نہیں، ہم لغت، محاورہ یا اصول کے ذریعہ اس کی تاویل کر سکتے ہیں، تفسیر نہیں کر سکتے ہیں۔ یہاں تاویل کی اس لئے گنجائش نہیں کہ تفسیر موجود ہے اور جب خود حضور سے تفسیر موجود ہے تو لغت کے ذریعہ اس کا معارضہ کرنا خلاف اصول اور جرأت ہے۔

ب۔ حافظ ابن حجر نقل کرتے ہیں کہ ”فی سبیل اللہ“ کا استعمال جہاد کے لئے ہوتا ہے یہی بات عام مفسرین کہتے ہیں اور خود حضور نے ”غاز فی سبیل اللہ“ کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ فی سبیل اللہ کا ترجمہ اور مطلب جہاد ہے۔ نیز بخاری میں حضور کا شعر مروی ہے کہ انگلی زخمی ہوگئی تو فی سبیل اللہ فرمایا:-

”إن أنت إلا إصبع دمیت و فی سبیل اللہ مالقیث“

ج۔ ان ہی وجوہ سے جمہور فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا ہے اور بعض احادیث کے تقاضہ سے امام محمد جیسے حضرات نے حج کو بھی فی سبیل اللہ میں صرف اس وجہ سے داخل کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک حضور ﷺ سے ثابت ہے، اور ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نے حج کو عورتوں کا جہاد فرمایا ہے۔

د۔ رہا اختلاف روپے یا اختلاف مسائل کا ختم کرنا تو یہ کوئی شرعی عذر نہیں ہے، نہ دلیل

ہے نہ اس سے ان مسائل کا اختلاف ختم ہو سکتا ہے جو صدر اول سے چلے آرہے ہیں، نہ اس کے لئے لغت اور ان کے لئے توسع سے کام نکالا جاسکتا ہے، کیونکہ اس سے صرف اتنا ہوگا کہ ایک پانچویں رائے اور پیدا ہو جائے گی، کہ علامہ بھوپائی نے لغت کے سہارے زکوٰۃ کو عام کر دیا ہے کہ ایک اجتہادی مسئلہ بن گیا ہے، اور اصل یہ ہے کہ صدر اول میں فقہاء اور علماء نے قرآن و احادیث کے پر معانی امارت کی روشنی میں متعین کر رہے ہیں، ان کے دور کی رائے قبول کر لی جائے۔ ہاں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کے دلائل، اقوال اور علت و اسباب کا پتہ لگا کر کوئی رائے قائم کی جائے، ورنہ پرانے مسائل کو نئے رجحان سے طے کرنا ایک خطرناک کھیل ہے اور بے سود محنت۔

ہ۔ علامہ کاسانی کا یہ استدلال بہت اچھا ہے کہ حضرت معاذ کو معجزاً عظیم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہیں، اس میں بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ:

”توخذ من اغنیائہم وترد الی فقراء ہم“

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے لحاظ سے انسانوں کی دو صفیں ہیں، ایک اغنیاء کی دوسری فقراء کی، اور زکوٰۃ کا مصرف وہ فقراء ہیں جن کی فہرست قرآن نے دی ہے، البتہ چونکہ حدیث صحیح کی وجہ سے ”عاملین علیہا“ کے غناء کے باوجود دیا جائے گا، اس لئے اس فہرست میں ان کا اضافہ غالباً اس لئے ہے کہ زکوٰۃ جب تک جمع نہ کی جائے گی، اس فہرست کے مطابق تقسیم نہیں کی جاسکتی، اس لئے غناء کے باوجود اجازت دی گئی ہے ورنہ اصل ہے فقر و حاجت وغیرہ، اسی وجہ سے علامہ کاسانی نے فی سبیل اللہ میں اگر وسعت بھی رکھی ہے تو فقر کی قید لگا دی ہے اور شخصی طور پر ادا کرنے کی رعایت کی ہے۔

و۔ بہتر ہو کہ جن مسائل کو ائمہ نے نصوص کی روشنی میں جمع کر دیا ہے اور جمہور فقہاء نے اسے قبول کر لیا ہے اس پر لغت اور محاورے کی مدد سے اضافہ نہ کیا جائے ورنہ دین باز بچہ اطفال بن جائے گا۔

## خلاصہ جوابات

مولانا اختر امام عادل ☆

- ۱- مال تجارت کی زکوٰۃ قبل اقبض خریدار اور بائع کسی پر واجب نہیں ہے، البتہ وہ قیمت جو ادا کی جا چکی مگر اس کا بدل خریدار کے حوالہ نہ کیا گیا اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے۔
- ۲- کرائے کے مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ واپس کیا جاتا ہے اس نقد کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہے کرایہ دار پر نہیں۔
- ۳- جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والے رقم، ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
- ۴- مال حرام اگر خالص ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور اگر مال حلال اس طرح مخلوط ہو گئے ہوں کہ دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہو تو اس صورت میں مال حرام کو الگ کرنے کے بعد اگر اس کے پاس بہ قدر نصاب مال موجود رہتا ہے تو مال مخلوط پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔
- ۵- دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے مدیون پر نہیں، اگرچہ مدیون دین کی ادائیگی میں مال منول کر کے اس رقم سے استفادہ کر رہا ہو، مگر راجح مسلک کے مطابق اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔



دین کی وصولی کی اگر امید ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، اگر اس کے پاس اس کے علاوہ بقدر نصاب مال موجود ہے تو ہر سال اس کی زکوٰۃ ادا کرے ورنہ دین کی وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی واجب ہوگی۔

اگر دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو تو یہ مال حمار کے حکم میں ہے، اس کی زکوٰۃ وصولی سے پہلے واجب نہیں اور وصولیابی کے بعد صرف آئندہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی، گزشتہ کی نہیں۔

۶۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے اگر اس کے علاوہ نصاب موجود ہو تو سالانہ زکوٰۃ ادا کی جائے گی، ورنہ وصولیابی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

### دوسری شرط نما

نما کی دو قسمیں ہیں (۱) نما حقیقی۔ (۲) نما تقدیری۔

نما حقیقی میں تجارت و سیاحت کی تمام شکلیں داخل ہیں، اور نما تقدیری سے مراد مال میں افزائش کی صلاحیت ہے، جیسے نقد، سونا چاندی، دونوں طرح کی نما کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے۔

### حاجت اصلیہ کی تعریف اور دائرہ

حاجت اصلیہ میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن کی انسان کو ضرورت پڑتی ہے اور جن کے بغیر حقیقی یا حکمی تباہی آسکتی ہو، حاجت اصلیہ کا عین ہر دور اور ہر ماحول کے اعتبار سے کیا جائے گا، مگر نقطہ اعتدال پر قائم رہ کر۔

### دین مانع زکوٰۃ

اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں کے نصاب میں دین مانع زکوٰۃ ہے، البتہ کھیت اور

باغات کا استثناء ہے، اسی طرح دین العباد مانع زکوٰۃ ہے اور دین اللہ میں صرف وہ دین مانع زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ بندوں کی جانب سے کیا جائے۔

طویل المیعاد دین جس کی ادائیگی قسط وار کی جائے اس میں سالانہ واجب الاداء قسط اموال زکوٰۃ سے منہا کی جائے گی، پورے قرض کو منہا نہیں کیا جائے، باقی مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنیز کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ مشینوں اور آلات حرفت کے استثناء کے بعد جس کا انفرادی حصہ بہ قدر نصاب ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس کا حصہ نصاب سے کم ہوگا اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

### ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کے لئے ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں، اسی طرح مالی قوانین سے بچنے کے لئے بڑی مالیت ہیرے اور جواہرات کی شکل میں محفوظ کر دیے گئے ہوں، یا عورتیں ان کو محض تزئین و آرائش کے لئے حد اعتدال سے زیادہ مقدار میں استعمال کرتی ہوں تو ان پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی مالیت کا تعین ادائیگی زکوٰۃ کے دن کے نرخ سے کیا جائے گا اور اگر تھوک کاروبار ہو تو تھوک بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اور اگر چکنر کاروبار ہو تو چکنر فرنگی کا اعتبار ہوگا۔  
جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا

ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموالِ زکوٰۃ میں شمار ہوں گی، اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب بازاری قیمت فروخت کے لحاظ سے ہوگا۔

### شیئرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

شیئرز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہے اور ان کی مالیت کا تعین بوقت ادائے زکوٰۃ ان کے بازاری نرخ سے کیا جائے گا۔

قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈز پر لگایا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ ادائیگی کیش کرانے کی بعد واجب ہوگی اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

### مخورتانی - نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں اصل چاندی کا نصاب ہے، نصابِ حرمت زکوٰۃ اور نصاب موجب زکوٰۃ دونوں ہی میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

### مخورتالیث - مصارف زکوٰۃ

تملیک کی مذکورہ شکل درست ہے، مہتمم طلبہ کا وکیل ہے، زکوٰۃ دینے والوں کا نہیں، سفراء کا کمیشن پر چندہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ سفراء عاملین زکوٰۃ کے حکم میں ہیں ان کو ان کے عمل کے بقدر زکوٰۃ دی جائے گی، جس میں آمد و خرچ کا تناسب زیادہ سے زیادہ مساوی ہونا چاہئے، ورنہ عام حالات میں کوشش یہ ہونی چاہئے کہ آمد زیادہ اور خرچ کم ہو۔

### مصرف سابع - فی سبیل اللہ

۱- مصارف زکوٰۃ کی آیت میں حصر سے مراد حصر حقیقی ہے۔

۲- قرآن میں فی سبیل اللہ متعدد معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، مگر اس کا تعین سیاق و سباق کے ذریعہ ہوگا، البتہ جہاں قرآن میں فی سبیل اللہ مطلق بغیر کسی سیاق و سباق کے استعمال کیا گیا ہے وہاں جہاد مراد لیا گیا ہے۔

۳- آیات و احکام کی تفسیر میں قرون اولیٰ کے اقوال کو تقدم حاصل ہے، قرون اخیرہ کے صرف وہ اقوال معتبر ہیں جو کسی ایسی علت پر مبنی ہوں جو آیت میں مذکور ہو، اور تفسیر بالرائے کے ذیل میں نہ آتے ہوں، ورنہ ان کا اعتبار نہ ہوگا۔

۴- الف: زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق میرے نزدیک جہاد ہے اور وہ تمام حضرات اس کے دائرے میں آتے ہیں جو کسی نوع کا جہاد کر رہے ہوں۔  
ب: فی سبیل اللہ میں حنفیہ متفقہ طور پر فقر کی شرط لگاتے ہیں، مگر مجھے اس میں شک ہے۔

۵- مصارف زکوٰۃ میں ایسی تغلیل و قیاس کی اجازت ہے جس سے حصر حقیقی پر کوئی اثر پڑے بغیر اصناف ثمانیہ کے افراد و انواع میں توسع ہو جائے، مگر ایسی تغلیل جس کی زد حصر حقیقی پر پڑتی ہو جائز نہیں ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی علت نصرت دین، اسلام اور اعلاء کلمتہ اللہ ہے، اور یہ علت عسکری جہاد کی طرح فکری، سیاسی اور اقتصادی جہادوں میں بھی موجود ہے، اس لئے ان کو بھی فی سبیل اللہ کے دائرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

۶- مگر اس میں تمام دینی ادارے، تنظیمیں، مدارس، خانقاہیں اور اکیڈمیاں داخل نہیں ہیں بلکہ صرف وہ ادارے، تنظیمیں اور اہل قلم داخل ہیں، جن کی جدوجہد کا رخ دشمنان اسلام کی جانب ہو، اور جو دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و سازشوں کا تعاقب کر رہے ہوں، جو دینی ادارے مسلمانوں کے اندرونی مسائل و امور میں مشغول ہیں وہ جہاد فی سبیل اللہ میں داخل نہیں

ہیں، اس لئے کہ جہاد کے لئے دشمن سے مقابلہ اور مخالف ماحول میں کلمہ حق بلند کرنا شرط ہے جو ان اداروں میں مفقود ہے۔

### جوابات ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

۱- اگر شیئرز کی خرید و فروخت تجارتی نقطہ نظر سے کی جائے تو اس کی بازاری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی لیکن اگر تجارت مقصود نہ ہو تو اس سرمائے پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو کمپنی میں لگی ہوئی ہے، اس صورت میں ضروری اخراجات کو منہا کیا جائے گا۔

۲- اگر کاروبار تجارتی ہو تو پورے سرمائے اور آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر کاروبار صنعتی ہو تو صرف آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، آلات صنعت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

۳- شخصی اخراجات کی تحدید کے لئے کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ہر فرد اور سماج کے لحاظ سے وہاں کے اہل علم و دانش یہ طے کریں گے کہ شخصی اخراجات کی حد کس کے لئے کیا ہوگی؟۔

۴- اسلام سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور نہ سرمایہ کے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے ممنوعات کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں غیر سودی طریق پر سرمایہ دار بننے کے مواقع کم ہیں، ایک سچے مسلمان کے لئے دو راستے میں سے ایک اختیار کرنا ہے۔

۱- یا تو وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کی تحصیل کے لئے اسلامی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر ہر جائز و ناجائز طریق کو اختیار کر لے۔

۲- یا پھر وہ محتاط اور اوسط زندگی گزارنے پر تافع ہو جائے، مسلمان کسی زمانہ میں سرمایہ اور دولت کے بل بوتے آگے نہیں بڑھے، بلکہ اپنے علم و فن، عقل و دانش اور ایمان و حوصلہ

---

کے ذریعہ انہوں نے دنیا پر حکومت کی، اور قوموں کی تقدیر کے نقشے تیار کئے، آج مسلمان انہیں جوہر گراں مایہ سے بے بہرہ ہیں، اس محرومی کی تلافی نا جائز طریقہ پر حاصل کردہ سرمایہ نہیں کر سکتا، آج مسلمانوں کو دنیا طلب اور مادہ پرست بنانے کے لئے اسلامی قوانین میں ترمیم کا مشورہ دینے کے بجائے ان کو ان بنیادی اور تعمیری خطوط پر لے جانے کی کوشش کرنی چاہئے جن پر چل کر ہمارے اسلاف نے حکومت و برتری حاصل کی تھی۔

## ضمیمہ سوالات کے جوابات

مولانا جمیل احمد زبیری ☆

اخراجات کے بعد جو خالص رقم ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یہاں عام طور پر تین حالت ہوتی ہے:

الف- کمپنی کی رقم سے فرنیچر و آلہ تجارت وغیرہ خرید گیا ہو۔

ب- سامان تجارت ہو جس کی خرید فروخت کی جارہی ہو۔

ج- نقد رقم خواہ کمپنی کے پاس ہو یا کمپنی نے کسی بینک وغیرہ میں جمع کر رکھی ہو۔

اس میں اول الذکر کی مالیت پر کوئی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیونکہ فرنیچر اور آلہ تجارت پر

زکوٰۃ نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

”و کالات الحرفة و اثاث المنزل“ (رد المحتار علی الدر المختار ۶/۲۳۲)۔

(حاجت اصلیہ جیسے آلہ حرفت اور گھر کا سامان)

البتہ سامان تجارت اور نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، سامان تجارت کا موجودہ ریٹ

معلوم کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ زید اپنے شیئرز کے اعتبار سے کمپنی کے کتنے سامان تجارت

اور نفع (مثلاً نقد رقم) کا شریک ہے، لہذا سامان تجارت کی مالیت اور نقد رقم کو جوڑ کر جتنے میں اس

☆ مبارک ہوں، اعظم گڑھ۔

کی شرکت حصہ ہے اتنے کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی، حسابات کی تفصیل کمپنی منیجر یا کسی ذمہ دار سے معلوم کر کے اپنے شیئرز کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دی جائے (امداد الفتاویٰ ۳، ۵۱۰ تا ۵۱۲، نظام الفتاویٰ ۲-۱۶۷)۔

شیئرز کی بازار میں، خواہ کچھ بھی قیمت ہو اس کا اعتبار نہ ہوگا، کمپنی میں شیئرز کی جو مالیت بنتی ہو اس کا اعتبار ہوگا۔

آپ خود اپنے آخری سوال کے تحت لکھتے ہیں:

”بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج شیئرز مارکیٹ جوئے کا اڈہ بن گئی ہے جہاں مارکیٹ پر کنٹرول کرنے والوں کی من مانی سے یا سیاسی تبدیلیوں سے، انہوں سے قسمیں بنتی اور بگڑتی ہیں، شیئرز کی قیمتوں کا کوئی تعلق کمپنی کی مالی حالت سے نہیں ہوتا۔“

جبکہ زکوٰۃ کا تعلق کمپنی کی مالی حالت اور کمپنی میں شیئرز کی مالیت سے ہے، شیئرز والا کمپنی میں جتنے سامان تجارت و نقد رقم کا مالک ہو اتنی ہی مالیت کی زکوٰۃ ادا کرے۔

۲- اگر نفع سے مراد نقد رقم اور اسٹاک سے مراد سامان تجارت (جس کی خرید و فروخت کی جارہی ہے) ہو تو زکوٰۃ دونوں پر واجب الاداء ہوگی، اسٹاک کی موجودہ بازاری قیمت تخمیناً لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے۔

کاروباری ادارہ کی عمارت، کرسی، الماری وغیرہ اور آگہ تجارت مشینری وغیرہ (جس سے مال تیار کر کے فروخت کیا جا رہا ہے) پر زکوٰۃ نہیں ہے، لہذا اس کی مالیت جوڑنے کی ضرورت نہیں۔

۳- شخصی اخراجات کی تحدید کے لئے احقر کے خیال میں کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہے، ہر شخص اپنی مالی و عمرنی حیثیت کے اعتبار سے اپنے رہائشی مکان، لباس، خورد و نوش، سامان خانہ، نوکر و خدمت گار اور سواری وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے، اس میں شرعاً کوئی مانع نہیں، اسراف و تبذیر نہیں ہونا چاہئے یہی چیزیں حاجت اصلیہ میں شامل ہیں۔



۴۔ کمپنی کے حصص و یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے شیئرز اور اسی کی ہم معنی چیزوں میں سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے، بونڈز اور قرض تمسکات نہ خریدے جائیں، الا یہ کہ ایسے بونڈز اور قرض تمسکات کی حیثیت وقتی ہو۔

انتہائی مجبوری درجہ میں ایسے بونڈز اور قرض تمسکات بھی خریدے جاسکتے ہیں جو ناقابل تبدیل ہوں، اس صورت میں جو سود ملے اسے بلا نیت ثواب غرباء پر صدقہ کر دیا جائے یا رفاہی امور میں خرچ کر دیا جائے۔

سوال میں جو مثالیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض میں سود کے نام سے ملنے والی رقم پر شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا، مثلاً ۴ کے تحت پر اوپنٹ فنڈ کا معاملہ (کلیپ لٹریچر ۸/۹۳، امداد الفتاویٰ ۱۳۹۳)۔

اسی طرح سوال نمبر ایک کے تحت زمینداری کے خاتمہ پر ان املاک کے مالکوں کو معاوضہ میں جو بانڈز دیئے گئے تھے وہ بھی احقر کے خیال میں ”سود“ کے ذیل میں نہیں آتے، بلکہ پوری رقم مع سود، زمین کا معاوضہ قرار پائے گی، کیونکہ مالکوں نے کوئی رقم نہیں دی جس کے عوض میں زائد رقم ملی ہو اور شرعاً سود کہلائے بلکہ حکومت نے ان کی زمینداری ختم کر کے ان کی زمینوں یا زمین داری کا معاوضہ جو بانڈز ہے دو فی صد سود کی صورت میں دیا، یہ مجموعی رقم معاوضہ بنی، شرعاً سود نہ ہوا، اور پر اوپنٹ فنڈ کی طرح یہ بھی تبرع ابتدائی ہے۔

دو اور تین کی شکلیں مجبوری کی ہیں، لہذا ان میں سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے، جہاں ظالمانہ ٹیکس دینا پڑے وہاں سود سے حاصل شدہ رقم ٹیکس میں دے دی جائے اور جو رقم اس سے بچے وہ سود کے شرعی مصارف (غرباء پر صدقہ اور رفاہی کام) میں خرچ کر دی جائے۔

## زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہوتی ہے

مفتی عبدالرحمن ☆

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

چار قسم کے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے:

- (۱) سونے چاندی پر، (۲) تجارتی مال پر، خواہ وہ کسی قسم کا ہو، (۳) سامانہ جانوروں پر، (۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر جس کو شکر کہا جاتا ہے۔

### شرط اول - ملک تام

ملک تام سے یہی مراد ہے کہ مال مالک کی ملک میں ہو، یداً بھی اور رقبۃً بھی۔

- ۱- لہذا وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے، مگر مال ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا، اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی وصول ہونے سے پہلے واجب نہ ہوگی (البحر المآقی ۲/۳۰۳)۔  
جو قیمت ادا کی جا چکی ہے اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی۔ ”لأنه ملكها یداً و رقبۃً“۔

- ۲- کرایہ کی مد میں جو رقم پیشگی دی گئی ہے وہ اجارہ پر دینے والے کی ملک ہوگی، یداً بھی اور رقبۃً بھی، اس لئے وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا بشرطیکہ اجارہ کی مدت پوری ہو جائے، اس

سے قبل اجارہ فسخ نہ ہو (المحررات ۲۲/۲۰۳)۔

ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس لئے واجب نہیں کہ اس پر اس کا قبضہ نہیں اور اس لئے بھی واجب نہیں کہ مکان حوائجِ اصلیہ میں سے ہے اور یہ رقم حوائجِ اصلیہ میں محبوب تھی کہ اس کے بغیر مکان کا میسر آنا ممکن اور آجر پر اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کہ وہ اس رقم کا مالک نہیں۔

۳- وہ مال جو کسی شخص کی ملک نہیں ہے جیسے مدارس اور اداروں کے اموال، ان

اموال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (ردالمحتار ۹/۲)۔

۴- مال حرام جو اپنے پاس ہے اگر وہ اپنے مال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو اس کی زکوٰۃ

واجب نہ ہوگی، اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو واجب الرد، نہیں تو واجب التصدق ہے۔

اور اگر مال حرام اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہے کہ امتیاز مشکل ہے تو یہ

استہلاک ہے جو امام صاحب کے نزدیک موجب ملک ہے، لیکن اس مال حرام کا ضمان اس

صورت میں واجب ہوگا جو اس کے ذمہ دین ہوگا اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی بشرطیکہ اس کے

علاوہ اتنا مال موجود ہو کہ اس مال حرام کا ضمان ادا کیا جاسکے اور اگر اس کے علاوہ مال نہیں ہے تو پھر

زکوٰۃ اس کی واجب نہ ہوگی، بلکہ مال حرام کو منہا کرنے کے بعد جو بچے اگر وہ نساب کو پہنچتا ہے تو

اس پر زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں (درمختار علی ردالمحتار ۲۲/۳۳-۳۴)۔

۵- ایسا دین کہ اس کا ثبوت دائن کے پاس موجود ہے یا مدیون اس دین کا منکر نہیں ہے

اور اس کے وصول ہونے کی امید ہے اور دین قوی ہے یا متوسط ہے تو ایسی حالت میں دین کی زکوٰۃ

دائن کے ذمہ لازم ہے، مگر بعد قبضہ کے، دین قوی میں تو چالیس درہم پر قبضہ کے بعد اور دین متوسط

میں دو سو درہم پر قبضہ کے بعد اور اگر دین ضعیف ہے تو اس کی زکوٰۃ دینا لازم نہیں، جب وہ قبضہ میں

آجائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو مثل اور مالوں کے اس کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

لیکن اگر مدیون نال منول کر رہا ہے اس سے قرض کے وصول ہونے کی امید نہیں ہے، وہ اقرار کے باوجود دیتا نہیں ہے اور دائن اس سے لینے پر قادر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس دین کی ماضی کی زکوٰۃ دائن پر وصولیابی کے بعد بھی واجب نہ ہوگی (۸۵/۲)۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم (یعنی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ سے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی وضع کر لی جاتی ہے اور اس پر بطور انعام حکومت اپنی طرف سے مع سود کے بڑھا کر دیتی ہے) پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جب یہ رقم وصول ہوگی اور اس پر سال گزر جائے گا (یا پہلے سے صاحب نصاب ہے تو جب اس کے نصاب کا سال ہوگا) تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ تنخواہ سے وضع شدہ رقم جو قبضہ میں نہیں آئی ہے وہ خدمتِ حُر (آزاد) کا بدلہ ہے اور خدمتِ حرام نہیں ہے، اس لئے اس کا بدلہ دین ضعیف ہے اور دین ضعیف کا حکم یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

### شرط ثانی نما ہے

نماغت میں زیادتی کو کہتے ہیں جس کی شرعاً دو قسمیں ہیں: حقیقی و تقدیری۔ حقیقی نماوہ زیادتی ہے جو توالد و تناسل کے ذریعہ یا تجارت کے ذریعہ ہو، اور تقدیری نما یہ ہے کہ مال کے اپنے یا اپنے نائب کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے زیادتی پر قدرت ہو (رد المحتار)۔

### تیسری شرط مال کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ وہ ضرورت ہے جو جان یا آبرو سے متعلق ہو، یعنی اس کے پورا نہ ہونے سے جان کے یا آبرو کے جانے کا خوف ہو، تو جو چیزیں انسان سے بلاکت کو رفع کریں حقیقتاً جیسے نفقہ اور رہنے کا مکان اور آلاتِ حرب اور سردی و گرمی کے کپڑے یا تقدیراً جیسے دین کہ مدیون اس کی ادائیگی کی طرف محتاج ہے، اپنے نفس سے جس (قید) کو دفع کرنے کے لئے جو بہ منزلہ بلاکت

کے ہے اور جیسے پیشہ کے آلات اور گھر کا سامان اور سواری اور کتابیں اہل علم کے لئے۔ ”لأن الجہل عندہم کالہلاک“۔ تو جو مال اپنی اصل ضرورتوں سے زائد ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور جو مال ان اصل ضرورتوں کے لئے ہو وہ مثل معدوم کے ہے، اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

”وفارغ عن حاجتہ الأصلیة لأن المشغول بہا کالمعدوم“

(درختار ۷۲۷)۔

رعی نفس حوائج تو ان میں بدرجہ اولیٰ زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ وہ حوائج اصلیہ میں سے ہیں اور نمود بھی نہیں ہے۔

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

مال زکوٰۃ کا ایسے قرض سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ اللہ جل شانہ کا قرض ہو جیسے زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ کہ حق اللہ تو ہیں مگر ان کا مطالبہ امام وقت کی طرف سے ہوتا ہے یا وہ قرض بندوں کا ہو، جو مال اس قسم کے قرض میں مستغرق ہو یا اس قدر قرض ہو کہ اس کے ادا کرنے کے بعد نصاب پورا نہ رہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

دیون کی اقسام

امام صاحب کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں: قوی، متوسط اور ضعیف۔

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض کسی کے ذمہ عائد ہوا ہو۔

متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہوا ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا

چاندی نہ ہو بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو۔

دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بذمہ دیون عائد نہ ہوا ہو، جیسے

دین مہر وغیرہ۔

دین قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے، مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کی مقدار روپیہ وصول ہو جائے، اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا، لیکن جب ادا کی جائے گی تو تمام ماضیہ کا حساب کر کے ادا کی جائے گی، اور دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد بھی جب تک سال بھر نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوتی اور دین متوسط میں امام اعظم ابوحنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس پر دین قوی کی طرح زکوٰۃ تو ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی، مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ پورا نصاب، یعنی دو سو درہم یا اس کی مقدار مال جب وصول ہو اس وقت ادا کرنا لازم ہوگا، مگر ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے، اس پر بھی زکوٰۃ ایام ماضیہ کی واجب نہیں ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال بھر اس پر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب ”بدائع“ نے اسی آخری روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد جوابات درج ذیل ہیں:

۱- ایسا کثیر دین جو طویل الاجل ہے اور اس کی ادائیگی کی مدت قسط وار بیان کر دی گئی ہے جو مؤجل ہے اور دین مؤجل کو اگرچہ بعض نے مانع زکوٰۃ قرار دیا ہے، مگر صحیح یہی ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ نہیں ہے، علامہ ابن عابدین نے ”رد المحتار“ میں قہستانی کے حوالے سے جوہر سے اسی قول کی تصحیح نقل کی ہے کہ دین مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

”زاد القہستانی عن الجوہر والصحیح أنه غیر مانع“ (رد المحتار ۷/۴۷)۔

اس روایت پر جس قسط کی ادائیگی ہو رہی ہے وہ مانع بنے گی، باقی قرض کا چونکہ مطالبہ نہیں اس لئے مانع نہیں بنے گا۔

## کمپنیز پر زکوٰۃ

ایسی کمپنی جس میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اٹاٹے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں ان پر زکوٰۃ کے وجوب کے لئے کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جس فرد کا انفرادی حصہ نصاب کو پہنچے گا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

## ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے زیورات ہی کیوں نہ ہوں، ہاں اگر ہیرے اور جواہرات تجارت کے لئے ہیں تو اس صورت میں وہ مال تجارت ہوں گے اور ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”لا زکاة فی اللالی والجواہر وإن ساوت ألفاً اتفاقاً إلا أن تكون للتجارة“ (درمختار علی ہاشم رد المحتار ۱۸/۲)۔

## اموال تجارت پر زکوٰۃ

جہاں تاجر کے قبضہ میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں یوم وجوب کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یوم خرید کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا۔ زمین و جائیداد جو تجارت کے لئے ہیں ان کا یہی حکم ہے۔ یہ امام صاحب کا قول ہے اور صاحبین کے نزدیک یوم ادا کی قیمت کا اعتبار ہوگا، تاجر عام طور پر تھوک سے ہی خرید کرتا ہے تو اسی کے اعتبار سے اسٹاک کی قیمت لگائے گا اور جو اشیاء پھٹکر سے خریدی ہیں ان میں پھٹکر کی قیمت لگائے گا اور زکوٰۃ ادا کرے گا۔

”وتعتبر القيمة یوم الوجوب وقالوا یوم الأداء وفي السوانم یوم الأداء اجماعاً“ (الدر المختار ۳۰/۲)۔

## شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیرز ہولڈر نے جو روپیہ کمپنی کو دیا ہے وہ پوری رقم تجارت میں لگی ہوئی ہے، اس میں سے اس کے حصہ کی وہ رقم جو مشنری کی خرید میں صرف ہوگی ہے یا دیگر آلات حرفہ (پیشہ) میں صرف ہوئی ہے، اس تمام رقم کو منہا کر کے بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی (بشرط نصاب و حولان حول)۔ اگر مشنری میں صرف شدہ رقم کا علم نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا تو احتیاط اس میں ہے کہ پوری رقم کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، جو رقم نفع کی آتی ہے اور وہ صرف ہونے سے پہلے رہتی ہے اس پر (اگر وہ بقدر نصاب ہے اور سال گزر گیا ہے) زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈز جو بڑا قرضہ حکومت کو دیا گیا ہے اس کا حکم یہی ہے کہ وصولیابی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور یہ دین بھی دین قوی ہے، چالیس درہم یا ان کے بقدر روپیہ وصول ہونے پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔



## زکوٰۃ سے متعلق اہم مسائل

مولانا عبدالرحمن قاسمی ☆

۱- مال تجارت کی وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اسی طرح وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا، لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے (مانگیری ۱۷۲/۱)۔

۲- کرائے کے مد میں پیشگی دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ مؤجر مالک مکان پر واجب ہے اور ڈپوزٹ کی رقم مال مرہون ہے اور مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہے اور نہ مرتہن پر ہے، لہذا ڈپوزٹ رقم کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر ہوگی اور نہ مالک مکان پر، لیکن ڈپوزٹ کی رقم کرایہ دار کو واپس ملنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لیام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۳- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۴- رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ حرام مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور اگر اموال حرام حلال مال میں مخلوط ہو گئے ہوں تو اس مخلوط مال حرام کی مقدار نکال کر باقی اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

۵- دین اگر قوی (جو قرض اور مال تجارت کا بدل) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر چالیس درہم کی مالیت قبضہ میں کرنے کے وقت واجب ہے، نیز لیام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

اگر متوسط (جو ایسے مال کے عوض میں واجب ہو اور جو تجارت کے واسطے نہ تھا اور نہ نقد قرض دیا تھا) اور ضعیف (جو مال کا بدل نہ) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر قبضہ کے حوالانِ حول پر واجب ہے۔ اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہے اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو تو اگر مدیون کے قرض کو منہا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب پختا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، ورنہ نہیں۔

دین کی وصولیابی کی امید قوی یا غالب ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے، پھر اگر وہ دین قوی ہو تو اس پر عند القبض فیما مضیٰ کی زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر دین متوسط یا ضعیف ہو تو بعد القبض حوالانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو یا ضعیف امید ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۶- پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہے۔

### دوسری شرط نما

وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط نما (مال نصاب کا بڑھنے والا ہونا) ہے، نما کی دو صورتیں ہیں: ایک حقیقت بڑھنے والا ہو، یعنی توالد و تناسل و تجارت سے بڑھنے والا ہو، دوسری صورت تقدیراً (حکماً) بڑھنے والا ہو، یعنی حقیقت میں تو بڑھنے والا نہ ہو، لیکن وہ بڑھنے والے کے حکم میں ہو کہ اگر مالک اس کو بڑھانا چاہے تو وہ بڑھانے پر قادر ہو، اس طرح کہ مال اس کے یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو، پس جو شخص اس کے بڑھانے پر قادر نہیں، مثلاً مالِ ضمائر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

### تیسری شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ میں مشغول وہ مال شمار ہوتا ہے جو انسان کو حقیقتاً یا تقدیراً ہلاک ہونے

سے بچائے۔

”مجمع الانہر“ میں ہے:

”حاجتہ الأصلیة) ای عما یملف عنہ الہلاک تحقیقاً أو تقدیراً“ (۱۹۳/۱)۔  
حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ہر ماحول کے لحاظ سے ہوگا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

دین مانع زکوٰۃ سے وہ دین مراد ہے جس کا طلب کرنے والا کوئی بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو جیسا کہ قرض اور مولیٰ ہوئی چیز کی قیمت اور تلف کی ہوئی چیزوں کا ضمان یا زخمی کرنے کا تاوان ہو اور قرض چاہے نقد کی قسم سے ہو یا کیلی وزنی ہو یا کپڑے ہوں یا جانور ہوں یا خلع کے عوض میں واجب ہو یا عمداً قتل کرنے کے عوض میں صلح ہو کر واجب ہو اور وہ فی الحال دینا ہو یا کسی قدر مدت کے بعد دینا ہو، اور وہ قرض، خواہ اصلتہ یا کفالتہ ہو، اور خواہ وہ قرض اللہ کا قرض ہو، جیسا کہ زکوٰۃ اور خراج کا دین۔ بخلاف نذر اور کفارہ اور حج کے دین کے، اس لئے کہ ان قرضوں کا طلب کرنے والا کوئی بندہ نہیں اور اسی طرح صدقۃ الفطر اور حج تمتع کرنے والے کی ہدیٰ اور قربانی کا دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین طویل الاجل جیسے زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لئے قرض مانع زکوٰۃ ہے، لہذا اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا (بہاریہ ۱/۱۶۶، المجموعۃ البیروتیہ ۱۳۹/۱، ماننگیری ۱/۱۷۲)۔

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات سرمایہ محفوظ کرنے کے لئے خریدے ہوں یا تزئین و آرائش کے لئے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے (فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۷۲)۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی مالیت کا تعین ادائیگی زکوٰۃ کے دن قوت خرید کے اعتبار سے کیا

جائے گا، پھر جو تاجر تھوک مال کی تجارت کرتا ہے اس کے لئے تھوک بھاؤ کا اعتبار کرنا ہوگا، اور جو تاجر چھلکر مال فروخت کرتا ہے اس کے لئے چھلکر فروختگی کا اعتبار کرنا ہوگا۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

ارضی تجارت اگر خراجی ہیں تو ان میں خراج واجب ہے زکوٰۃ نہیں، اور اگر عسری ہیں تو ان میں عشر واجب ہے، زکوٰۃ نہیں، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک عشر کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ (لہذا امام محمدؒ کے قول کو اختیار کرنا مناسب ہے، کیوں کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے) (۲۳۲/۳)

ارضی تجارت اگر نہ عسری ہوں اور نہ خراجی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب ادائیگی کے دن کی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگا۔

### شیراز اور بونڈ زکی زکوٰۃ

۱- شیراز کی خرید بغرض تجارت ہو تو تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

۲- شیراز کی مالیت کا تعین بوقت ادائیگی زکوٰۃ مارکیٹ کے نرخ سے کیا جائے گا۔ شیراز کی خرید بغیر ذریعہ آمدنی ہو تو آلات و اثاثہ کے علاوہ جو اصل و منافع ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

۳- قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈز پر لگایا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، بونڈز کیش کرانے کے وقت گزرے ہوئے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے (درمختار علی ہاشم رد المحتار) (۲۶۶/۳)

### نصاب موجب زکوٰۃ

صرف سونا ہو یا بقدر نصاب سونا ہو تو اس میں سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔  
 صرف چاندی ہو یا بقدر نصاب چاندی ہو تو اس میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔  
 سونا، چاندی دونوں نصاب سے کم ہوں تو دیکھا جائے گا، دونوں کی قیمت مل کر کسی  
 ایک نصاب کے بقدر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔  
 اموال تجارت کی قیمت اگر دونوں (سونا، چاندی کے) نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو اختیار  
 ہے جس نصاب کا چاہے اعتبار کرے اور اگر دونوں نصابوں میں سے صرف ایک نصاب کو پہنچتی  
 ہے تو اسی نصاب کا اعتبار کرنا ضروری ہے (مانگیری ۱/۱۷۹)۔

### نصاب حرمت زکوٰۃ

مالدار کو جو نصاب کا مالک ہو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے خواہ وہ نصاب کسی بھی قسم کے مال  
 کا ہو بشرطیکہ اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو، پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ حرمت زکوٰۃ  
 کے لئے نصابی اموال (سونا، چاندی، سائمنہ) میں ان کے نصاب کی مقدار کا اعتبار ہے یا قیمت  
 کے حساب سے نقدی کے نصاب کا اعتبار ہے، بعض نے نصابی اموال میں ان کے نصاب کا اعتبار  
 کیا ہے اور بعض نے قیمت کا اعتبار کیا ہے، نصابی اموال کے علاوہ میں بالاتفاق قیمت کا اعتبار  
 ہوگا اور موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

### مصارف زکوٰۃ

مستحق زکوٰۃ طلبہ کو چیک کے بجائے رقم زکوٰۃ دی جائے اور وہ وصول کرنے کے بعد  
 مدرسہ میں جمع کر دیں، یہ صورت جائز ہے۔  
 مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔

سفراء و محصلین کو کمیشن پر طے کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ وہ ”العاملین علیہا“ میں داخل ہیں، اور عملہ کو ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

۱- سورہ توبہ کی آیت ”إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم“ (سورہ توبہ: ۶۰) میں ”إنما“ سے جو حصر بیان کیا گیا ہے وہ حصر حقیقی ہے۔

۲- جی ہاں، ہم جمہور مفسرین اور فقہاء کی اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب و سنت میں مطلق طور پر ہو تو اس سے مراد غزوہ و جہاد ہی ہوتا ہے (ہدایہ ۱/۱۸۵)۔

۳- آیات احکام میں سے کسی آیت کی تشریح میں قرون اولیٰ میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو ہمارے لئے لازم و ضروری ہے کہ ان دو اقوال میں سے ایک قول کو اختیار کریں۔ ان دو اقوال کو چھوڑ کر آیت کی تفسیر و تشریح میں کوئی تیسرا یا چوتھا قول اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

### جوابات ضمیمہ

شیرز پر زکوٰۃ کے وجوب کی تفصیل یہ ہے:

۱- شیرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو اور ابھی تک نیت تجارت میں تبدیلی نہ آئی ہو (چاہے زیادہ مدت پاس رکھا جائے یا کم مدت) تو شیرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت اور اس سے

ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً واجب ہے۔

☆ شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو پھر نیت تجارت میں تبدیلی آگئی، یعنی شیئرز کو ذریعہ آمدنی بنا دیا تو شیئرز کی جو رقم آلات و اثاثہ میں لگ گئی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی جو رقم آلات و اثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور شیئرز سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے، شیئرز چاہے کم مدت پاس رہے یا زیادہ مدت۔

☆ شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو بلکہ بہ نیت ذریعہ آمدنی ہو تو شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات و اثاثہ میں لگ گئی ہے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات و اثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

### وجوب زکوٰۃ صافی آمدنی پر یا غیر صافی آمدنی پر؟

☆ اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں تو آمدنی سے منہا کر دیے جائیں گے، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اور اگر از قبیل دیون شرعی نہیں ہیں جیسے سیل فیکس، انکم ٹیکس وغیرہ تو ان کو آمدنی سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

☆ اخراجات اگر یوم و وجوب ادا سے پہلے ادا کر دیے گئے ہیں تو بقیہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے۔

☆ اخراجات اگر یوم و وجوب ادا سے پہلے ادا نہیں کئے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:

۱- اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا کر دیے جائیں گے۔

- ۲- اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی نہیں، جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا نہیں کئے جائیں گے۔
- ☆ شیئرز کو مسلسل خرید اور بیچا جاتا ہو، نفع بھی ہوتا ہو اور نقصان بھی تو یوم و وجوب اور شیئرز کی جو پوزیشن ہوا اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔
- ۲- کاروباری ادارہ میں کاروبار سے ہوئے نفع اور موجودہ اسٹاک میں جن اشیاء کی خرید بغرض تجارت ہوئی ہو، ان تمام پر شرعاً واجب ہے۔
- ☆ جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ (منافع) دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- ☆ جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ دودھ، انڈے فروخت کر دیئے جائیں تو ان کے اثمان پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- ۳- تمسکات سے کیا سرکاری تمسکات مراد ہیں؟ یا اس کے علاوہ؟ پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے، نیز اخراجات کی مکمل وضاحت بھی۔

### انسٹسٹ کے متعلق

مذکورہ حالات میں حکومت کی سیکورٹیزز بانڈز میں اور کمپنیوں کی فیکسڈ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز مگر انہیں دی جاسکتی۔



## زکوٰۃ میں ”نما“ کی حقیقت اور صورتیں

مفتی محمد عبدالرحیم تھامی ☆

زکوٰۃ کے معنی طہارت و پاکیزگی اور زیادتی و بڑھوتری کے ہیں، اسلام کی نظر میں مال کے مقرر فرمودہ شرعی حصہ کا مسلمان غیر سید فقیر کو مالک بنا دینا اور اپنی ملکیت سے خارج کر دینا زکوٰۃ ہے۔

۱- زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملکیت تامہ شرط ہے اور کامل مکمل ملک قبضہ سے ہوتی ہے:

”فقد ذکر فی البیان من الشروط الملک المطلق، وقال: وهو الملک یبدأ ورقبۃ“ (رد المحتار: ۲/۲۴۰)۔

لہذا مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور وہ قیمت جو ادا کی جا چکی خریدار کے تصرف سے نکل کر بائع کے قبضہ میں داخل ہوگئی اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں (دیکھئے: رد المحتار: ۲/۳۶۲)۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب نے ”فتاویٰ دارالعلوم“ میں قول اول کو ترجیح دیا ہے، تحریر فرماتے ہیں: ”جس وقت جس قدر حصہ ثمن کا وصول ہوگا اسی وقت سے اس کا سال لگایا جائے گا، بعد سال بھر کے اداء زکوٰۃ واجب ہوگی اور بعض روایات میں بقدر وصول مقدار نصاب زکوٰۃ لازم

ہوگی اور اسی کو ظاہر الروایت اور مفتی بہ قرار دیا گیا ہے اور بعض روایات میں قول اول کی تصحیح کی گئی ہے، ”وہو الأقیس کذا فی الشامی“ (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۶۶ء)۔

۲- مالک مکان کو دی جانے والی رقم کی دونوعینتیں ہیں: ایک یہ کہ پیشگی کرایہ کے نام سے دی گئی ہو اور اس کو کرایہ میں وضع کرانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ مکان دار کے ذمہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ زر ضمانت (ڈپوزٹ) کے نام سے مالک مکان کے پاس رقم جمع کی جائے، لیکن عقد اجارہ فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے کے وقت کرایہ دار کو واپس کئے جانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہے، رقم واپس ملنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ لازم ہوگی۔

”در مختار“ میں ہے: ”وکذا الودیعة عند غیر معارفہ، قال الشامی: فلو عند معارفہ تجب الزکوٰۃ“ (رد المحتار ۹/۲۳۲)

”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے:

”اس روپیہ کی زکوٰۃ بعد واپسی کے تمام گزشتہ سالوں کی ادا کرنا لازم ہے، اگر اس خیال سے کہ بعد واپسی کے بہت برسوں گزشتہ کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اور رقم کثیر ہو جاوے گی، ہر سال موجودہ روپے کے ساتھ زکوٰۃ دے دیا کرے تو یہ بھی درست ہے“ (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۰۶ء)۔

۳- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کا کوئی معین مالک نہیں ہے، لہذا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

”وسببہ ای سبب افتراضہا ملک نصاب حولی قال الشامی: فلا زکوٰۃ فی سوانم الوقف والنخیل المسبلة لعدم الملک“ (رد المحتار ۹/۲۳۲)۔

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

”مدرسہ کا چندہ جو بقدر نصاب جمع ہوتا ہے اور سال اس پر گزر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ

واجب نہیں ہے“ (فتاویٰ دارالعلوم ۹/۶۷۶، ۵۱۲۳)۔

مدرسہ وغیرہ کے مال میں کسی کو بھی کامل ملکیت حاصل نہیں اگرچہ ظہراً کچھ تصرفات کا اختیار ہو، مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے بھی وجوب زکوٰۃ کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

۴- رشوت، سود اور حرام طریقہ پر قبضہ میں آنے والے مال کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ یہ قابض مالک نہیں، اس لئے قابض پر لازم ہے کہ یہ مال مالک کو واپس کرے اور واپسی نہ ہو سکتی ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کر دے، جب پورے مقبوضہ مال کو واجب التصدق قرار دیا گیا ہے تو اس کے بعض کو زکوٰۃ میں ادا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

”لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكوة لأن الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد إيجاب التصدق ببعضه“ (رد المحتار ۲/۲۵، فتاویٰ عبدالحی ۲/۲۳۳)۔

مال حرام کو حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ تمیز مشکل ہو جائے موجب ملک ہے، لہذا اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

”ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوة فيه ويورث عنه، لأن الخلط استهلاك إذا لم يكن تمييزه عند أبي حنيفة رحمه الله وقوله أرفق“ (در مختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۲۵)۔

”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے:

”مال حرام تمام کو بشرائط صدقہ کرنا لازم ہے، زکوٰۃ اس میں نہیں ہے، مگر خلط مال حرام کا موجب ملک ہے اس وقت اس میں زکوٰۃ بھی لازم ہوگی“۔

۵- قرض کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی، (۲) دین متوسط، (۳) دین ضعیف

اول یہ ہے کہ نقد روپیہ یا سونا چاندی قرض دینے یا تجارتی مال فروخت کرنے کے بعد

لینے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی رہے اور ایک سال یا کئی سال کے بعد وصول ہو تو ایسا قرض فقہی اصطلاح میں دین قوی ہے، بقدر نصاب باقی رہنے کی صورت میں اس قرض پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ فرض ہے اور یک مشت وصول نہ ہو تو مقدار نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوگی اور ہر پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی، اسی طرح پورے سالوں کی زکوٰۃ نکالی جائے گی (دیکھئے رد المحتار ۳۵/۴)۔

دوسری قسم یہ ہے کہ مال تجارت کے علاوہ خانگی سامان یا استعمالی اشیاء کی قیمت خریدار کے ذمہ باقی ہو تو یہ دین متوسط ہے، ایک سال یا متعدد سالوں کے بعد وصول ہونے پر اس کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی فرض ہوگی اور یک مشت وصول نہ ہو تو جب تک مقدار نصاب کے برابر قرض وصول نہ ہو اس کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی اور وصولی کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی، اگرچہ یہ وصول شدہ قرض بقدر نصاب نہ ہو، لیکن دیگر مال کے ساتھ مل کر نصاب بن جائے تو اس کو شامل کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی (دیکھئے رد المحتار ۳۶/۴)۔

تیسری قسم یہ ہے کہ نقد روپیہ اور اشیاء کی فروختگی کے علاوہ کسی اور سبب سے دوسرے کے ذمہ قرض ہو جائے، مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر یا بیوی پر شوہر کا بدل خلع یا تامل پر دیت خوں بہا، یا ملازم کی تنخواہ تو یہ قرض دین ضعیف ہے، وصولی کے بعد مالک کے پاس سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ وصول شدہ مال بقدر نصاب نہ ہو اور دیگر مال کے ساتھ شامل کر کے نصاب بن جائے تب زکوٰۃ فرض ہوگی مگر حق دار کو وصول ہونے سے پہلے گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ اس پر فرض نہیں (دیکھئے رد المحتار ۳۶/۴)۔

قرض کے اقسام و احکام کی مذکورہ تفصیل سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود مدیون دین کی ادائیگی میں نال منول کر رہا ہو تب بھی مدیون پر زکوٰۃ فرض نہیں کیا جاسکتا، البتہ قرض کی وصولی سے سال پورا ہونے پر مستقبل کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ فرض ہوگی، گزشتہ

سالوں کی نہیں (رد المحتار ۶۲/۲)۔

”فتاویٰ رحیمیہ“ میں ہے:

”دوسرا آدمی اجازت لے کر اپنی رقم سے صاحب مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، مگر بکرنے زید سے روپیہ قرض لیا ہے، اس وجہ سے اس کا ادا کرنا سود شمار ہوگا، لہذا زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، زید کے ذمہ زکوٰۃ باقی رہے گی“ (۱۳۸/۵)۔

۶- دین کی تینوں قسموں قوی، متوسط، ضعیف کی تفصیل سے پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت واضح ہوگئی، مزید تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ مال تجارت کا معاوضہ نہیں ہے، اس لئے دین قوی میں داخل نہیں ہوگا، البتہ خدمت حرک کا معاوضہ ہے، اس کو دین متوسط قرار دیں یا دین ضعیف بہر حال صحیح روایت کے مطابق اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں:

”خلاصہ یہ ہے کہ دین قوی میں داخل ہونے کی صورت ہے کہ عبد تجارت کی خدمت یا تجارت یا ارض تجارت کا معاوضہ ہو، اس کے سوا کوئی دین اجرت دین قوی میں بہ اتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کیا گیا یا بطور انعام کورنمنٹ کی طرف سے جمع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں، اس لئے اس میں صرف وہی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دین متوسط ہو یا دین ضعیف اور دین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لئے مشکل ہے کہ دو روایتیں جو ”محیط“ کے حوالہ سے ”منحہ الخالق“ میں لکھی ہیں وہ دونوں عبد کی خدمت کے متعلق ہیں، حرک کی خدمت کا وہاں ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ حرک کی خدمت کو عبد کی خدمت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، حسب تصریحات فقہاء خدمت عبد فی الجملہ مال ہے اور خدمت حرماں نہیں ہے، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور اگر اس کو دین متوسط بھی تسلیم کیا جائے تب بھی صحیح روایت کے مطابق امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک دین متوسط بھی

بہ حکم دین ضعیف ہے، اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کما صرح بہ فی البدائع۔ الغرض پر اوپنٹ فنڈ کا روپیہ دین قوی میں تو داخل نہیں ہو سکتا اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حرکی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی صحیح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے“ (امداد فقہاوی ۳۹/۳، نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳)۔

پر اوپنٹ فنڈ میں اپنی مرضی سے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر ملی ہوئی زائد رقم سود ہے جیسا کہ فتاویٰ رحیمیہ ۱۴۷/۵ میں ہے۔

### نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

مال میں زیادتی نما ہے۔ مویشی سے نسل چلانا یا تجارت سے مال کمانا یہ ظاہری بڑھوتری ہے، سونے چاندی اور قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قیمتوں میں اضافہ ہونا بھی نما کی ایک صورت ہے، مشنریز اور مکانات سے آمدنی حاصل کرنا بھی نما ہے۔ اس بابت حضرت مولانا عمر احمد عثمانی کی بہت ہی واضح اور مفصل تحریر ہے، جس سے اس مسئلہ کے تمام گوشے واضح ہو جاتے ہیں (دیکھئے: فقہ القرآن ۲۵۳، ۲۵۷)۔

”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے:

”کرایہ پر مکان چلانے کے لئے لینا یعنی کرایہ پر دینے کے لئے مکان خریدنا یہ بھی تجارت کے لئے ہی خریدنا ہے، پس زکوٰۃ اس کی قیمت پر واجب ہوگی، جیسا کہ ”در مختار“ میں ہے:

”اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ پر دینے کے لئے خریدنا بھی تجارت کے لئے خریدنا ہے“

(فتاویٰ دارالعلوم ۹۱/۶)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں علماء کرام کو حالات حاضرہ اور دلائل مندرجہ کو سامنے رکھتے ہوئے کرایہ کے مکانات اور مشنریوں کی قیمتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کے متعلق غور و خوض کرنا چاہیے۔

### حاجت اصلیہ

خانگی ساز و سامان، رہائشی مکان، تجارتی دکان، زراعتی زمین، استعمالی سواری، ستر پوشی، روزی، جسمانی ضروریات کا جن چیزوں پر دار و مدار ہے، حاجت اصلیہ میں داخل ہیں (دیکھئے رد المحتار ۲/۶۵)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

”حضرت استاذیؒ کو امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور خود بھی احقر کا اسی پر عمل ہے، مگر اس میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر اس عقار سے یہ شخص استعمال نہیں کرتا تب تو خود اس کی قیمت کا اعتبار ہے، پس اگر وہ فاضل از حاجت اصلیہ قیمت میں بقدر نصاب ہے تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اخیہ ہے اور اگر اس سے استعمال کرتا ہے تو اس کے نفع کا اعتبار ہے اور اگر سال بھر کے خرچ سے بمقدار نصاب نہیں بچتا تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اخیہ نہیں، اور امام صاحبؒ کے قول کا تقدم علی الاطلاق نہیں۔ کما فصل فی رسم المفتی“ (امداد الفتاویٰ ۲/۳۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ کا تعیین دور حاضر میں حالات کا جائزہ لے کر علماء ہی کو کرنا چاہیے۔ کفایت، مؤنت، علاقہ، ماحول اور گرانی و ارزانی کے اعتبار سے مختلف ہونے کی بنا پر حاجت اصلیہ کا معیار مقرر کرنا ضروری ہے، (دیکھئے فتاویٰ ۲/۶۵)۔

### کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟

دین عبد یعنی بندے جس کا مطالبہ کرنے والے ہوں ایسا قرض و وجوب زکوٰۃ سے مانع

ہے، لہذا اس کو مال سے منہا کر کے باقی ماندہ کی زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

”ومدیون للعبء بقدر دینہ فیزکی الزائد ان بلغ نصاباً“ (درمختار علی ہاشم

رد المحتار ۷/۷۲)۔

طویل الاجل کثیر دین کی جب تک کل قسطیں ادا نہ ہو جائیں غناء کا تحقق نہیں ہوگا اور زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

”قال الشامی ولا يتحقق الغنى بالمال المستقرض ما لم يقبض“

(رد المحتار ۸/۲۲)۔

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

”اگر کسی کے پاس اس قدر مال ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہئے، لیکن وہ اس کے ساتھ ہی مقروض بھی ہے تو اگر اس پر قرض اتنا ہو جو اس کے مال کو محیط ہو جائے، یعنی دس ہزار روپیہ ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے اور پانچ ہزار روپیہ کا قرض ہے تو اسے صرف پانچ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ دینی ہوگی، اسی زمرہ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو بینکوں سے قرض لے کر کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتے ہیں، اگر کارخانہ اور فیکٹری کی قیمت کے برابر سہ ماہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی، البتہ اگر قرض کی مقدار کم ہے تو جس قدر فیکٹری اور کارخانہ کی قیمت قرض سے زیادہ ہے، اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس سے زیادہ نہیں“ (فقہ القرآن، ۲۶۶)۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت خواہ کتنی ہی ہو اس کے مالک شرکاء ہیں، لہذا واجب زکوٰۃ میں ان میں سے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب مالیت کے ہوں گے ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی باقی پر نہیں (امداد الفتاویٰ ۲/۵۳)۔



”و سببه اى سبب افتراضها ملك نصاب حولى نسبة للحول لحولانه عليه تام بالرفع صفة ملك“ (درمختار علی ہاشم الرودی ۲/۳۲)۔  
 جن شرکاء کی ملکیت میں بقدر نصاب مالیت کا شیئر ہو، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس شیئر کی مالیت اتنی نہ ہو، اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

### ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات کی تجارت کی جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہونا ظاہر ہے۔ دور حاضر میں ہیرے جواہرات قیمتی مال ہیں ان کی ذخیرہ اندوزی سے قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ہیرے جواہرات کی شکل میں سرمایہ محفوظ کرنے پر بھی زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے۔  
 مولانا عمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک امام ابو یوسف اور امام غزالی کا قول زیادہ صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام جواہرات یا تو معدنیات سے تعلق رکھتے ہیں یا سمندری برآمدات سے، معدنیات کے متعلق تمام صحیح روایات میں خمس کے وجوب کا حکم آیا ہے، سمندری برآمدات مثلاً مروارید، مونگا وغیرہ بھی معدنیات ہی کے مثل ہیں، لہذا ان میں خمس واجب ہونا چاہیے، لیکن یہ خمس ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو ان چیزوں کو زمین سے یا سمندر سے برآمد کرتے ہیں، جو ان کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرتے ہیں، یا بہ طور زیورات کے انھیں استعمال کرتے ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ مال منقوم ہیں اور سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ فیصلہ فرماتے وقت کہ جواہرات وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اس نکتہ کو کیوں نظر انداز فرما دیا کہ یہ بھی سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ہی ایک ذریعہ ہے، جہاں تک ہمارا خیال ہے فقہاء کے دور میں ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے اور ان کے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ خال خال کچھ لوگ دو چار موتی یا زمرّ دیا قوت وغیرہ کے گلینے اپنی انگلیوں وغیرہ

میں لگوا لیتے تھے، اسی لئے انہوں نے یہ فیصلہ فرمایا، ورنہ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ آدمی اپنے سرمایہ کو سونے اور چاندی کی شکل میں جمع کرے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر اسی سرمایہ کو جوہرات کی شکل میں محفوظ کرے تو اسے زکوٰۃ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ حالاں کہ سرمایہ دونوں جگہ موجود ہے، محض اس کی حفاظت کے طریقے مختلف ہیں، اس طرح تو ہم سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لئے سونے چاندی کو ذخیرہ نہ کریں، بلکہ جوہرات کو ذخیرہ کر لیں اس کا ثبوت کہ فقہاء کے عہد میں جوہرات کی صورت میں سرمایہ کو ذخیرہ کرنے کا عام رواج نہ ہوا تھا، یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت بھی ”وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ“ (سورہ توبہ: ۳۴) (یقیناً جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر اسلام) آپ انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے)۔

اس آیت میں سونے اور چاندی کے ذخیرہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ عہد قدیم میں جوہرات کو ذخیرہ کرنے اور سرمایہ کو اس شکل میں محفوظ کرنے کا طریقہ رائج نہیں تھا، اس لئے اگر فقہاء کرام کے عہد تک بھی یہی صورت حال تھی تو بڑی حد تک انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے، لیکن آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے، اس لئے ان ارشادات کو حرف آخر قرار دے کر سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے لئے اس طریقہ کو اپنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی (فقہ القرآن ۲۶۳)۔

ہیرے جوہرات کے زیورات سے اگرچہ تمول مقصد نہ ہو صرف زینت کے طور پر ہی استعمال کئے جائیں تب بھی ان پر زکوٰۃ فرض ہونا چاہئے، ردالمحتار میں ہے:

”سئل الحسن بن علی عن من لها الجواهر واللالی تلبسها فی الأعیاد وتزین بها للزوج ولیست للتجارة هل علیها صدقة الفطر؛ قال: نعم، إذا بلغت

نصاباً“ (رد المحتار ۲/۶۵)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”وما زاد على ذلك من الحلبي والأواني والأمتعة التي يقصد بها الزينة إذا بلغ نصاباً تصير به غنية“ (فتاویٰ شامی ۲/۶۵)۔

### سامان تجارت یا اراضی تجارت کی زکوٰۃ

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے، ادائیگی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے اس کی زکوٰۃ نکالی جائے گی، تھوک بیوپاری کو زکوٰۃ دیتے وقت تھوک قیمت کا اعتبار کرنا چاہئے اور کچھلکر تجارت کرنے والے کو کچھلکر قیمت سے ہی زکوٰۃ ادا کرنا چاہئے۔ تجارتی کاروبار کے لئے خریدی گئی زمینوں کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان زمینوں کی مارکیٹ میں جو قیمت ہو وہی معتبر ہونا چاہئے۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالوا يوم الأداء وفي السوانم يوم الأداء إجماعاً وهو الأصح“ (در مختار علی ہاشم ارد ۲/۲۲)۔

### شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

تجارتی شیرز کے اصل سرمایہ اور اس سے حاصل شدہ نفع دونوں پر زکوٰۃ فرض ہے، کرایہ وصول کرنے والی کمپنیوں کے شیرز میں صرف نفع پر ہی زکوٰۃ ہے۔

فتاویٰ رحمیہ میں ہے:

شیرز پر زکوٰۃ ہے، شیرز پر جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصلی رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی محض کرایہ وصول کرتی ہے جیسا کہ ریلوے کمپنی وغیرہ تو زکوٰۃ صرف نفع پر واجب ہے۔ اصلی رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے (فتاویٰ رحمیہ ۱۱۱/۳)۔

ادائیگی زکوٰۃ کے وقت مارکیٹ میں شیئر کی جو قیمت ہوگی اسی اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ ”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے کہ جو قیمت اس وقت ہے یعنی پانچ سو روپے کی زکوٰۃ دے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۶/۶)۔

دوسری جگہ اس طرح ہے:

سوال: زید نے ایک کمپنی کے پندرہ حصے پانچ ہزار کے خریدے، اس میں جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سالانہ تقسیم ہو کر حصہ داروں کو ملتا ہے، زید کو بھی پانچ سو روپے ملے، آیا زید کے ذمہ پانچ ہزار کی زکوٰۃ دینا لازم ہے یا منافع سالانہ کی رقم پر زکوٰۃ لازم ہوگی؟  
جواب: زید کو اس رقم پانچ ہزار کی زکوٰۃ بھی دینی لازم اور فرض ہے، کذا فی الدر المختار (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۰/۶)۔

قرض حاصل کرنے والی حکومت یا کمپنی کی طرف سے دیئے گئے سرٹیفکیٹ کا نام بونڈ ہے، لہذا یہ قرض دین قوی ہے، مدت معینہ گزرنے کے بعد بونڈ کیش کرانے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی لازم ہوگی (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۷/۶)۔

### نصاب زکوٰۃ

”ولو بلغ بأحدهما نصابا دون الآخر تعین ما يبلغ به إلى قوله قومه بالأنفع للفقير“ (در مختار علی الحدیث ۳۱/۳)۔

فرض کی ادائیگی میں احتیاط کا تقاضہ اور انفع للفقراء یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور حرمت کے لئے چاندی کے نصاب کو معیار مقرر کرنا مناسب ہے۔

### مصارف زکوٰۃ

۱- غیر مستطیع طلبہ کو نقد یا چیک کی شکل میں مقررہ خرچ دے کر اس کو فیس کے نام سے وصول کیا جائے تو شرعاً زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے، اس لئے زکوٰۃ پر مہتمم کا قبضہ ہو جانا زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

”مدرسہ کا مہتمم وکیل ہوتا ہے طلبہ فقراء کی طرف سے، کہ ارباب اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے طلبہ پر صرف کرے، اس صورت میں بلاشبہ مختلف ارباب اموال کی زکوٰۃ کو خلط کرنا مہتمم کے لئے درست ہے۔ درمختار کی جو عبارت سوال میں نقل کی گئی اس کے متصل ہی ایک استثناء بھی مذکور ہے، اگر اس پر غور کیا جائے تو ارباب اموال کی طرف سے اذن کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔“  
خلط زکوٰۃ موکلیہ ضمن وکان متبرعا إلا إذا وکله الفقراء“ (درمختار) و صار خالطا مالہم بعضہ من بعض (کتابی ۱۳/۲، فتاویٰ محمودیہ ۲۱۶/۱۰)۔

حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب نے اسی فتویٰ پر اشکال کے جواب میں تذکرۃ الرشید (۱۶۳، ۱۶۵) سے نقل فرمایا ہے:

”مہتمم مدرسہ کا نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسے امیر نائب جملہ عام کا ہوتا ہے، پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطلی سے نکالا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول المملکت والذات ہوں، مگر نائب معین ہے، پس بعد موت معطلی کے ملک ورثہ معطلی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطلی کا بھی ہو سکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطلی کی ہوگی اور نہ خود معطلی کی ملک رہے گی“ (فتاویٰ محمودیہ ۲۱۹/۱۰)۔

۲- مدارس کے سفراء عالمین کے حکم میں نہیں، جیسا کہ امداد الفتاویٰ (۵۸/۳) میں ہے، نیز صحت عقد کے لئے عمل اور اجرت دونوں کا متعین ہونا ضروری ہے، جبکہ کمیشن کے معاملہ میں دونوں مجہول ہیں، لہذا کمیشن پر چندہ کے لئے سفراء کو مقرر کرنا درست نہیں، حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب فرماتے ہیں:

”اس طرح معاملہ کرنا کہ جس قدر چندہ لاؤ گے اس میں سے نصف یا ثلث وغیرہ تم کو

ملے گا شرعاً درست نہیں، اس میں اجرت مجہول ہے، نیز اجرت ایسی چیز کفتر اردیا گیا ہے جو عمل اجیر سے حاصل ہونے والی ہے، کہ یہ دونوں چیزیں شرعاً مفسد اجارہ ہیں: ”وتفسد الإجارة بجهالة المسمى كله وبعضه ولو دفع غزلاً لأجر لينسجه بنصفه واستأجر بغلاً ليحمل له طعامه ببعضه الخ“ (درمختار فتاویٰ محمودیہ ۱/۵۲۳)۔

اور فتاویٰ محمودیہ میں دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”اس کو روپیہ ملنا ارباب اموال کے دینے پر موقوف ہے، کو یہاں اجارہ ایسے عمل پر ہے جو اجیر کے اختیار سے خارج ہے، اس کے اختیار میں لوگوں کے پاس جانا اور مدرسہ کی ضروریات بتا کر چندہ کی ترغیب دینا ہے، مگر اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں کے پاس جانا ہے، لہذا یہ منفعت بھی مجہول ہے اور اجرت ایسی چیز کفتر اردیا جائے گا، جو اجیر کے عمل سے حاصل ہوگی، وقت معاملہ وہ معدوم ہے، مستاجر کے پاس نہیں، اس کے تسلیم کرنے پر مستاجر کو قدرت نہیں، یہ بھی معلوم و متعین نہیں کہ کتنا چندہ سفیر کی ترغیب و محنت سے حاصل ہوگا، اس لئے اس کا نصف بھی معلوم و متعین نہیں، پس اجرت و ما جو دونوں مجہول ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑے وقت میں زیادہ روپیہ وصول ہو جائے اور سفیر زیادہ رقم کا مستحق قرار پائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ وقت اور محنت میں بھی تھوڑا روپیہ ملے یا بالکل نہ ملے اور سفیر تھوڑی رقم کا مستحق قرار پائے یا بالکل ہی محروم رہے، اس کا نتیجہ بھی معلوم نہیں ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۲۳۶)۔

زکوٰۃ سے تنخواہ حساب کتاب کے عملہ یا دیگر ملازمین کو دینا جائز نہیں۔

## زکوٰۃ سے متعلق عصر حاضر کے مسائل

مولانا عبدالقیوم ☆

ملک تام سے متعلقہ سوالات کے جوابات

۱- جس مال تجارت کی قیمت دے دی گئی ہے، لیکن مال پر ابھی قبضہ نہیں کیا ہے، اس میں پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ بائع پر جو اس کا مالک ہو گیا ہے اور قبضہ بھی کر لیا ہے، واجب ہے، اس لئے کہ وہ مملوک ملک وید ہے۔

اور وہ خریدہ ہو مال تجارت جس پر مشتری نے ابھی تک قبضہ نہیں کیا ہے صحیح قول کے مطابق مشتری پر قبضہ سے قبل اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور قبضہ کے بعد گزرے ہوئے سال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے (البحر الرائق ۲/۲۲۵)۔

۲- کرایہ کی مد میں دی ہوئی پیشگی رقم کا شرعاً مالک مکان مالک ہو جاتا ہے، لہذا اس نے کرایہ کی جو پیشگی رقم وصول کی ہے اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہے، اس لئے کہ اس کا قبضہ بھی ہو چکا ہے اور وہ مالک مکان اس پیشگی وصول کردہ رقم کا مالک ہو گیا ہے جیسا ”البحر الرائق“ (۲/۲۱۹)، ”فتاویٰ ہندیہ“ (۱۸۱/۱۸۲) کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

ڈپوزٹ کی رقم رہن ہے اور شئی مرہون کی زکوٰۃ نہ رہن پر ہوتی ہے نہ مرہون پر، لہذا

ڈپوزٹ کی رقم کی زکوٰۃ نہ موجر (مالک مکان یا دکان) پر واجب ہے اور نہ کرایہ دار پر واجب ہے:  
 ”ولا فی مرہون بعد قبضہ: آی لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا  
 علی الراهن لعدم اليد...“ (۹/۲۱۰)

۳- اداروں اور مدارس وغیرہ میں جمع ہونے والی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، صدقات واجبہ میں عدم وجوب ظاہر ہے، اس لئے کہ اگر خود معطلین کے پاس وہ رقم رہتی تو ان پر زکوٰۃ اس رقم کی واجب نہ ہوتی اور عطیات کی رقم معطلی کی ملک سے نکل جاتی ہے اور مدرسہ اور ادارہ کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے۔

۴- اگر وہ مال خالص حرام ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ اس کے مالک معلوم ہیں تب تو واجب ارد ہے اور اگر معلوم نہیں تو کل واجب التصدق ہے۔  
 اگر یہ حرام مال حلال مال میں مخلوط ہو (خواہ باہم تميز مشکل ہو یا نہ ہو) تو دیکھا جائے گا کہ اگر مال حرام کی مقدار اس میں سے نکالی جائے تو بقدر نصاب بچتا ہے یا نہیں، اگر بچتا ہے تو اس مقدار باقی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر نہیں بچتا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی (دیکھئے: البحر الرائق ۲/۲۱۱، امداد الفتاویٰ وغیرہ)۔

۵- امام صاحب کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں: قوی، متوسط، ضعیف۔  
 دین قوی وہ دین ہے جو کسی مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض میں کسی کے ذمہ واجب ہو، دین قوی میں زکوٰۃ دائن ہی کے ذمہ ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی، مگر ادائیگی لازم اس وقت ہوگی جب کہ بقدر چالیس درہم کے وصول ہو جائے۔

”فتجب زکاتها إذا تم نصاباً وحال الحول لکن لا فوراً بل عند قبض  
 أربعین درهما من المدین القوی كقرض وبدل ومال تجارة“ (الدر المختار علی  
 ۲/۲۱۷، ۲۸۸)۔



مدیون پر کسی حال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ اس مال کو تجارت میں لگا کر فائدہ اٹھا رہا ہو۔

”وسببہ ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد“ (نئی ۵/۲-۶)۔

جس دین قوی کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو، قبیل وصول دائن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کے بعد (اگر دوسرا مال زکوٰۃ موجود نہیں ہے) اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، دیکھئے: (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۲۱۲، ۸۵)۔

دین متوسط جو مال تجارت اور سونے چاندی کے علاوہ مال کا معاوضہ ہو، اور دین ضعیف جو مال کا معاوضہ نہ ہو، جیسے دین مہربا یا بالکل معاوضہ نہ ہو، جیسے حصہ میراث و وصیت، دین متوسط کا حکم امام صاحب سے صحیح الروایتین کے مطابق اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۲۱۲، ۳۹)۔

۶۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبل وصول زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور وصولیابی کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دین متوسط اور قوی میں داخل نہیں، اس لئے کہ یہ مال ہی کا بدل نہیں ہے، کیوں کہ یہ اجرت حُر کا جز ہے اور خدمت حرام نہیں، لہذا دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کی طرح اس میں بھی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد سال گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر اس کے پاس زکوٰۃ کا نصاب پہلے سے موجود نہیں ہے۔

## چوتھی شرط کے متعلق سوال کا جواب

۱- حکومت سے حاصل کردہ قرض طویل الاجل کی صورت میں وجوب زکوٰۃ کے لئے پورے قرض کو اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا، صرف سالانہ واجب الاداء قسط وضع نہیں کی جائے گی۔

”وفی الزیلعی أيضاً لا يتحقق الغنى بالمال المستقرض ما لم يقبض“  
(رد المحتار ۱۰/۲، طبع استنبول)۔

”ومنها أن لا يكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا فإن كان فإنه يمنع وجوب الزكاة بقدره حالا كان أو مؤجلاً (رد المحتار ۶/۲)۔

حکومت سے لئے ہوئے قرضوں کے بارے میں عبارت ”زاد القہستانی عن الجواهر والصحيح أنه (أى المؤجل) غير مانع“ (مٹائی: ۷/۲) سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ قرض میں شرعاً جیل صحیح نہیں ہے، لہذا شرعاً وہ مؤجل نہیں ہیں۔ (رد المحتار ۲۳۵/۲)۔

## کمپنی پر زکوٰۃ

تجارت مشترکہ اور کمپنی وغیرہ میں احناف کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے ہر حصہ دار کے اپنے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

”لا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة...“ (الدر المختار مع رد المحتار ۲۷۲)۔

## جوہرات کی زکوٰۃ

جو لوگ ہیرے جوہرات کی تجارت کرتے ہیں ان پر ان جوہرات وغیرہ کی زکوٰۃ یقیناً واجب ہے، لیکن جو لوگ سرمایہ محفوظ کرنے کے لئے ہیرے جوہرات خریدتے ہیں اور خریدتے

وقت تجارت کی نیت نہیں ہوتی ہے ان پر ان جوہرات کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح جو عورتیں تزئین و آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

”أما اليواقيت واللآلی والجواهر فلا زكاة فيها وإن كانت حلليا إلا أن تكون تجارة كما في الجوهرة“ (مائلیری ۱/۱۸۰)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

تاجر اگر تھوک سے فروخت کرتا ہے تو سامان تجارت کو زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن جس تھوک بھاؤ سے بیچا جا رہا ہے اس بھاؤ سے قیمت لگائے اور اگر تاجر پھنکر سے فروخت کرتا ہے تو پھنکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار کرے، الخاصل عموماً خریدار جس قیمت سے لیتا ہے وہ معتبر ہے۔ جو لوگ زمینوں کی تجارت کرتے ہیں وہ اراضی عشری یا خراجی ہیں تو ان پر عشر یا خراج واجب ہے، ان میں تجارت کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے (بدائع ۲/۵۷، رد المحتار ۲/۱۹)۔

### شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنیوں کے شیرز کی خرید اگر تجارت کی نیت سے ہی ہوئی ہے تو کمپنیوں کے یہ خاص حصص اموال تجارت ہونے کی وجہ سے ان کی پوری مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وجوب زکوٰۃ کے دن مارکیٹ کا جو بھاؤ ہوگا اس کا اعتبار ہوگا (تویر الا بصار مع رد المحتار ۲/۴۱، ۴۲)۔

اور اگر شیرز کی خرید تجارت کی نیت سے نہیں کی ہے تو وجوب زکوٰۃ کے دن کمپنی کے پاس ان شیرز کا جو حصہ تجارت میں لگا ہوا ہے اس حصہ اور نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ نفع اس کو پورا مل گیا ہو، خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ تجارت میں شامل ہو گیا ہو، اور جو حصہ عمارات و آلات میں لگا ہوا ہے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

”ولا في ثياب البدن ..... ونحوها“ (الدر) فی رد المحتار:

و کال حیوانیت و العقارات (۱۰/۲) وفی الدر: ”و کذلک آلات المحترفین“  
(الدر ۱۱/۲)۔

قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈز میں لگایا ہے ان بونڈز کے کیش کرانے کے وقت  
(یعنی اس رقم کے وصول ہونے کے بعد) اس سرمایہ میں سابقہ تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔  
”تجب زکاتها إذا تم نصاباً وحال الحول ..... عند قبض أربعین  
درهماً من المین القوی کقرض“ (الدر علی الثانی ۲/۳۷، ۳۸)۔

### محورثانی نصاب زکوٰۃ

کسی شخص کے پاس صرف سونا ہے تو وجوب زکوٰۃ کے لئے سونے کے نصاب کا اعتبار  
کیا جائے گا، مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور مال تجارت، چاندی، نقد روپے میں سے کوئی  
نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اگرچہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت کے  
بقدر یا اس سے چند گنا زیادہ ہو جاتی ہو (تفصیل کے لئے دیکھئے: بولع الصنائع ۲/۱۹، ۲۰، ۲۱)۔

ہاں اگر کسی کے پاس سونے کے علاوہ مال تجارت چاندی اور نقد روپے میں سے کوئی  
ہے اور ان کی مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی اس  
صورت میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا، اسی طرح صرف مال تجارت یا صرف روپے یا  
دونوں ہیں اور ان کی مالیت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ اور غناء کے مستحق ہونے کے لئے اگر کسی کے پاس  
صرف سونا ہے اور مال تجارت، روپے، چاندی اور ضرورت سے زائد کوئی چیز بھی نہیں ہے تو  
سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا، مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور اس کے پاس دوسری کوئی چیز  
ضرورت سے زائد مال تجارت چاندی اور روپے وغیرہ میں سے نہیں تو ایسے شخص کے لئے زکوٰۃ

لیما جائز ہے، حرام نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نصاب سے کم کا مالک ہے۔

لیکن اگر سونے کے علاوہ ان مذکورہ اشیاء میں سے کسی چیز کا مالک ہے تو اب چاندی کے نصاب کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اگر چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر پہنچ جاتی ہے ان کی قیمت تو وہ غنی ہے، اس کے لئے زکوٰۃ لیما جائز نہیں ہے، حاصل یہ ہے کہ حرمت زکوٰۃ کے لئے اگر اس کے پاس صرف سونا ہے تو سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا اور اگر سونا نہیں ہے یا ہے، لیکن دیگر مذکورہ اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا بھی وہ شخص مالک ہے تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۸۸، ۸۹)۔

### مصارف زکوٰۃ

- ۱- صورت مسئولہ میں بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ہر طالب علم سے شروع مہینہ میں معاملہ طے کر دیا جائے اور ختم ماہ پر اس کو ۲۵۰ روپے کا مالک بنا دیا جائے پھر مدرسہ میں وہ روپے جمع کر اے یا اس سے وصول کر لئے جائیں۔
- مہتمم مدرسہ معظیپین زکوٰۃ کا وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ طلبہ کا وکیل نہیں ہے۔
- ۲- مدرسہ کے سفراء اور چندہ حاصل کرنے والے العالمین علیہا (و اما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم الإمام لجباية الصدقات) (بدائع ۲/۳۳) میں داخل نہیں ہیں، نیز انھیں شرح فی صد متعین کمیشن پر سفیر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اجرت مجہول ہے۔
- اسی طرح حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

## زکوٰۃ سے جڑے ہوئے کچھ نئے مسائل

مولانا جعفر علی رحمانی ☆

ملک تام سے مراد

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال پر ملکیت و قبضہ دونوں ہوں، چنانچہ جس مال پر قبضہ و ملکیت نہ ہو یا ملکیت ہو لیکن قبضہ نہ ہو یا قبضہ ہو، لیکن ملکیت نہ ہو، ان تینوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

مثلاً مکاتب کے کمائے ہوئے مال پر زکوٰۃ فرض نہیں، کہ وہ قبضہ میں ہے، لیکن ملک میں نہیں ہے اور نہ ہی مولیٰ پر اس رقم کا ثبوت کی زکوٰۃ واجب ہے، کہ ملک حاصل ہے، لیکن قبضہ میں نہیں ہے (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۲، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۸۱)۔

۱- جو قیمت پیشگی ادا کر دی گئی اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی، کیونکہ وہ اس کی ملک اور قبضہ میں ہے اور اس مال کی زکوٰۃ جو اب تک وصول نہیں ہوا، نہ بائع پر واجب ہوگی کہ قبضہ ہے، لیکن ملکیت نہیں ہے اور نہ مشتری پر کہ ملک حاصل ہے، لیکن قبضہ نہیں ہے (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۲)۔

لیکن ”محیط السرحسی“ کے حوالہ سے ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ بیع قبل قبضہ نصاب ہوگی، اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

☆ مہدلت لایکاؤں۔

۲- مالک مکان زرضمانت و زیورات کے نام سے جو رقم وصول کرتا ہے اگر اس میں یہ شرط ہے کہ عقد اجارہ کے فسخ یا مدت اجارہ ختم ہو جانے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس کر دی جائے گی تو اس رقم کو رہن ماننے کی صورت میں نہ کرایہ دار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی مالک مکان پر، کیونکہ رہن کی ہوئی چیز کی زکوٰۃ نہ رہن پر واجب ہوتی ہے، کہ ملک میں ہے، لیکن قبضہ میں نہیں ہے اور نہ مرتہن پر واجب ہوتی ہے، کہ قبضہ میں ہے، لیکن ملک میں نہیں، جبکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ و ملک دونوں کا ہونا ضروری ہے (رد المحتار ۹/۲، الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۳۲)۔

۳- مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم و اموال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے مال زکوٰۃ پر ملک حاصل ہونا شرط ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، جیسا کہ الدر المختار اور رد المحتار کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

”و سببہ ای سبب افتراضها ملک نصاب حولی“ (در مختار) ”قولہ ملک نصاب فلا زکوٰۃ فی سوانم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك“ (الدر المختار و رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ۹/۲، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۵۱)۔

۴- جب کل مال حرام ہی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ پورے مال کا تصدق لازم ہے (رد المحتار ۲/۳۳، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۷۷)۔

۵- اگر مال حرام اپنے مال حلال میں اس طرح گڈمڈ اور مخلوط ہو گیا کہ ان کا الگ کرنا مشکل ہو تو امام صاحب کا مذہب یہ ہے کہ کل مال کی زکوٰۃ واجب ہے، بشرطیکہ مال حلال اس قدر ہو کہ اس مال حرام کا معاوضہ ان لوگوں کو جن سے لیا یا ان کے ورثہ کو دے سکے یا ادا کر کے بقدر نصاب مال باقی رہے (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۳۳، امداد الفتاویٰ ۲/۲۱)۔

۶- فقہائے کرام نے دین کی وصولیابی کی امید و ناامیدی کے اعتبار سے تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱- دین قوی: نقد روپے قرض دیئے یا سامان بیچا اور قیمت باقی رہ گئی تو اس رقم پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب اس کو واپس مل جائے، اب ملنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف- یا یہ کہ کئی برس بعد یہ رقم اکٹھا وصول ہو جائے تو اس صورت میں ان تمام برسوں کی زکوٰۃ دینی واجب ہوگی جتنے برس یہ رقم مقرض کے پاس رہی (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۵)۔

ب- یہ کہ یہ رقم تھوڑی تھوڑی وصول ہو، جتنی رقم وصول ہوتی جائے اتنی کی زکوٰۃ ادا کرتا جائے، مثلاً ۵ روپے نصاب زکوٰۃ ہو اور اتنی ہی رقم مدیون پر ہے یا اس سے زیادہ ہے، اب مدیون سے اگر ۱۵ روپے ملتے ہیں تو اس کی ایک روپیہ زکوٰۃ ادا کر دے، البتہ مدیون سے ملنے والی رقم نصاب زکوٰۃ ۱/۵ سے بھی کم وصول ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۵، نور الایضاح ۱/۱۵۷)۔

۲- دین متوسطہ: ایسی چیز کا دام باقی ہو جس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، مثلاً دکان و مکان کا فرنیچر، پہننے اور اوڑھنے کے کپڑے، سواری کے گھوڑے، کھیتی باڑی میں کام کرنے کے آلات بیچ دیا اور اس کی قیمت باقی ہے، اگر یہ رقم اتنی ہے کہ نصابین میں سے کسی ایک کی قیمت کو پہنچتی ہیں اور ایک ساتھ اتنی مقدار میں وصول بھی ہو جائے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو جتنے سال یہ رقم مدیون کے پاس رہی ان تمام سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا واجب ہے (ماہقہ حوالے)۔

۳- دین ضعیف: اس چیز کا بدل ہے جو مال تجارت نہیں ہے، جیسے مہر و وصیت، بدل خلع، بدل کتابت وغیرہ، اس دین پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہے جب کہ بقدر نصاب پر قابض ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے۔

واضح رہے کہ گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ اس دین میں واجب نہ ہوگی (الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۵)۔

۷- مدیون اگر چہ مال دار ہو اور دین کی رقم کو اپنے کاروبار میں استعمال کر رہا ہو،



ادائیگی دین میں نال منول کر رہا ہو، اس پر دین کی رقم کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے کہ ادائیگی زکوٰۃ کی صحت موقوف ہے تملیک مستحق پر، اور تملیک وہی متصور ہوتی ہے جہاں ملک ہو، جب کہ مدیون کے پاس جو رقم ہے اس پر اس کا قبضہ تو ہے لیکن وہ اس کا مالک نہیں ہے (بدرائع الصنائع ۹/۲، الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۲)۔

۸- سرکاری محکموں اور مختلف ذاتی کمپنیوں میں ملازمین کی ماہانہ یافت سے جو رقم پر اوپینٹ فنڈ کے نام سے ان کے کھاتوں میں جمع ہوتی ہے اس جمع شدہ رقم پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک وہ وصول نہ ہو اور وصول ہونے کے بعد بھی سال گزرے اس وقت واجب الادا ہوگی، اور صرف اسی زمانہ کی جو وصول رقم کے بعد سے اس پر گزرے گا، کیونکہ یہ روپیہ ابھی تک اس شخص کے قبضہ میں نہیں آیا اور اس کا اگرچہ ایک حصہ بدل عمل ہے مگر زیادہ حصہ کا اس کا محض عطیہ ہے، یہ دین ضعیف ہے اور اس کا یہی حکم ہے (فتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۵، کفایۃ المفتی ۲/۲۸۸)۔

### نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

نامی کہتے ہیں اس مال کو جو بڑھنے والا ہو، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱- نما حقیقی: جیسے تجارت کا مال یا مویشی۔

۲- نما تقدیری: جیسے سونا چاندی کہ اسے ہر حال میں بڑھنے والا قرار دیا گیا ہے، خواہ اس کو کاروبار میں لگا کر بڑھایا گیا ہو یا زمین میں دفن کر کے محدود کر دیا گیا ہو، تقدیر نامی کا یہی مطلب ہے کہ اسے بڑھنے والا قرار دیا گیا ہے، خواہ درحقیقت اضافہ ہو یا نہ ہو (فتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۲، بدرائع الصنائع ۱۱/۲)۔

ضروریات انسانی و طرح کی ہوتی ہیں:

۱- وہ حاجت جو بنیادی و ضروری ہوتی ہے۔

۲- وہ حاجت جو غیر بنیادی اور کم اہم ہوتی ہے۔

● حاجتِ اصلیہ سے مراد وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جن پر آدمی کی حیات اور عزت و آبرو کا دار و مدار ہوتا ہے، جیسے کھانا، پینا، لباس، رہنے کا مکان پیشہ ور آدمی کے اوزار اور مشین وغیرہ، سواری کا گھوڑا، سائیکل، موٹر وغیرہ، گھر دار کا سامان، کتابیں جو مطالعہ کے لئے ہوں، کاروبار کی غرض سے نہ ہوں، حاجتِ اصلیہ میں سے ہے، اسی طرح علاج کے لئے یا کسی کا گھر بارش میں گر گیا اور اس نے بنوانے یا مرمت کرنے کے لئے یا مکان تنگ ہے اس کی توسیع کے لئے جو رقم رکھی ہے وہ اس کی حاجتِ اصلیہ میں مشغول ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، صاحب درمختار کے اس جملہ ”وفارغ عن حاجتہ الأصلیة“ کی تشریح علامہ شامی نے یہی کی ہے۔

● دوسری وہ حاجتیں جو غیر بنیادی یا کم اہم ہوں مثلاً شادی بیاہ، ختنہ، عقیقہ یا اور کوئی تقریب کے لئے جو رقم رکھی ہے اور وہ اس قدر ہے کہ نصابین میں سے کسی ایک کی قیمت کو پہنچتی ہے تو اس پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ ضرورتیں ضروریاتِ اصلیہ میں سے نہیں ہیں۔ (اسلامی فقہ ۱۳۵، الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۵۸۳، البدائع المصابیح ۱۱/۲)۔

انسانی زندگی کی بقاء اور اس کی آبرو و عزت کا تحفظ جن اشیاء کا متقاضی ہے وہ تمام ہی اشیاء اس کی حاجتِ اصلیہ میں شمار ہوں گی اور ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اب یہ چیزیں ہر دور اور ماحول کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہیں، لہذا ہر دور اور ماحول کے اعتبار سے ان اشیاء کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟

دین کی دو قسمیں ہیں:

۱- وہ دین جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو۔

۲۔ جس کا مطالبہ اللہ کی طرف سے ہو۔

مثال قسم اول: زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ یہ حق اللہ ہیں، مگر ان کا مطالبہ امام وقت کی طرف سے ہو سکتا ہے، یا و قرض بندوں کا ہو، جیسے ثمن، اجرت، ضمان متلفات وغیرہ۔

مثال قسم ثانی: نذور، کفارات، حج۔ دین کی پہلی قسم مانع زکوٰۃ ہے، دوسری قسم مانع

زکوٰۃ نہیں ہے (خلاصۃ الفتاویٰ ۲/۲۳۰، الفتاویٰ الہندیہ ۱/۷۳، علم الفقہ ۲/۲۳۰)۔

۱۔ اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا، بعدہ اگر اموال زکوٰۃ بقدر

نصاب باقی رہتے ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۹، الفتاویٰ

الہندیہ ۲/۱۲۳، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۳۰)۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے لئے کمپنی میں شریک ہر فرد کے انفرادی حصے کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر

کمپنی کی مجموعی مالیت اس کے تمام شرکاء پر تقسیم کی جائے تو ہر فرد کے حصہ میں بقدر نصاب مالیت

آتی ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ جن کے حصہ میں بقدر نصاب مالیت آتی ہو ان پر زکوٰۃ واجب

ہوگی اور جن کے حصہ میں نہیں آتی ان پر واجب نہ ہوگی (فتاویٰ دارالعلوم ۶/۷۰، اسی طرح فقہ کی دوسری

کتابوں میں ہے)۔

### ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لئے نہیں ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(کتاب الاسوال ۲۸۵)۔

ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لئے جو رقم ہیرے جواہرات کی شکل میں محفوظ کر لی جاتی

ہے، اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک کہ یہ ہیرے جواہرات اس مال میں تبدیل نہ ہو

جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

اسی طرح جو جوہرات عورت تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۳/۱۸، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۳۰، ۱۳۳)۔

### اموال تجارت پر زکوٰۃ

۱- اموال تجارت کی زکوٰۃ اس حساب سے دی جائے گی جو قیمت ان اموال کی زکوٰۃ کے ادا کرنے کے دن بازار میں ہوگی۔

”وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الأداء إجماعاً وهو الأصح ويقوم في البلد الذي المال فيه“ (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۶۱)۔

رہا یہ مسئلہ کہ تھوک بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا چھٹکر کا، تو اس بارے میں احقر کا خیال یہ ہے کہ صاحب مال دیکھے کہ یہ مال اس کے پاس زیادہ تر تھوک جاتا ہے یا چھٹکر اور اسی حساب سے وہ قیمت کا اعتبار کرے، یعنی تھوک بھاؤ میں جاتا ہے تو تھوک بھاؤ کا اعتبار کرے اور اگر چھٹکر جاتا ہے تو چھٹکر بھاؤ کا۔

۲- جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں سال پورا ہونے پر نقد روپے کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں بغرض تجارت ہے وہ بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ قیمت خرید کے اعتبار سے ہوگا اور نہ ہی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگا، بلکہ اس قسم کی زمین کی جو قیمت ادائے زکوٰۃ کے دن ہوگی اسی کا اعتبار ہوگا (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۶۱)۔

### شیئرز پر زکوٰۃ کا مسئلہ

شیئرز میں جو رقم دی جاتی ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱- ایسی کمپنی کے شیئرز خریدے ہوئے ہیں جو تجارت کرتی ہے، مثلاً وہ کمپنی جس میں گھڑی، جوتا، قلم وغیرہ بنا کر بیچا جاتا ہے، اس صورت میں شیئرز کی اصل قیمت اور کمپنی سے جو نفع ہر شیئرز ہولڈر کو ملتا ہے دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے (امداد الفتاویٰ ۲/۲۰، کلمتہ المفتی ۳/۲۳۳)۔  
یہ بھی واضح رہے کہ ادائے زکوٰۃ کے دن مارکیٹ میں شیئرز کی جو قیمت ہوگی وہی زکوٰۃ کے لئے اسی کا اعتبار ہوگا۔

۲- ایسی کمپنی کے شیئرز خریدے ہوئے ہیں جو تجارت نہیں کرتی ہے بلکہ صرف کرایہ وصول کرتی ہے، جیسے کارخانے، دکانیں بنا کر کرائے پر دیے جاتے ہوں، اس صورت میں شیئرز کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ اس سے حاصل شدہ منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی (کلمتہ المفتی ۳/۲۳۲، فتاویٰ رحمیہ ۲/۱۳، کلمتہ المفتی ۳/۲۳۳)۔

۳- بونڈز پر جو سرمایہ لگایا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ بھی واجب الاداء ہے، لیکن اس وقت جب کہ بونڈز کیش کرائے جائیں، یہ بھی ملحوظ رہے کہ تمام ہی گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”ولو كان الدين على مقر الخ فوصل إلى ملكه لزم زكوة ما مضى“  
(الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۶/۱۲، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۳)۔

### نصاب زکوٰۃ کا مسئلہ

نصاب حرمت زکوٰۃ ووجوب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار نصاب چاندی سے مقرر کی جائے تو یہ نفع للمفقر اور احواط غیر ہم ہے، نفع للمفقر اس طرح کہ جس کے پاس بھی نصاب چاندی کی مقدار میں مال ہوگا وہ زکوٰۃ نکالے گا، جس میں فقراء کا فائدہ ہے اور احواط غیر ہم اس طرح کہ جس کے پاس بھی نصاب چاندی کی مقدار میں مال ہوگا وہ زکوٰۃ نہیں لے گا، بلکہ زکوٰۃ ادا کرے گا، اور یہ دونوں باتیں اس کے حق میں اچھی ہیں، اور نصاب چاندی کو نصاب حرمت

زکوٰۃ واجب زکوٰۃ تسلیم کرنے میں کوئی شرعی قباحت بھی نظر نہیں آتی ہے۔

### مصارف زکوٰۃ کا مسئلہ

۱- سول میں تملیک مستحق کی جو دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں، ان دونوں میں تملیک صحیح نہیں ہو پاتی، پہلی صورت میں اس واسطے نہیں کہ طالب علم کا قبضہ ہی مال پر نہیں ہوتا ہے، دوسری میں بھی چونکہ طالب علم کو چیک کا مالک بنا دینے سے اصل مال کا مالک وہ نہیں بنتا کہ اس چیک کے ذریعہ اصل مال حاصل نہ ہو (کیونکہ چیک اصل مال نہیں ہے)۔

اس لئے حیلہ تملیک صحیح ہونے کے لئے اہل مدرسہ کو چاہیے کہ وہ طالب علم (جو غیر مستطیع ہے) کو اصل مال کا مالک بنا دیں، بعد ازاں وہ اپنے رہنے، کھانے، تعلیم کی فیس میں اسے مدرسہ میں جمع کرا دیں۔

۲- مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ظلیل احمد صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ان تینوں بزرگوں نے مہتمم مدرسہ کو فقراء کا وکیل قرار دیا ہے اور انھیں زکوٰۃ کا مال ادا کرنے سے معظیین زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا ہو جانے کا فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ جوہر الفقہ (۳۸۲/۳) سے معلوم ہوتا ہے، اور ان بزرگان دین کی بات معظیین زکوٰۃ و مہتمم مدرسہ دونوں کے حق میں مفید معلوم ہوتی ہے، معظیین کے حق میں اس طرح کہ ان لوگوں کی زکوٰۃ مہتمم مدرسہ اور اس کے سفراء کو دے دینے سے اداء ہو جائے گی اور مہتمم مدرسہ کے حق میں اس طرح کہ اگر کوئی معظی زکوٰۃ انتقال کر گیا اور اس کی رقم ابھی تک مصرف زکوٰۃ میں مہتمم مدرسہ نے خرچ نہیں کی تو اس کے ورثاء کو واپس کرنا نہیں پڑے گی۔

احقر بھی ان اکابر کی رائے سے متفق ہے اور مہتمم مدرسہ کو فقراء کا وکیل قرار دیتا ہے۔

۳- کمیشن پر چندہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ کمیشن میں یہ ہوتا ہے کہ سفیر سے کہا جاتا ہے تم جس قدر چندہ کر کے لاؤ گے اس میں سے نصف یا ثلث تم کو ملے گا، گویا اجرت کو مجہول رکھا

جاتا ہے اور یہ مفسد اجارہ ہے (الدر المختار)۔

نیز یہی رائے مفتی محمود الحسن صاحب کی ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱/ ۵۲۳)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری کی بھی یہی رائے ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/ ۲)۔

۴۔ مصلیٰ زکوٰۃ کو مولانا مفتی رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی شفیع صاحب نے عاملین کے حکم میں داخل کر دیا ہے، اسی طرح کنایت المفتی کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مفتی کنایت اللہ صاحب نے مصلیٰ زکوٰۃ (جو مدارس میں بہ تنخواہ مقرر ہوتے ہیں) کو عاملین کے حکم میں داخل کیا، اور انھیں زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا جائز قرار دیا، البتہ اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ ان کی تنخواہ حاصل شدہ زکوٰۃ کی نصف رقم سے زیادہ نہ ہو (کتاب الاسوال ۱/ ۵۳۶)۔

۵۔ حساب آمد و خرچ پر جو عملہ مقرر ہوتا ہے ان کی تنخواہ زکوٰۃ کی مد سے اس طرح دی جاسکتی ہے کہ ان کے مہینے بھر کے کام کا اوسط نکالا جائے، جتنا کام انھوں نے زکوٰۃ کے حساب کتاب کا کیا انھیں اس کی اجرت زکوٰۃ کی مد سے دی جائے اور دیگر جو کام کیا اس کی اجرت مد زکوٰۃ سے نہ دی جائے، مثلاً ایک آدمی زکوٰۃ کے شعبہ محاسبی میں کام کرتا ہے اس کی ایک ہزار روپے تنخواہ ہے، اس کے پورے مہینے کے کام کا اوسط نکالا گیا تو پندرہ روزہ نکلے جس میں زکوٰۃ کی رقم سے متعلق کام ہوا، اور دیگر پندرہ روزہ دوسری قومات کے حساب وغیرہ میں، تو اس آدمی کو مدرسہ کا ذمہ دار یا مہتمم صرف پندرہ روز کی تنخواہ زکوٰۃ کی رقم سے دے، دیگر پندرہ روز کی تنخواہ کا انتظام دوسری مدوں سے کریں۔

## مسائل زکوٰۃ

مولانا مفتی عبداللہ خالد ☆

### شرط اول، ملک تام

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شرعی طور پر وہ شخص اس کا مالک بھی ہو اور وہ شئی اس کے قبضہ میں بھی ہو، فقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے شرعی ملکیت اور قبضہ دونوں ہی ضروری ہیں، اگر ملکیت شرعی طور پر موجود ہو، لیکن قبضہ میں نہیں ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے گم شدہ مال یا دریا میں گر جانے والا مال، اسی طرح اگر قبضہ میں تو موجود ہے لیکن شرعاً وہ چیز قابض کی ملکیت میں نہیں ہے تو اس صورت میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً غلام یا مکاتب کے مال میں غلام اور مکاتب پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔  
”در مختار“ میں ہے:

”وسببہ ای سبب افتراضها ملک نصاب حولی تام بالرفع صفة  
ملک خرج مال المكاتب“  
”شامی“ میں ہے:

”(خرج مال المكاتب) ای خرج بالتقييد به؛ لأن المراد بالتام  
المملوك رقبةً ویدماً“ (رد المحتار ۴/۳۰۳)۔



شرح و تالیہ میں ہے: ”مملو کاً تاماً“ اور اس کی شرح میں چلپی میں لکھا ہے: ”آی رقبۃ ویداً۔“

۱- مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کی جا چکی ہے اور بائع جس پر قابض و متصرف ہے تو اعدائے قبضہ کی رو سے بائع پر تو اس قبضہ کی ہوئی قیمت پر بشرط نصاب حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن مشتری (جس کا ثمن پر قبضہ و ملک کچھ بھی نہیں اور مال پر ملکیت تو ثابت ہے لیکن قبضہ نہیں) پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چونکہ ملک تام کی شرط پائی نہیں جارہی ہے، البتہ قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی واجب ہونی چاہئے، چونکہ یہ بھی دین ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس دین ضعیف کی تعریف میں نہیں آتا جس میں سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ لازم نہیں، اگرچہ علامہ شامی نے ”خانیہ“ کے حوالہ سے سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ کا عدم وجوب بھی نقل کیا ہے (الدر المختار ورد المحتار ۵/۲، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے فتح القدیر ۱/۲۹۹، رسائل الارکان ۱۶۳، فتاویٰ تافہی خاں ۱۸۶/۲)۔

۲- کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ کے فسخ یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کر دی جاتی ہے، یہ رقم دراصل ماہ بہ ماہ کرایہ کی ادائیگی یا عقد اجارہ کے پورا ہو جانے پر مکان و دکان کے خالی کر دیے جانے کے سلسلہ میں اطمینان کی ضمانت ہے اور یہ صورت رہن کی ہے، گویا یہ پیشگی رقم بہ طور رہن مالک کے پاس رکھی گئی ہے اور روپیوں کا بہ طور رہن رکھنا جائز بھی ہے۔

”ویجوز رهن الدراهم والدنانیر“ (فتاویٰ الہندیہ)۔

مال مرہونہ پر زکوٰۃ نہ تو راہن پر واجب ہے اور نہ ہی مرہن پر، کیونکہ راہن کا اس روپے پر قبضہ اور تصرف نہیں ہے، نیز راہن اس مدت اجارہ کے ختم ہونے سے قبل اس رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا، اس لئے گویا یہ ایسے دین کی طرح ہو گیا جس کا مدیون منکر ہو۔

”لأنه مشغول بالدين ولا تجب على المشتري والمستاجر أيضا؛ لأنه وإن اعتبر ديناً للمستاجر فليس بمنفعة في حقه؛ لأنه لا يمكنه المطالبة قبل

فسخ الإجارة فلا يملكه حقيقة فكان هذا بمنزلة الأبق على الحاجة أو فوقه  
 وشمه لا تجب الزكوة ما لم يحل الحول بعد القبض“ (نآوی قاضی خان ۱۸۲۲)۔  
 مرتہن پر اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کہ مرتہن کی ملکیت اس پر ثابت نہیں ہے، بلکہ  
 وصولی کے بعد بھی راہن پر رائج قول کے مطابق گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی  
 (دیکھئے: رد المحتار ۷/۲)۔

البتہ یہ بحث الگ ہے کہ مذکورہ صورت میں جب کہ اس کو رہن مانا جائے مالک مکان  
 کو اس روپے سے نفع حاصل کرنا درست ہوگا یا نہیں، لیکن یہ محل اس بحث کا نہیں ہے۔  
 ۳۔ جس مال کا کوئی معین مالک نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، شامی میں لکھا ہے:  
 ”فلا زكاة في سوانم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك“ (رد المحتار  
 ۲/۲)۔

البتہ یہاں پر ایک بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ فی زمانہ مدارس و دیگر اداروں کے مہتمم  
 و ناظم یا ذمہ داران زکوٰۃ دہندہ کے وکیل ہیں یا مستحقین زکوٰۃ کے، یہ سوال محور ثانی کے نمبر ایک  
 میں آیا بھی ہے، مذکورہ سوال کے جواب کا تعلق بھی چونکہ اس سے ہے، اس لئے اجمالاً اس پر بحث  
 کی جاتی ہے۔

مسلمان امیر یا غیر اسلامی ممالک کے وہ امیر جن کو مسلمانوں کے اہل حل و عقد افراد  
 نے اپنا امیر منتخب کر لیا ہو تو بلاشبہ مستحقین زکوٰۃ کے وکیل ہیں، لہذا جو ہی زکوٰۃ دہندہ نے ان کو یا  
 ان کے مقرر کردہ عاملین کو زکوٰۃ دے دیا وہ مال زکوٰۃ دہندہ کی ملک سے نکل گیا اور زکوٰۃ ادا ہوگئی۔  
 لیکن ان مدرسوں اور اداروں کے ذمہ داران بظہر مستحقین زکوٰۃ کے وکیل نہیں ہیں، اس لئے  
 جب تک ذمہ داران مدارس زکوٰۃ کو اس کے مصرف میں خرچ نہ کر دیں زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں  
 ہوگی، مولانا اشرف علی تھانوی کی تصریح کے مطابق وہ مال زکوٰۃ دہندہ کی ملکیت ہے، یہاں تک  
 کہ حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ اس پر حوالان حول کے بعد زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور مرنے کے

بعد وراثت بھی جاری ہوگی (اعلم والعلماء)۔

اسی رائے کا اظہار مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ”معارف القرآن“ میں بھی کیا ہے، اس رائے کے مطابق اگر زکوٰۃ وعطیہ دہندگان کا دیا ہوا مال بقدر نصاب ہے اور نہ تو اس کی تملیک ہوئی ہے اور نہ ہی وہ مصرف پر خرچ ہوا ہے تو حولان حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے، دیکھئے: (شرح الوفاق مع علیہ ۶۸، تاوی ہندیہ ۱/۲۶۸)۔

۴- خالص حرام مال میں زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ وہ سب کا سب واجب التصدق ہے: ”(كما لو كان الكل خبيثاً) في القنية لو كان الخبيث نصاباً لا يلزمه الزكاة؛ لأن الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد إيجاب التصدق ببعضه“ (رد المحتار ۲/۲۵)۔

مال حرام اگر مال حائل کے ساتھ مخلوط ہو گئے ہوں تو امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق جس کو صاحب درمختار نے ارفق قرار دیا ہے زکوٰۃ واجب ہوگی، پوری تفصیل کے لئے دیکھئے: (الدر المختار و رد المحتار ۲/۲۵، فتح القدير ۲/۲۹۹)۔

۵- دین کی زکوٰۃ مدیون پر واجب نہیں ہوگی، چونکہ مدیون کے ذمہ اتنا مال دائن کو دینا واجب اور ضروری ہے اور مدیون اگر چہ وقتی طور پر اس سے مستفید ہو رہا ہے، لیکن یہ مدیون کی ملکیت میں نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک تام شرط ہے:

”ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه، وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصاباً“ (بداية ۱/۱۶۶، نیز دیکھئے: الدر المختار ۲/۵، تاوی ہندیہ ۱/۲۳۳، الاشباه ۲۲۶)۔

البتہ دائن پر اس مال کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ بہر صورت فی الحال تو دائن پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ وصولی کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اور اگر واجب ہوگی تو وصولی کے بعد سنہین ماضیہ کی بھی واجب ہوگی یا نہیں، تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ دین کی امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو کہ مفتی بقول بھی ہے تین قسمیں ہیں:

۱- دین ضعیف: یعنی ایسی رقم یا شئی جو کسی ایسی چیز کے بدلہ میں باقی ہو جو از قبیل مال نہ ہو، جیسے مہر کی رقم یا بدل خلع کی رقم، اس دین پر دائن کے ذمہ اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، جبکہ مال پر قبضہ بھی ہو جائے اور قبضہ کے بعد اس پر سال بھی گزر جائے۔

۲- دین وسط: یعنی ایسی رقم جو کسی ایسی چیز کے بدلہ میں باقی ہو جو از قبیل مال تو ہو لیکن وہ مال از قبیل تجارت نہ ہو، اس دین پر دائن کے ذمہ اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، جبکہ بقدر نصاب رقم وصول ہو، اگر تھوڑی رقم جو کہ نصاب کی مقدار سے کم ہے، وصول ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ جب بقدر نصاب رقم وصول ہوگی تو اس رقم پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دائن کے ذمہ واجب ہوگی۔

۳- دین قوی: یعنی ایسی رقم جو کسی کے ذمہ کسی ایسی چیز کے بدلہ میں واجب ہو جو مال تجارت ہے اس دین پر دائن کے ذمہ اسی وقت زکوٰۃ لازم ہوگی، جبکہ اس کی وصولی کم از کم نصاب زکوٰۃ کا ۱/۵ ہو، اگر نصاب کا پانچواں حصہ یا اس سے زیادہ کی وصولی ہوئی تو اس پر اسی حساب سے دائن کے ذمہ سالہائے گزشتہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، ان دونوں قسموں یعنی دین وسط اور دین قوی میں وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ کے بعد حوالان حول ضروری نہیں (فتاویٰ ہندیہ ۲۳۶/۱، رسائل الارکان ۱/۶۶، ۱۶۵، فتح القدر ۱/۳۰۶، فتاویٰ قاضی خاں ۱/۱۸۱، خلاصۃ الفتاویٰ ۱/۲۳۸، درمختار ۳/۳۵)۔

اگر مدیون قدرت کے باوجود مال منول کر رہا ہو اور اس دین سے مستفید ہو رہا ہو تو اس دین پر مدیون کے ذمہ زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاسکتی، چونکہ بہر حال یہ رقم اس کی نہیں اور اتنا مال اس کو مدیون کے حوالہ کرنا ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ علامہ شامی نے ایک جزئیہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک ہزار روپے کسی سے قرض لئے اور دس آدمیوں نے اس کی کفالت لے لی اور ان سے ہر ایک کے پاس ہزار روپے موجود ہوں تو ان کفالت لینے والوں میں سے کسی پر بھی

زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، حالانکہ کفیل کے پاس اس قرض کی ادائیگی کے لئے رقم موجود ہے اور وہ کفالت کے باوجود انہیں ادائیں کر رہا ہے پھر بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اور فقہاء نے یہ تصریح کی ہے کہ اصل مدیون اور مدیون کا کفیل دونوں وجوب زکوٰۃ کے حکم میں برابر ہیں:

”ولا فرق بین کون الدین بطریق الإصالة أو الكفالة حتی لا تجب

عليهم الزکوٰۃ“

علامہ شامی نے درمختار کے قول ”ولو کفالة“ کے تحت جزئیہ اس طرح نقل کیا ہے:

وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی دو قسمیں ہیں:

۱- وہ دین جس کی وصولی کی امید نہ ہو، مثلاً وہ دین جس کا مدیون منکر ہو اور اُن کے پاس کوئی گواہ موجود نہ ہو، ایسی دین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر اس طرح کا دین خلاف امید واپس مل جائے تو حوالان حوال کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، فقہاء نے اس قسم کے دین کو مال ضماریں شمار کیا ہے۔

”أی نصاب حولی فارغ عن المدين ولا زكاة فيه مثل المهر قبل القبض

أو مال الضمان“ (الاشباہ ۲۸۲)، نیز دیکھئے: حموی ۶۸۲، الدر المختار، ہدایہ وغیرہ۔

۲- وہ دین جس کے وصولی کی امید ہو، اس قسم کے دین کی تین قسمیں ہیں: ضعیف،

وسط قوی، ان کے احکام اوپر گزر چکے۔

۶- مذکورہ صورت میں اگرچہ ملازم اس وضع کردہ رقم کا مستحق ہے، لیکن اہمیت پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ملکیت میں نہیں آیا، نہ ہی قبضہ میں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک تام ضروری ہے، نیز اس صورت میں یہ مال نامی بھی نہ رہا، چونکہ اس میں ملازم کو کلی طور پر تصرف کا حق نہیں ہوتا اور بغیر حق تصرف کے مال میں نما کا تحقق نہیں ہو سکتا، چونکہ وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط ہے:

”و سببہ ..... ملک نصاب حولی ..... تام“ (الدر المختار ۵/۲۲۲)۔  
اس لئے قبضہ سے قبل اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ملازم کی یہ رقم ان اداروں پر دین ہے اور بظاہر یہ دین ضعیف کی تعریف میں آتا ہے اور دین ضعیف میں دائن کے ذمہ اس رقم کی وصولی اور حولان حول کے بعد ہی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس لئے پی۔ ایف کی رقم پر وصولی کے بعد جب سال گزر جائے تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

### شرط دوم نما

نما کے معنی بڑھوتری کے ہیں، خواہ وہ بڑھوتری حقیقت میں موجود ہو، مثلاً تجارت کہ اس میں حقیقت میں مال بڑھتا ہے جو ہر شخص کو نظر آتا ہے یا حقیقت میں بڑھوتری نہ ہو، لیکن اس میں بڑھوتری کی صلاحیت موجود ہو، اس میں فقہاء نے صرف نقدین کو داخل کیا ہے، پھر نما حقیقی اور تقدیری دونوں کی دو صورتیں ہیں:

۱- خلقی: اور وہ سونے چاندی میں ہے۔

۲- فعلی نما فعلی تجارت کی وجہ سے ہوتا ہے، درمختار میں ہے: ”نام ولو تقدیراً“ اسی کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے۔

”وفی الشرع هو نوعان: حقیقی و تقدیری فالحقیقی الزیادة للتوالد و التناسل و التجارة، و التقدیری تمکنه من الزیادة بكون المال فی یدہ أو نائبہ“  
(شامی ۹/۲، نیز دیکھئے فتح القدر ۱/۲۹۸، فتاویٰ ہندیہ ۲/۲۳۳)۔

### شرط سوم، حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ میں وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو حقیقی بلاکت یا تقدیری بلاکت سے

محفوظ رکھ سکے، حقیقی ہلاکت جیسے نفقہ، سکونت کے لئے مکان، سردی و گرمی سے حفاظت کے کپڑے، خدمت کے لئے خادم و غلام اور سواری وغیرہ اور تقدیری ہلاکت قرض کی ادائیگی یا اہل علم کے لئے کتابیں وغیرہ (ردالمحتار ۸/۲۲۸)۔

حاجت اصلیہ دور، زمانہ اور ماحول، سماج نیز ہر انسان کے اپنے حالات کی بنا پر مختلف ہو سکتی ہے، حاجات اصلیہ میں سواری، آلات حرب، سکونت کے لئے مکان اور نفقہ وغیرہ داخل ہیں، ظاہر ہے کہ زمانہ قدیم میں سواریوں میں اونٹ و گھوڑے وغیرہ استعمال ہوا کرتے تھے اور اب اسکوٹر، موٹر سائیکل، کار وغیرہ استعمال ہوا کرتے ہیں، اس طرح زمانہ قدیم میں آلات حرفت کچھ اور تھا اور اب کچھ اور، زمانہ قدیم میں نان و نفقہ کا معیار کچھ اور تھا اور اب کچھ اور ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں بعض اشیاء کو حاجت اصلیہ میں شمار نہ کیا جاتا ہو، لیکن اس دور میں حاجت اصلیہ میں داخل ہوں، اور حالات و زمانہ، نیز عرف و عادات شرعاً خود ایک دلیل ہے۔

### شرط چہارم دین سے محفوظ ہونا

دین خواہ طویل الاجل ہو یا قلیل الاجل دونوں مانع زکوٰۃ ہونے میں برابر ہیں، دین بہر حال مدیون کے ذمہ ادا کرنا لازم ہے، خواہ دائن کی جانب سے اس کو کم مدت کی مہلت دی گئی ہو یا زیادہ کی۔

”ومنها الفراغ عن الدين“ (فتاویٰ ہندیہ ۲۳۲/۱، ہدایہ ۱/۱۶۶)۔

البتہ مذکورہ بالا صورتوں میں اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے یا واجب الادا ضبط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی، اس صورت میں ظاہر ہے کہ جب مثلاً ایک لاکھ روپے قرض لیا گیا ہے اور سالانہ دس ہزار روپے ادا کرنا ہے تو جو ضبط ادا کر دی گئی ہے اموال زکوٰۃ سے اتنی رقم وضع کر کے ہی قرض کو منہا کیا جائے گا، باقی واجب الادا قسطیں جو جمع نہیں کی جاسکی ہیں وہ چونکہ مدیون کے ذمہ بہر حال دین ہے، اس لئے ان واجب الاداء

قسطوں کو جو ادائیں کی جاسکی ہیں اس سے وضع نہیں کیا جائے گا، بلکہ پورے دین کو جو واجب الادا قسطیں ہوں اور ادائیں کی جاسکی ہیں یا فی الحال غیر واجب الادا تمام کو اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا۔

### کمپنیز پر زکوٰۃ

مذکورہ صورت میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار کیا جائے گا پھر جن شرکاء کا حصہ بقدر نصاب ہو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جن کا حصہ مقدار نصاب کو نہیں پہنچتا ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، صاحب درمختار اور شامی نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ نصاب مشترک میں یعنی ایسے مال میں جو اشتراک کی وجہ سے مقدار نصاب کو پہنچ رہا ہو، اور اگر تمام شرکاء کا حصہ الگ الگ کر دیا جائے تو کسی کا بھی حصہ مقدار نصاب کو نہیں پہنچتا ہو تو ایسے مال پر اس وجہ سے کہ مجموعی مالیت مقدار نصاب یا اس سے زائد ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی (الدر المختار، رد المحتار ۲/۳۳۳)۔

### ہیرے جواہرات

فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے کہ نقدین اور سوائم کے علاوہ عروض وغیرہ میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ وہ مال تجارت ہو، بلکہ فقہاء احناف نے تو یہ تصریح فرمائی ہے کہ ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو خواہ وہ ہزاروں روپے کے کیوں نہ ہوں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لئے مذکورہ صورت میں بھی احناف کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، خواہ وہ ہیرے جواہرات تمول کے لئے محفوظ کئے گئے ہوں یا زینت و آرائش کے لئے، اور اگر اپنے سرمایہ کو ہیرے جواہرات کی شکل میں زکوٰۃ سے بچنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے محفوظ کیا جائے تو عند اللہ بھی ایسے شخص سے محاسبہ نہیں ہوگا، ہاں البتہ اگر نیت اور مقصد زکوٰۃ کی ادائیگی



سے بچنا ہوتو پھر چاہے عند التضاء زکوٰۃ واجب نہ ہو، لیکن عند اللہ مواخذہ ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے ارادے سے خوب واقف ہیں۔ درمختار میں ہے:

” (لا زکوٰۃ فی اللآلی و الجواهر) و إن ساوت ألفاً اتفاقاً (إلا أن تكون للتجارة) و الأصل إن ما عدا الحجرین و السوائم إنما یزکی بنیة التجارة“ (درمختار ۲۰۱۲، نیز دیکھئے فتح القدیر ۱/۵۱، ۳۰۵، فتاویٰ ہندیہ ۱/۵۳، ۲، ۲۳۲ وغیرہ)۔

### شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

شیرز دراصل شرکت کی ایک صورت ہے اور شرکت کے تفصیلی احکام شرط چہارم کے عنوان ”کمپنیز پر زکوٰۃ“ کے تحت تحریر کئے جا چکے ہیں، شیرز اگر ایسی کمپنی کا ہے جس میں تجارتی کاروبار ہوتا ہو، اور شیرز ہولڈر مالک نصاب ہے تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مذکورہ صورت میں عدم وجوب زکوٰۃ کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، البتہ ادائیگی زکوٰۃ میں بنیادی قیمت معتبر نہیں ہوگی، بلکہ جو قیمت مارکیٹ میں ہوگی اس کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔

بونڈز بھی قرض کی ایک شکل ہے اور یہ بونڈز دراصل قرض کا ثبوت ہے اور ظاہر ہے کہ قرض کی تینوں صورتوں ضعیف، وسط اور قوی میں سے یہ وسط کی تعریف میں داخل ہے، اس لئے اس پر دین وسط کے احکام جاری ہوں گے اور دین وسط میں فی الحال قبضہ سے قبل تو زکوٰۃ لازم نہیں، لیکن جب دین بقدر نصاب یا اس سے زیادہ یکبارگی وصول ہو تو اس پر سنہین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لہذا مذکورہ صورت میں بونڈز کے کیش ہو جانے کے بعد تمام گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ لازم اور ضروری ہوگی۔

## موجودہ عہد میں مال کی مختلف نوعیت میں زکوٰۃ

مولانا ابوالکلام تھانی ☆

زکوٰۃ مال نامی میں واجب ہے، زکوٰۃ کے وجوب کے لئے ملک تام ضروری ہے:  
”اذا ملک نصاباً كاملاً ملكاً تاماً“ (قدوری)۔

ملک تام وہ ہے جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہوں، مکاتب کے مال پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا اپنا مال نہیں ہے، بلکہ مالک کا مال ہے، مال پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے مہر اور مبیعہ غیر مقبوض پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہو یا وہ قیمت جو ادا کی جا چکی ہو، وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا ہے، لیکن قبضہ میں نہیں آیا، اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اس لئے کہ ملک تام اور قبضہ دونوں ہی وجوب زکوٰۃ کے لئے ضروری ہیں، اور یہاں ملک اور قبضہ دونوں ساتھ ساتھ حاصل نہیں۔

کرایہ کے مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے، اس نقد کی زکوٰۃ پیشگی دینے والے اور ڈپوزٹ کرنے والے پر واجب ہے، اس لئے کہ وہ پیشگی دینے والے اور ڈپوزٹ کرنے والے کی ملک ہے اور ملک کے ساتھ قبضہ بھی حاصل ہے، اس لئے کہ جب چاہے اس کو واپس لوٹا سکتا ہے۔

جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو، جیسے مدارس وغیرہ تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے:  
 ”سبب افتراضها ملک نصاب حولی“ (در مختار) ”قوله ملک نصاب  
 فلا زکوٰۃ فی سوانم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك“ (رد المحتار کتاب الزکوٰۃ  
 - (۹/۲)

حرام مال کا صدقہ کرنا لازم ہے۔ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔  
 ”لو كان الخبيث نصاباً لالتزمه الزکوٰۃ؛ لأن الكل واجب التصدق  
 عليه فلا يفيد إيجاب التصدق ببعضه“ (رد المحتار باب زکوٰۃ الفهم ۲/۳۳، ۳۳۳-  
 اگر حرام مال حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو، تو اس  
 صورت میں مخلوط اموال میں زکوٰۃ فرض ہے (الدر المختار ۲/۳۳۰-)

امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ حرام مال کو اپنے حلال مال میں ملا دینے سے کل کی زکوٰۃ  
 واجب ہوگی، بشرطیکہ حلال مال اس قدر ہو کہ اس حرام مال کا معاوضہ ان لوگوں کو جن سے لیا ہے یا  
 ان کے ورثہ کو دیا، یا اس کو ادا کر کے باقی بقدر نصاب بچے اور جب اکثر مال حرام ہو تو زکوٰۃ واجب  
 نہیں ہے (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۳ ششم)۔

دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، اس لئے کہ دین دائن کی ملکیت میں ہے، دین کی  
 ادائیگی میں مدیون مال منول کر رہا ہو اور تجارت میں لگا کر نفع حاصل کر رہا ہو، پھر بھی مدیون پر  
 زکوٰۃ فرض نہیں ہے، بلکہ دائن پر زکوٰۃ فرض ہے۔

دین کی رقم میں دین کی وصولیابی کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، لیکن اگر وصول سے  
 پہلے دے دی جائے تو یہ بھی جائز ہے، زکوٰۃ کا ادا کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے، جب وصول  
 ہو جائے، لیکن اگر فی الحال دے دے تب بھی درست ہے اور اگر قرض قسط وار وصول ہوتا جائے،  
 اس کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے، اور اگر ایک دفعہ کل کی زکوٰۃ دیدے خواہ پہلے یا پیچھے تو یہ بھی درست ہے

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۹۶/۶)۔

جس وقت قرض وصول ہو جائے اس وقت گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی دینا واجب ہے اور جو وصول نہ ہو اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہے۔

”لو كان المدين على مقر ملنى أو مفلس الخ، فوصل إلى ملكه لزم زكوة ماضى“ (رد المحتار بحوالہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۹۰/۶)۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا مستحق تو ہے لیکن اس پر قبضہ حاصل نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک مع الید ضروری ہے، جو پی ایف کی رقم حاصل ہونے کے بعد آئندہ سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

#### حاجت اصلیہ

”الحاجة ما يدفع الهلاك بها عن نفسه تحقيقاً أو تقديماً“۔

اس اعتبار سے حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور میں اور ہر ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا، لیکن شرعی اعتبار سے حرام و ناجائز چیزیں حاجت اصلیہ کے ضمن میں نہیں آئیں گی۔ قرض یا دین مانع زکوٰۃ ہے، ٹریڈر کی خریداری کے لئے لون لینا قرض کی رقم سے سامان زراعت کی خریداری یا مکان کی خریداری کی جائے تو ان میں سے کسی پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اس لئے کہ حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، اس لئے ان پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، البتہ کسی نے قرض لے کر سامان زراعت کی خریداری نہیں کی یا پھر مکان نہیں خریدا یا ٹریڈر کی خریداری نہیں کی اور روپیہ اپنے پاس رکھ لیا، تو چونکہ وہ دین ہے، اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لیکن اگر اس کو تجارت میں لگا دے تو قرض سے فاضل جو مال ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

کمپنی جس میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں۔ کمپنی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، کمپنی کا سرمایہ

حصہ داروں کی مالیت ہوتی ہے، اس طرح حصہ داروں میں سے جن کی مالیت نصاب کو پہنچے ان پر بقدر نصاب واجب ہے، اس طرح کمپنی کی مجموعی مالیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار کیا جائے گا۔

ہیرے اور جہاہرات جو تجارت کے لئے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

”لا زکوٰۃ فی اللآلیٰ والجواہر وإن ساوت ألفا اتفاقاً إلا أن تكون

للتجارة“ (در مختار)۔

خواتین کے ہیرے کے زیورات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

سامان تجارت جو تاجروں کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن اس کی مالیت کا تعین

اس وقت کے بازار اور شہر کی عام قیمت کے اعتبار سے ہوگا۔

”تعتبر القيمة يوم الوجوب وقالوا يوم الأداء إجماعاً وهو الأصح

ويقوم في البلد الذي المال فيه“ (الدر المختار علی حاشیہ رد المحتار باب زکوٰۃ النعم ۳۴۳، فتاویٰ دارالعلوم

جلد ۴ شم)۔

ارضی جو تجارت کے لئے ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، ادائیگی زکوٰۃ کے دن کی

مالیت کے اعتبار سے کل مالیت اور ان سے حاصل ہونے والے منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی،

بشرطیکہ ان کی قیمت نصاب کو پہنچ جائے، اس کی مالیت کا اعتبار زکوٰۃ کے دن کی مالیت کے اعتبار

سے ہوگا۔

شیرز چونکہ ایک تجارتی سرمایہ ہے، اس لئے اگر نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ

فرض ہے، شیرز کی مالیت کے تعین میں ادائیگی زکوٰۃ کے وقت بازار کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا،

یہی حکم بونڈ کا بھی ہے، بونڈ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے اور ادائیگی زکوٰۃ کے وقت بازار کی قیمت کا

اعتبار کیا جائے گا، شیرز اور بونڈ پر زکوٰۃ واجب ہے، یا تو ہر سال زکوٰۃ دی جائے یا مدت پوری

ہونے پر ایک ہی مرتبہ گذشتہ تمام برسوں کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔

چاندی اور سونا دونوں ہی مستقل نصاب ہیں، چنانچہ ساڑھے باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونا نصاب زکوٰۃ ہے، ان دونوں میں سے جس کے مطابق مال ہو تو صاحب مال صاحب نصاب ہوگا، اگر دونوں نصاب سے کم ہیں، لیکن دونوں کو ملا دینے سے نصاب کو پہنچ جائے تو صاحب نصاب قرار دیا جائے گا، زکوٰۃ لینے کی حلت و حرمت میں اسی طرح سے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔

مہتمم مدرسہ طلبہ اور زکوٰۃ دہندہ دونوں کا وکیل ہوتا ہے، طلبہ داخلہ کے ذریعہ ان کو اپنا وکیل بناتے ہیں اور زکوٰۃ دہندگان مال حوالہ کر کے، اس طرح مہتمم مدرسہ دونوں کے وکیل ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کے مال میں طلبہ کے مصالح کے مطابق جو بھی تصرف کرے وہ صحیح ہے، مزید تملیک کی ضرورت نہیں ہے۔

کمیشن پر چندہ کرانا درست ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ کمیشن کی رقم متعین ہو، اور وہ وصول کردہ رقم سے کم ہو، کمیشن والا محصل ”والعاملین علیہا“ کے تحت داخل ہے، کمیشن اس کی محنت کی اجرت ہے اور محنت کی اجرت دینا درست ہے، اسی طرح آمد و خرچ کے اندراج کے لئے جو عملہ مقرر ہیں ان کی تنخواہ اجرت شمار کر کے دینا درست ہے۔

”إنما الصدقات للفقراء والمساكين“ میں حصر حقیقی ہے، اگر حصر اضافی ہو تو پھر مذکورہ آٹھ مصارف کے ذکر کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

## نصاب زکوٰۃ

مولانا افضل حسین ☆

اس زمانہ میں، جبکہ چاندی سونا کے مقابلہ میں بہت ہی سستی اور سونے کی قیمت بہت زیادہ ہے، لہذا نقد روپیہ یا مال تجارت وغیرہ میں چاندی کا نصاب تو جلد تیار ہو جائے گا اور سونے کا نصاب کافی نقد یا تجارتی مال کے زیادہ ہونے پر تیار ہوگا، کتب فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، کہ مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے وہ نصاب معتبر ہے جو نفع للفقراء ہو اور ظاہر ہے کہ چاندی کا نصاب جلد تیار ہو جانے کی وجہ سے فقیروں کیلئے زیادہ نفع بخش ہے، کیونکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر مال جب کہ سال گزر گیا ہو اور ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہونے پر فقیروں کو نفع پہنچے گا، برخلاف سونے کے نصاب کے کہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو بہت کم صورتوں میں (یعنی جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا کے بقدر مال ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو) زکوٰۃ واجب ہو سکے گی، کیونکہ ساڑھے سات تولہ سونا کی قیمت آج کل کے نرخ کے اعتبار سے تقریباً تیس ہزار روپے ہوگی، پس اگر سونے کے نصاب کو اصل قدر اردے کر اسی کا اعتبار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس تیس ہزار نقد روپے ضرورت اصلیہ سے فارغ ہوں یا اس کے بقدر مال تجارت ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی جو فقیروں کے لئے کسی طرح بھی نفع بخش نہیں ہے، اور اگر چاندی کے

نصاب کو اصل قمر اردے کر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے تو تقریباً ساڑھے چار ہزار نقد روپے یا اس کے بقدر مال تجارت ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، پس چاندی کے نصاب کو اصل قمر اردینے میں زکوٰۃ جلد واجب ہوتی ہے، اور سونے کے نصاب کو اصل قمر اردینے میں زکوٰۃ دیر سے واجب ہوتی ہے، ایسی صورت میں نصاب نقدین میں سے اس سے بنایا جائے گا، جو فقیروں کیلئے نفع ہو۔

رہی بات اس کی کہ نقدین میں سے کون سا نصاب اصل ہے تو دونوں نصاب اصل ہیں مگر اس زمانہ میں اعتبار چاندی کے نصاب کا کیا جائے گا، ہاں اگر پھر وہی زمانہ لوٹ آئے کہ بیس مثقال سونے کی قیمت وہی ہو جائے جو دو سو روہم کی قیمت ہے، تو اختیار رہے گا چاہے جس کو نصاب بنالیا جائے گا۔

اگر نصاب دونوں سے بن جاتا ہے مگر ایک کے ساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بن جاتا ہے، اور دوسرے سے صرف نصاب یا نصاب اور خمس نصاب سے کم بنتا ہے جس نقد کے ساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بنتا ہو اسی سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ (ولو بلغ بأحدھما نصاباً و خمساً) کے تحت شامی نے اس کی تصریح کی ہے۔

”بیانہ ما فی النہر عن السراج لو کان بحیث لقومہا بالدراہم مائتین وأربعین والدنانیر بالدنانیر ثلاثاً وعشرین قومہا بالدراہم لوجوب ستۃ فیہا بخلاف الدنانیر فإنہ یجب فیہا نصف دینار و قیمتہ خمسہ ولو بلغت بالدنانیر أربعة وعشرین و بالدراہم ستۃ و ثلاثین قومہا بالدنانیر“

معلوم ہوا نفع للفقیر کی رعایت بہر صورت کی جائے گی، پس چاندی اور سونے کے نرخ میں تفاوت چاہے جتنا ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل کی حیثیت رکھتے ہیں مگر فی زمانہ اموال کے اندر چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔

”مقوما بأحدھما“ کے تحت علامہ شامی نے تصریح فرمائی ہے کہ اموال کی قیمت



لگانے کا اختیار اس وقت ہے جب کہ سونا چاندی دونوں برابر ہوں (یعنی نصف دینار برابر پانچ درہم کے ہو) لیکن اگر دونوں کے نرخ میں تفاوت ہے تو پھر اعتبار نفع کا ہوگا۔

”قال: وکل التخییر إذا استویا فقط و أما إذا اختلفا قوم بالانفع“

بہر حال اصل مذہب تجیر کا ہے، یعنی نصاب چاہے چاندی کوتراروے کر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے چاہے تو سونے کے نصاب کو مان کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن یہ اختیار اس وقت تک ہے جب کہ نصاب دونوں نقدوں سے بن جاتا ہو، اور اگر نصاب کسی ایک سے بنتا ہے اور دوسرے سے نہیں بنتا تو تقویم ذی نصاب سے متعین ہو جائے گی، جیسا کہ اس کی تصریح درمختار کی عبارت سے آچکی ہے۔

”انفع“ کی تفسیر سے متعلق ایک جزئیہ درمختار کا بھی گزرا ہے کہ اگر نقدین میں ایک کے ساتھ تقویم سے مال نصاب تک پہنچتا ہے اور دوسرے سے نصاب اوٹس تک پہنچتا ہے تو ایسی صورت میں انفع یہ دوسری صورت ہوگی، کیونکہ خمس نصاب سے کم میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب نہیں ہوتی، لیکن جب خمس نصاب بعد تکمیل نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ ہی اعتبار سے واجب ہوگی، پس ظاہر ہے اس نقد کے ساتھ تقویم میں دوسرے کے مقابلہ میں زکوٰۃ زیادہ نکلے گی، جو فقیروں کیلئے زیادہ نفع بخش ہے، بہر حال اس جزئیہ سے یہ بات صراحتاً جانی اور سمجھی جاتی ہے کہ انفع کا اعتبار بعد تکمیل نصاب بھی کیا جائے گا تو نصاب بناتے وقت کیوں اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، ضرور کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص (جو کہ دونوں نصابوں کا مالک ہے) ایک نصاب کو دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر کل زکوٰۃ سونے سے یا چاندی سے ادا کرنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، البتہ اس کا لحاظ ضرور کرنا ہوگا کہ جس کے ساتھ ملانے سے فقیروں کا زیادہ نفع ہو اس کے ساتھ ملایا جائے گا، پس جس کے ساتھ ملانے سے زکوٰۃ نکلتی ہو، اسی کے ساتھ ملا کر دونوں کی

زکوٰۃ ادا کرے۔

”ولو ضم أحد النصابين إلى الآخر حتى يؤدى كله من الذهب أو من الفضة لا بأس به، لكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدرا ورواجا وإلا فيؤدى من كل واحد ربع عشره كذا في محيط السرخسي“ (مائلگیری ۱۷۹۱)۔

خلاصہ بحث

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سونے چاندی کے نرخ میں چاہے جتنا تفاوت ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل ہیں، مصرحہ جزئیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اموال کی تقویم میں تخییر اس وقت ہے جب کہ دونوں قیمت میں برابر ہوں (یعنی نصف مثقال برابر پانچ درہم کے ہو جیسا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا) پس اگر تفاوت نرخ کی وجہ سے ایک ساتھ تقویم میں نصاب تک نہیں پہنچتا اور دوسرے سے پہنچ جاتا ہے تو دوسرے ہی سے قیمت لگائی جانی ضروری ہوگی۔

لہذا نصاب حرمت زکوٰۃ اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی۔